

جَلَدِ یَدِ فِقْہِیِّ مَسَائِلُ

”بڑا قابلِ قدر کام ہے“
مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ

قَوْلَانَا خَالِدِ سَيْفُ اللَّهِ رَحْمَانِي
صدرِ مَدْرَسَةِ دَارِ الْعُلُومِ سَبِيلِ السَّلَامِ، حیدرآباد دکن

زمزم پبلشرز

جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن

مُستند کتب فقہ کے حوالوں کے ساتھ عام فہم اور دلنشین اسلوب

جدید فقہی مسائل

جلد اول

”بڑا قابل قدر کام ہے۔“

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ

مولانا خالید سیف اللہ رحمانی

صدر مدرس دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد دکن

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد اردو بازار، کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

”جدید فقہی مسائل“ کے جملہ حقوق اشاعت و طباعت پاکستان میں صرف مولانا محمد رفیق بن عبد المجید مالک (زمزم پبلشرز کراچی) کو حاصل ہیں لہذا اب پاکستان میں کوئی شخص یا ادارہ اس کی طباعت کا مجاز نہیں بصورت دیگر (زمزم پبلشرز کراچی) کو قانونی چارہ جوئی کا مکمل اختیار ہے۔

از..... مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اس کتاب کا کوئی حصہ بھی (زمزم پبلشرز کراچی) کی اجازت کے بغیر کسی بھی ذریعے بشمول فوٹو کاپی برقیاتی یا میکینیکی یا کسی اور ذریعے سے نقل نہیں کیا جاسکتا۔
(زمزم پبلشرز کراچی)

ملنے پچنے کی پگڑتے

■ مکتبہ بیت العلم، اردو بازار کراچی۔ فون: 32726509

■ مکتبہ دارالہدیٰ، اردو بازار کراچی

■ دارالاشاعت، اردو بازار کراچی

■ قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی

■ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

■ **AL FAROOQ INTERNATIONAL**
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640

■ **AZHAR ACADEMY LTD.**
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone: 020-8911-9797

■ **ISLAMIC BOOK CENTRE**
119-121 Halliwell Road, Bolton BL1 3NE
U.K
Tel/Fax : 01204-389080

■ **MADRASSAH ARABIA ISLAMIA**
1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel : 00(27)114132786

کتاب کا نام ————— جدید فقہی مسائل جلد اول

جدید تصحیح شدہ ایڈیشن

تاریخ اشاعت ————— جون ۲۰۱۰ء

باہتمام ————— احکامات زمزم پبلشرز

ناشر ————— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹرز و مقدس مسجد، اردو بازار کراچی

فون: 021-32760374

فیکس: 021-32725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: www.zamzampublishers.com



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض ناشر

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

دین اسلام ایک مکمل دین ہے، اور شریعت اسلامیہ ایک کامل شریعت ہے۔ خلاقِ فطرت نے ہر دور میں انسانی ضروریات بھی پیدا کی ہیں اور ان کا حل بھی پیدا فرمایا۔ انسانوں کی سب سے بڑی ضرورت آخرت کی کامیابی ہے اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے شریعت اتاری ہے اور ایسی کامل و اکمل شریعت اتاری ہے کہ ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ ہر دور کے ہر مسئلہ کا حل اس میں موجود ہے۔ جسے علماء نے بوقت ضرورت امت کے سامنے پیش کیا ہے۔ زیر نظر کتاب ”جدید فقہی مسائل“ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہ (حیدر آباد دکن انڈیا) نے بڑی عرق ریزی اور محنت شاقہ سے مرتب فرمایا ہے۔

یہ کتاب درحقیقت بہت سے جدید مسائل کا حل ہے اس میں حضرت مصنف نے مختلف جدید مسائل پر تحقیقی مقالات مرتب کئے ہیں اور یہ نہایت قابل قدر کام ہے اور حضرات مفتیانِ کرام کے لئے مسائل کے حل میں بہت سے لوازمات مہیا ہو گئے ہیں۔ چونکہ حضرت مصنف نے یہ خالص علمی مضامین جمع کئے ہیں اس لئے عامۃ الناس ان کو حضرات علماء کرام و مفتیان عظام سے سمجھیں اور ان سے رہنمائی حاصل کر کے اپنے پیش آمدہ جدید مسائل میں عمل پیرا ہوں۔

حضرت مصنف صاحب کی اجازت سے پاکستان میں پہلی بار جدید کمپوزنگ کے ساتھ زمزم پبلشرز اس کو پانچ جلدوں میں پیش کرتے ہیں۔

”محمد رفیق عبد المجید“

۲۱ محرم ۱۴۲۶ھ





فہرست مضامین

۳۶	تعبیر احکام	۳۶	عرض ناشر
۳۷	اسلامی متبادل	۱۲	پیش لفظ..... ڈاکٹر وہبہ الزحیلی
۳۸	دوسرے دبستان فقہ سے استفادہ	۱۳	تقدیم..... مولانا مجاہد الاسلام القاسمی
۳۸	ضرورت کی بناء پر عدول	۱۵	دیباچہ طبع جدید..... مؤلف
۳۹	فقہاء حنفیہ کے اقوال	۱۷	کچھ آراء: اس کتاب کے بارے میں
۴۰	عرف و عادت کی بناء پر تغیر احکام عدول نہیں ہے	۱۷	بڑا قابل قدر کام: مولانا ابوالحسن علی ندوی
۴۳	اخلاقی زوال	۱۷	ایک اہم ضرورت کی تکمیل: مولانا منت اللہ رحمانی
۴۸	سیاسی حالات کا فرق	۱۷	شہ راہ: مولانا محمد حمید الدین حسامی
۵۱	عرف و تعامل	۱۸	احسان عظیم: مولانا شاہ امان اللہ قادری
۵۳	نئے وسائل	۱۸	عوام و خواص کے لئے مفید: مفتی ظفر الدین صدیقی
۵۳	کلمہ آخریں	۱۹	ماقن و دل کی تصویر: مولانا برہان الدین سنبھلی
۵۷	عبادات	۱۹	ایک اہم ضرورت کی تکمیل: مولانا رضوان القاسمی
۵۷	پاکی اور ناپاکی	۲۰	سنبھائے اولیں
۵۷	مغربی طرز کے پیشاب خانے اور بیت الخلاء	۲۵	جدید مسائل کا حل..... اصول اور طریقہ کار
۵۸	کاغذ سے استنجاء	۲۵	فقہ اسلامی کی جامعیت
۵۹	پٹرول سے کپڑے کی دھلائی	۲۵	اسلامی قانون کی ابدیت
۵۹	ناخن پالش	۲۶	تغیر پذیر اسباب و وسائل ہیں، نہ کہ انسانی فطرت!
۶۰	مصنوعی دانتوں کی صورت میں وضو و غسل کے احکام	۲۷	اسلامی قانون کی مصلحت سے ہم آہنگی
۶۰	مصنوعی اعضاء وضو کا حکم	۲۸	اسلامی قانون جامد نہیں
۶۱	نتھ اور آئرننگ وغیرہ کے احکام	۲۹	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شورائی اجتہاد
۶۲	پلاسٹر پر مسح	۳۲	امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ اجتہاد
۶۲	انجکشن سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ	۳۳	مدینہ کے فقہاء سبعہ
۶۳	معدہ تک ٹنگی پہنچائی جائے	۳۴	نیا زمانہ، نئے تقاضے
۶۳	پیشاب کی ٹنگی سے پیشاب	۳۴	افراط و تفریط
۶۳	پائپ کے ذریعہ اندرون جسم دوا	۳۵	تغیر پذیر اور ناقابل تغیر احکام

۸۱..... چھتوں میں گوبر کا استعمال	۶۴..... اگر کمر سے نیچے کا حصہ بے حس کر دیا جائے
۸۲..... گوبر سے لپائی	۶۴..... آنکھوں سے گرنے والا پانی
۸۲..... ناپاک چیز کے عمل تقطیر سے حاصل ہونے والے قطرات	۶۵..... مسواک کی جگہ نو تھ پیسٹ اور برش
۸۳..... نماز	۶۶..... فوم کے موزوں اور بوٹ پر مسح
۸۳..... جن نمازوں کے اوقات نہ آئیں	۶۷..... ٹرین وغیرہ کی دیواروں پر تیمم
۸۵..... اوقات نماز میں تقویم کی رعایت	۶۸..... ٹسٹ ٹیوب سے غسل کا وجوب
۸۶..... قبلہ نما کی شرعی حیثیت	۶۸..... نرودھ کی صورت میں غسل کا وجوب
۸۷..... ٹرین اور بس میں استقبال قبلہ	۶۹..... غسل و ذنوب میں بال کے مصنوعی جوڑوں کا حکم
۸۸..... ہوائی جہاز میں نماز	۶۹..... قرآنی آیات کے کیسٹ بے وضو چھوٹا
۸۹..... سمندری جہاز میں نماز	۷۰..... جنابت میں قرآن کی کتابت و ناسپ
۹۰..... ٹرین پر نماز	۷۱..... قرآن مجید کی غلاف نما جلد
۹۰..... اسلحہ وغیرہ کے گدوں پر سجدہ	۷۱..... قرآنی آیات کے تمنغے
۹۱..... کئی مقامات سے اذان کی آواز آئے	۷۲..... ترجمہ قرآن کا حکم
۹۱..... نماز میں آلہ مکبر الصوت کا استعمال	۷۲..... قرآن کے نقوش و اعداد
۹۲..... ٹیلی ویژن سے نماز	۷۳..... اسپرٹ و پنچر
۹۳..... ٹیپ ریکارڈ سے امامت و اذان	۷۴..... الکل ملی ہوئی خوشبو
۹۳..... نس بندی کئے ہوئے شخص کی امامت	۷۴..... پیشاب فلٹر کرنے کے بعد
۹۴..... نماز میں گھڑی دیکھنا	۷۵..... کتے کی زبان کا مرہم
۹۴..... صور کپڑوں میں نماز	۷۵..... غیر مسلموں کے برتن
۹۶..... ننگے سر نماز	۷۶..... لمبے اور مدور حوض
۹۶..... مسافت سفر	۷۷..... پیمپنگ سٹ سے کنویں کی صفائی
۹۷..... ریل اور بس کی مسافت میں فرق ہو	۷۷..... حوض اور ٹنکیوں کی تطہیر
۹۸..... سرال میں قصر کرے یا نہیں؟	۷۸..... پیشاب کا نمک
۹۹..... منبروں کی غنی وضع	۷۹..... پتھر کوئلہ پر تیمم
۹۹..... مسجدوں میں پینٹ کا استعمال	۷۹..... صابن میں ناپاک اشیاء ڈالنا
۱۰۰..... مسجدوں میں قمقمے	۸۰..... ناپاک چیزوں کی تقطیر
۱۰۰..... آیات قرآنی کے طفرے	۸۰..... گاہنے (دونی) میں جانور پیشاب کر دے
۱۰۱..... محراب میں تصویریں یا بزرگوں کے نام	۸۱..... ڈریج سے قریب کنواں یا بورنگ

۱۲۴	آنکھوں اور کانوں میں دوا ڈالنا.....	۱۰۲	مساجد میں سونا اور رہنا.....
۱۲۵	روزہ میں یواسیر کی خارجی دوا استعمال کی جائے.....	۱۰۳	مسجدوں میں اجرت لے کر تعلیم دینا.....
۱۲۶	معدہ میں ٹنگی ڈالی جائے.....	۱۰۳	مسجدوں کے نیچے دکانوں کی تعمیر.....
۱۲۷	ناک میں دوا ڈالنا.....	۱۰۴	مسجد میں چندوں کا اعلان.....
۱۲۷	روزہ کی حالت میں بھپاڑہ لینا.....	۱۰۴	ایک مسجد کا قرآن دوسری مسجد میں.....
۱۲۸	روزہ کی حالت میں آکسیجن لینے کا حکم.....	۱۰۵	مساجد میں کیلنڈر.....
۱۲۸	ٹوتھ پاؤڈر اور پیسٹ کے احکام.....	۱۰۵	فرقہ دارانہ فسادات کے مہلکین شہدا ہیں؟.....
۱۲۹	روزہ میں پان تمباکو وغیرہ کا استعمال.....	۱۰۶	مساجد کے لئے غیر مسلموں کا چندہ.....
۱۳۰	موذی امراض کی وجہ سے افطار.....	۱۰۷	قبرستان کی اراضی میں مساجد وغیرہ کی تعمیر.....
۱۳۰	تراویح پر اجرت.....	۱۰۸	دیران قبرستان پر مساجد یا فلاحی مقصد سے عمارت کی تعمیر.....
۱۳۲	تراویح میں قرآن کی مقدار اور شیعہ.....	۱۰۸	اوقافی جائیداد کی خرید و فروخت.....
۱۳۶	۳۱ واں روزہ.....	۱۰۹	غیر عربی زبان میں خطبہ.....
۱۳۶	زکوٰۃ.....	۱۱۳	سمندری جہاز میں نماز جمعہ.....
۱۳۶	سونے چاندی کا نصاب.....	۱۱۳	دیہات میں جمعہ کی نماز.....
۱۳۷	گوٹے بچکے کی زکوٰۃ.....	۱۱۵	جنگ کے دوران نماز.....
۱۳۹	کرایہ کے سامان اور مکان میں زکوٰۃ.....	۱۱۵	ٹرین میں نماز.....
۱۴۰	ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ.....	۱۱۶	ٹیپ ریکارڈ کی قراءت پر سجدہ تلاوت.....
۱۴۱	سونے چاندی کے مصنوعی اعضاء پر زکوٰۃ.....	۱۱۶	ریڈیو، ٹی وی پر تلاوت.....
۱۴۲	صنعتی اوزاروں، مشینوں اور اشیاء کا حکم.....	۱۱۷	آیت سجدہ کا ٹائپ یا کمپوزنگ.....
۱۴۳	باؤنڈز کی زکوٰۃ.....	۱۱۷	لاؤڈ اسپیکر پر اذان.....
۱۴۳	شیئرز کی زکوٰۃ.....	۱۱۸	مساجد کے اندر لاؤڈ اسپیکر میں اذان.....
۱۴۴	قرض پر لگائی ہوئی رقم.....	۱۱۸	قرأت قرآن میں موسیقی.....
۱۴۴	طویل مدتی دیون کی زکوٰۃ.....	۱۱۹	اگر پوری لاش نہ مل پائے.....
۱۴۵	پراویڈنٹ فنڈ میں زکوٰۃ.....	۱۲۰	سمندر میں تدفین.....
۱۴۶	بینک میں جمع شدہ مال پر زکوٰۃ.....	۱۲۰	تابوت میں تدفین.....
۱۴۶	حلال و حرام مخلوط مال پر زکوٰۃ.....	۱۲۱	روزہ.....
۱۴۷	پیشگی کرایہ اور ڈپازٹ کی زکوٰۃ.....	۱۲۱	طویل الاوقات علاقوں میں روزہ.....
۱۴۸	جس سودے پر قبضہ نہیں کیا، اس کی زکوٰۃ.....	۱۲۲	روزہ میں انجکشن گلوکوز اور خون چڑھانے کا حکم.....
۱۴۹	زکوٰۃ میں کس قیمت کا اعتبار ہوگا؟.....	۱۲۳	اندرون جسم دوا کا استعمال.....

۱۶۸.....	سے ہوئے بیگ اور سلی ہوئی چادر وغیرہ کا استعمال	۱۳۹.....	ہول سیل یا پھنکر کی قیمت
۱۶۹.....	مکہ اور حدود میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے میقات سے باہر جا کر واپسی میں احرام کا حکم	۱۵۰.....	بیوی کا بہرہ زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع نہیں
۱۷۱.....	مکہ آنے کے بعد حج سے روک دیا جائے	۱۵۰.....	زکوٰۃ اور ٹیکس
۱۷۱.....	مکہ کے چیک پوسٹ سے واپس کر دیئے جانے کا خطرہ ہو تو کیا کیا جائے؟	۱۵۱.....	مساجد اور پلوں وغیرہ کی تعمیر میں زکوٰۃ خرچ کرنا
۱۷۳.....	کیا اشہر حج میں مکہ پہنچ جائے تو حج فرض ہو جائے گا؟	۱۵۱.....	نوٹوں سے زکوٰۃ کی ادائیگی
۱۷۴.....	طواف وداع کا تعلق حج سے ہے	۱۵۲.....	دینی مدارس کو زکوٰۃ کی ادائیگی
۱۷۴.....	مضافات مکہ کے لوگ براہ راست منی آجائیں تو طواف قدوم و طواف وداع کا حکم	۱۵۳.....	وصولی زکوٰۃ میں نظام مدارس کی حیثیت
۱۷۶.....	قربانی کا ٹکٹ خرید کر وکالہ قربانی کا نظم	۱۵۴.....	فدیہ و صدقہ فطر کی مقدار
۱۷۷.....	حجاج کی گاڑی ۱۲/ ذی الحجہ کو غروب آفتاب تک منی سے	۱۵۵.....	زکوٰۃ و صدقات میں حیلہ تملیک
۱۷۷.....	جگہ کی تنگی کے باعث وادی محسر میں قیام	۱۵۵.....	سادات اور بنو ہاشم کو زکوٰۃ
۱۷۸.....	رمی میں نیابت کا شرعی حکم	۱۵۶.....	کیا ہندوستان کی زمینیں عشری ہیں؟
۱۷۹.....	احرام کی حالت میں تولیہ سے منہ پوچھنے اور خیموں کے کپڑے لگنے کا حکم	۱۵۷.....	لیز اور پٹے کی زمین پر عشر و خراج کا حکم
۱۸۰.....	خواتین کے لئے چہرے کا پردہ	۱۵۸.....	کیا زراعتی اخراجات عشر سے مستثنیٰ ہوں گے؟
۱۸۰.....	حج بدل میں تمتع	۱۵۹.....	ایندھن کی لکڑی وغیرہ میں عشر
۱۸۱.....	ذبح و قربانی	۱۵۹.....	مکھانے اور سنگھارے میں زکوٰۃ
۱۸۱.....	موجودہ دور کے اہل کتاب کا ذبیحہ	۱۵۹.....	بٹائی کی صورت میں عشر کس پر واجب ہوگا؟
۱۸۲.....	ذبح سے پہلے الیکٹرک شاک	۱۶۰.....	ریشم میں زکوٰۃ
۱۸۳.....	دوران ذبح گردن الگ ہو جائے	۱۶۱.....	حج
۱۸۳.....	مغربی ممالک سے آئے ہوئے گوشت	۱۶۱.....	اہل ہند کے لئے میقات
۱۸۴.....	قربانی گاؤ کا مسئلہ	۱۶۲.....	ہوائی جہاز سے حج کرنے والے کا احرام
۱۸۸.....	سرد ہونے سے پہلے ذبیحہ کا چمڑا اتارنا	۱۶۲.....	جدہ سے احرام
۱۸۹.....	معاشرتی مسائل	۱۶۳.....	ہوائی جہاز سے محرم کے بغیر سفر
۱۸۹.....	ازدواجی زندگی	۱۶۳.....	حاجیوں کی خرید و فروخت اور تجارت
۱۸۹.....	اہل کتاب سے نکاح	۱۶۴.....	حرام روپیہ سے حج
		۱۶۴.....	مسک حیض ادویہ
		۱۶۵.....	مضافات حرم میں مقیم غیر ملکی آفاقی ہیں یا میقاتی؟
		۱۶۵.....	خوشبودار مشروبات اور خوردنی اشیاء کا حکم
		۱۶۸.....	محرم کے لئے حجر اسود کے بوسہ کا مسئلہ

۲۱۰	آزنگ نتھ وغیرہ کے احکام	۱۹۰	شیعہ سے نکاح
۲۱۰	گھڑی کس ہاتھ میں باندھی جائے؟	۱۹۱	کیونٹوں سے نکاح
۲۱۱	سونے کی قلعی کی ہوئی گھڑی اور بنن وغیرہ کے احکام	۱۹۱	قادیانی سے نکاح
۲۱۳	سونے چاندی کے قلم	۱۹۱	عدالتی نکاح
۲۱۳	اسٹیل وغیرہ کے برتن	۱۹۲	تحریری نکاح
۲۱۳	اسماء الہی وغیرہ کے تمغے	۱۹۲	ٹیلی فون کے ذریعہ نکاح
۲۱۵	تانبے پیتل وغیرہ کے مجسمے	۱۹۳	غیر عربی لفظوں سے نکاح و طلاق
۲۱۵	اسٹیل کی چین	۱۹۳	کیا خون سے حرمت نسب ثابت ہوگی؟
۲۱۶	طب و علاج	۱۹۳	نکاح میں گانے بجانے کا حکم
۲۱۶	اکسری	۱۹۶	مہر کی کم سے کم مقدار
۲۱۶	خون چڑھانا	۱۹۶	مہر فاطمی
۲۱۸	الکحل	۱۹۷	جہیز کی حیثیت
۲۱۹	مصنوعی اعضاء	۱۹۷	بہبستری میں زور دھ ولوپ کا استعمال
۲۱۹	آپریشن	۱۹۸	مانع حمل دوائیں
۲۲۰	پوسٹ مارٹم	۱۹۹	استقاط حمل
۲۲۱	دانتوں میں سمٹ یا چاندی بھروانا	۲۰۱	نس بندی
۲۲۱	موت میں مددگار دوائیں	۲۰۲	قطری ضبط تولید
۲۲۳	حرام جانوروں کے روغن اور مرہم	۲۰۳	نشہ آور دواؤں کے استعمال کے بعد طلاق
۲۲۵	بلڈ بینک کا قیام	۲۰۳	بلڈ پریشی کی حالت میں طلاق
۲۲۶	جانوروں پر میڈیکل ریسرچ	۲۰۳	طلاق بذریعہ ٹیلی فون یا ٹیلی گرام
۲۲۶	ڈاکٹر کی فیس	۲۰۵	زیبائش و آرائش
۲۲۷	خوراک و پوشاک	۲۰۵	خضابی کنگھی کا استعمال
۲۲۷	دھیل مچھلی کا حکم	۲۰۶	رنگین کریم
۲۲۸	میز و کرسی پر کھانا	۲۰۶	عورتوں کا بال تراشنا
۲۲۸	چمچوں، کانٹوں سے کھانا	۲۰۷	مصنوعی بالوں کا استعمال
۲۲۹	جرسی گائے	۲۰۸	بھویں باریک کرنا
۲۲۹	گوبر میں ابالی ہوئی ہلدیاں	۲۰۸	حسن کے لئے اعضاء کی سرجری
۲۳۰	جامد نشیلی اشیاء کا حکم	۲۱۰	بالوں کی صفائی کے لئے کریم وغیرہ کا استعمال

۲۵۴	دودھ بینک	۲۳۰	بے سٹم
۲۵۵	بینک ڈرافٹ وغیرہ کا شرعی حکم	۲۳۱	جدید کپڑے
۲۵۶	تحریر اور فون کے ذریعہ خرید و فروخت	۲۳۳	جن رنگوں کا استعمال مردوں کے لئے ممنوع ہے
۲۵۶	نمک لگائے ہوئے چمڑے کی خرید و فروخت	۲۳۳	جدید سلک کے کپڑے
۲۵۷	مخدرات کا استعمال اور خرید و فروخت	۲۳۳	تفریحی امور
۲۵۸	سرکاری راشن زیادہ قیمت میں فروخت کرنا	۲۳۳	نغمہ و موسیقی
۲۵۸	صرف نمونہ دکھا کر خرید و فروخت	۲۳۵	ٹی وی اور فلم
۲۵۹	گارنٹی کے ساتھ فروخت	۲۳۶	کبوتر و چنگ بازی
۲۵۹	ریشم اور شہد کے کیڑوں کی خرید و فروخت	۲۳۶	ریس و گھوڑ دوڑ
۲۶۰	فضلہ کی خرید و فروخت	۲۳۷	شطرنج و چوسر
۲۶۱	قسطوں پر سامان کی فروخت	۲۳۸	ہاکی، فٹ بال وغیرہ کھیل کے احکام
۲۶۱	شیراز کی خرید و فروخت	۲۳۹	فوٹو اور تصویر
۲۶۲	دو ملکوں کی کرنسیوں کا نقد ادھار تبادلہ	۲۴۳	معاشی مسائل
۲۶۳	اگر ایک کرنسی میں معاملہ طے پایا اور اسی کے مساوی دوسری کرنسی دی گئی تو کس کا اعتبار ہوگا	۲۴۳	خرید و فروخت
۲۶۳	اجارہ و ذرائع معاش	۲۴۳	اخبارات و رسائل کی خرید و فروخت
۲۶۳	فوٹو گرافی و مجسمہ سازی کا پیشہ	۲۴۴	پارسل، رسائل وغیرہ کا ڈاک میں ضائع ہو جانا
۲۶۵	آلات موسیقی کی خرید و فروخت	۲۴۵	خرید و فروخت میں تاجر کا کچھ زیادہ دینا
۲۶۶	فلم اور ٹیلی ویژن کو ذریعہ معاش بنانا	۲۴۵	فرضی بیع
۲۶۷	بینک کی ملازمت	۲۴۶	تالاب میں مچھلی کی بیع
۲۶۸	غیر اسلامی حکومت میں کلیدی عہدے	۲۴۸	ناموں کا رجسٹریشن
۲۶۹	دینی کاموں پر اجرت	۲۴۹	چٹ فنڈ
۲۷۰	تعطیلات اور رخصتوں کی تنخواہیں	۲۴۹	روپیہ بھنانے میں بدلے لینا
۲۷۱	ریلوے بس ٹکٹ کی حیثیت	۲۵۰	اشیاء ضروریہ کا نرخ مقرر کرنا اور اس سے زیادہ میں فروخت کرنا
۲۷۱	کمیشن ایجنٹ	۲۵۰	بیعانہ کی رقم کا حکم
۲۷۲	بینک کے لئے مکان کرایہ پر دینا	۲۵۱	بیع بہ شرط واپسی
۲۷۳	موشیوں میں بنائی	۲۵۲	ذخیرہ اندوزی
۲۷۳	تعمیری معاہدات میں اخراجات غیر معمولی حد تک بڑھ جائیں	۲۵۳	اسٹولنگ
		۲۵۳	تجارت میں شیر کی ایک خاص صورت

۲۹۸	دباؤ کے تحت اقرار	۲۷۶	جعلی سرٹیفکٹ پر ملازمت اور اس کی آمدنی
۲۹۸	غائب شخص کے خلاف فیصلہ	۲۷۷	جاسوسی کی ملازمت
۳۰۰	فون پر شہادت و گواہی	۲۷۸	سود و قمار
۳۰۰	غیر مسلم حج کے ذریعہ تنسیخ نکاح	۲۷۸	سودی قرض لینا
۳۰۱	ایک جگہ سے دوسری جگہ مقدمات کی کارروائی کی ترسیل	۲۷۹	بینک کا سود
۳۰۲	ضرورت کی بنا پر رشوت دینا	۲۸۱	بینک کے سود کے مصارف
۳۰۲	متفرق مسائل	۲۸۱	ٹیکس میں سود کی رقم دینا
۳۰۲	ووٹ کی شرعی حیثیت	۲۸۲	سود میں سود کی ادائیگی
۳۰۳	بھوک ہڑتال	۲۸۲	بینک میں روپیہ جمع رکھنا
۳۰۳	ہیٹنرزم	۲۸۳	قرض کا فروخت کرنا
۳۰۵	اظہار غم کے بعض طریقے	۲۸۳	مال مرہون سے استفادہ
۳۰۶	اپریل فول	۲۸۵	یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں شرکت
۳۰۶	غیر مسلموں کے جلوس جنازہ وغیرہ میں شرکت	۲۸۵	سودی حسابات کی تعلیم
۳۰۷	غیر مسلموں کے تیوہاروں میں شرکت	۲۸۶	فلکسڈ ڈپازٹ
۳۰۸	غیر مسلموں کی عبادت گاہ و تیوہار میں تعاون	۲۸۶	میعادی چیک کی کم قیمت میں فروخت
۳۰۸	قرآن مجید کا غیر عربی متن	۲۸۷	قمار کی بعض مروجہ صورتیں
۳۰۹	قومی، جھنڈے کی سلامی	۲۸۸	انشورنس
۳۰۹	کتابوں کی رسم اجراء	۲۹۰	جبری انشورنس
۳۱۰	برتھ ڈے	۲۹۱	پوشل بیمہ
۳۱۰	قرآن مجید اٹھانا	۲۹۱	انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے انشورنس
۳۱۰	پرندوں وغیرہ کی شکل میں قرآن کی کتابت	۲۹۱	انشورنس کے سود سے ٹیکس ادا کرنا
۳۱۱	بائبل لے کر حلف اٹھانا	۲۹۲	انشورنس کی ایجنسی
۳۱۱	عثمانی رسم الخط کے سوا دوسرے رسم الخط میں قرآن کی کتابت	۲۹۳	پروائیڈنٹ فنڈ
۳۱۲	فری اسٹائل کشتی وغیرہ	۲۹۳	متفرقات امارت و قضاء
۳۱۳	جہیز اور تلک	۲۹۳	امارت شرعی کا قیام
۳۱۳	وندے ماترم	۲۹۵	قضاء شرعی کا نظام
		۲۹۶	ویڈیو تصویروں پر قضاء
		۲۹۷	وعدہ معاف گواہ

پیش لفظ

فقیہ عالم اسلامی ڈاکٹر وہبہ الزحیلی (دمشق)

الحمد لله رب العلمين، والعاقبة للمتقين ولا عدوان الا على الظلمين،
والصلاة والسلام على امام المرسلين معلم الناس الخير وعلى اله وصحبه
الهداة الغر الميامين وبعد

اہل ایمان اور اہل تقویٰ کے لئے اس سلسلے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ شریعت اسلامی، زندگی کی حرارت سے بھرپور اسلامی قوانین اور اسلام کے روشن پاکیزہ احکام قیامت تک کے لئے زندہ جاوید ہیں۔ اس لئے کہ یہ شریعت آخری شریعت اور پیغمبر اسلام آخری نبی و رسول ہیں۔ یہ وہ نظام قانون ہے جو دنیا و آخرت کے تمام احکام کو شامل و حاوی اور عالمی شان کی حامل ہے اور تمام مسائل زندگی کے احاطہ کی صلاحیت اس فقہ کا امتیازی وصف ہے۔

شریعت اسلامی کا دوام و استمرار اور اس پر ایمان و ایقان نیز شریعت اور احکام شریعت کی طرف سے مدافعت کا فریضہ، صاحب بصیرت اور اہل نظر و اجتہاد علماء سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ نئے پیش آمدہ مسائل کی بابت فتوے دیں۔ اور اس طرح غور و فکر کریں کہ شریعت اسلامی انسانی مصالح اور ضروریات سے ہم آہنگ رہے تاکہ لوگ احکام خداوندی اور اسلام کو فرسودہ نہ سمجھنے لگیں اور ان سے منہ موڑ کر انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی طرف اپنا رخ نہ کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد ایک اہم شرعی ذمہ داری اور فرض کفایہ ہے۔ جو لوگ ان مسائل کی بابت اظہار رائے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اگر انہوں نے اس سے بے توجہی برتی تو وہ گنہ گار ہوں گے۔ اسی لئے امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے فرمایا ہے کہ جو بھی مسئلہ پیش آئے، اسلام میں اس کے حلال یا حرام ہونے کی بابت کوئی نہ کوئی حکم ضرور موجود ہے۔ جس مسئلہ پر بھی ماضی میں اجتہاد اور غور و فکر نہیں ہوا ہو، ان کو حرام کہہ دینے والا درحقیقت مفتی کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہ تو محض جمود اور کوتاہ نظری ہے، کامیاب مفتی وہ ہے جو نئے مسائل کی تخریج کرے، ان کے احکام مستنبط کرے، اور اپنے عہد کے پس منظر میں لوگوں کی مصالح اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا حل نکالے جو شریعت کے مزاج اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ اور اس طرح وہ لوگوں کو ان کے معاملات کے باب میں بھی اللہ کے دین سے مربوط رکھے۔ مفتی کا مقام یہ نہیں ہے کہ وہ نئے مسائل کا سامنا کرنے سے راہ فرار اختیار کرے۔ بلکہ اسے تو ان مسائل کے حل میں سبقت کرنا چاہئے اور لوگوں کو ان احکام سے روشناس کرنا چاہئے۔

واضح رہے کہ اجتہاد کوئی ناممکن شے نہیں۔ خاص کر بعض امور میں جزوی اجتہاد نہ کہ مستقل، ہمہ گیر اور مطلق اجتہاد۔ صورت حال یہ ہے کہ عصر حاضر نے فقہ کے مختلف ابواب، عبادات، معاملات، معاشرتی مسائل، معاشی نظام، طب و اخلاقیات، عمرانی، سیاسی، اجتماعی اور ثقافتی مسائل کے باب میں متعدد نئے مسائل کو جنم دیا ہے۔ جو اہل علم و فضل اور قوت استنباط کی حامل شخصیتوں..... جو ان مسائل کی بابت غور و فکر کی صلاحیت رکھتے ہوں..... سے مفید اور شریعت سے ہم آہنگ حل کے طالب ہیں۔

ماضی قریب میں مجھے ایسی بہت سی مختصر تحریروں اور کتابوں کے دیکھنے کا موقع ملا، جو بعض مخصوص نئے مسائل سے متعلق ہیں، پھر میرے سفر ہندوستان کے دوران مجھے اس کتاب ”جدید فقہی مسائل“ کے دیکھنے کا موقع ملا، جو علامہ خالد سیف اللہ رحمانی (صدر مدرس و صدر شعبہ فقہ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد) کی تالیف ہے۔ یہ عبادات، معاملات، اقتصادیات، اجتماعی اور طبی مسائل سے متعلق نئے مسائل (جن سے واقف ہونے کی ضرورت ہے) پر ایک جامع اور حاوی کتاب ہے مجھے اس سے بہت مسرت ہوئی اور میں نے اس کی طباعت کی خواہش کی۔ میرا خیال ہے کہ مصنف کو من جانب اللہ صحیح حکم بیان کرنے کی توفیق دی گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ مصنف کو صحیح اصولی منہج پر مسائل کو حل کرنے اور ان کے بارے میں رائے قائم کرنے پر قدرت حاصل ہے۔

اس لئے اس کی طباعت و اشاعت نہایت مناسب قدم ہے۔ اس کتاب کی تالیف کی صورت میں مولانا خالد سیف اللہ قاسمی رحمانی نے ایک اہم اور مبارک کام سرانجام دیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے اس کام کو قبول فرمائے اور ان کو اپنی مرضیات پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے، اس لئے کہ علم کی نشر و اشاعت واجب ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو حاضر موجود ہے وہ غیر موجود لوگوں تک میری بات کو پہنچائیں کہ بسا اوقات براہ راست سننے والوں کے مقابلہ وہ لوگ زیادہ محفوظ کر پاتے ہیں، جن تک علم پہنچایا جاتا ہے۔

میں اخیر میں پھر دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی جانب سے اس اہم اور عظیم کام پر عالم جلیل شیخ رحمانی کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔ واللہ المستعان

ڈاکٹر وہبہ الزحلی

(صدر شعبہ فقہ و مذاہب فقہیہ، شریعہ کالج، دمشق یونیورسٹی)

۱۴۱۶ھ / ۵/۲۹ ۱۹۹۵ء / ۱۰/۱۲

نوٹ: مقدمہ نگار نے یہ تحریر کتاب کے عربی ایڈیشن کے لئے لکھی ہے۔ مولانا احمد عبدالحجیب ندوی نے عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

تقدیم

جدید صنعتی اور فکری انقلاب نے جو بہت سے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، ان میں ایک جدید دور میں پیدا ہونے والے مسائل کا فقہی اور شرعی حل بھی ہے، جو جدید ایجادات اور نئے معاملاتی نظام کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، ان مسائل کا حل کرنا ایک مشکل اور دشوار کام ہے، اس لئے کہ ان کے لئے قرآن و حدیث اور فقہ کے قدیم ذخیرہ میں ان کی نظائر اور ان سے قریب ترین صورتیں تلاش کرنی ہوتی ہیں، احکام کی علتوں اور اسباب پر غور کرنا ہوتا ہے، اور اپنے زمانہ کے عرف اور رواج کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے۔

اس مشکل اور دشوار کام کو حل کرنا علماء کے ذمہ ہے اور وہی اس کا صحیح حل تلاش کرنے کے اہل ہیں، چنانچہ ہر زمانہ کے اہل علم و ارباب افتاء نے اپنے دور کے مسائل حل کئے ہیں، موجودہ دور میں بھی ایسی متعدد کوششیں ہو چکی ہیں جن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے..... زیر نظر کتاب بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، اور مؤلف کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے پہلی بار ایسے تمام جدید مسائل کو جن کا تعلق عبادات، معاشرت، معاملات اور اجتماعی مسائل سے ہے۔ یک جا کر دیا ہے۔ اور نہایت اختصار و ایجاز کے ساتھ سہل، عام فہم، زبان اور دل نشیں اسلوب میں مسائل پر گفتگو کی ہے اور ہر مسئلہ مستند کتابوں سے حوالے اور نظائر کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

جدید مسائل چوں کہ عموماً اجتہادی نوعیت کے ہوتے ہیں، اس لئے فطری بات ہے کہ ان میں اہل علم کے درمیان فکر و نظر کا اختلاف بھی ہوتا ہے، اس کتاب میں ایسے مسائل کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں جن میں اختلاف رائے پایا جاتا ہو اور کوئی بھی کتاب جو اس موضوع پر لکھی جائے گی ممکن نہیں کہ اس نوع کے جزوی اختلاف سے خالی رہے۔ تاہم مصنف قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ اختلاف سے بچنے کی کوشش کی ہے اور جہاں عام علماء کی رائے سے اختلاف کیا ہے، وہاں اپنی رائے فتویٰ کے بجائے ”تجویز“ کے لب و لہجہ میں پیش کی ہے۔ نیز اس کے وجوہ و دلائل بھی بیان کر دیئے ہیں۔

امید ہے کہ کتاب کا نیا ایڈیشن، جس میں بعض مسائل کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور اہل علم کے مشورہ سے کہیں کہیں جزوی ترمیمیں بھی کی گئی ہیں زیادہ مفید اور نافع ثابت ہوں گی اور عوام و خواص اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

”مجاہد الاسلام القاسمی“

۵ شوال ۱۴۰۴ھ

دیباچہ طبع جدید

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جدید فقہی مسائل کا یہ ایڈیشن ہندوستان میں کئی بار شائع ہونے کے بعد پاکستان میں پہلی بار مصنف کی خصوصی اجازت کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

اگرچہ اس سے پہلے بھی پاکستان میں بعض ادارے پرانے ایڈیشن کو طبع کرتے جا رہے ہیں اور انہوں نے غلط طور پر کتاب کے شروع میں لکھ رکھا ہے کہ وہ مصنف کی اجازت سے اس کتاب کو طبع کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان حضرات کو ہدایت دے اور معاف فرمائے۔ وبالله التوفیق

یہ کتاب ابتداء میں دو حصوں پر مشتمل تھی اس کے دوسرے ایڈیشن میں مزید اضافہ عمل میں آیا تھا مگر اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف محرکات کی بناء پر متعدد نئے مسائل پر تفصیلی تحریریں لکھنے کا موقع عطا فرمایا۔ یہ بات ممکن تھی کہ ان مسائل کو جمع کر کے تیسرے حصے کا اضافہ کر دیا جاتا۔ لیکن اہل علم کی رائے ہوئی کہ اس کے بجائے یوں کیا جائے کہ جدید فقہی مسائل کا پہلا حصہ ”جدید فقہی مسائل“ کے اصل نام سے طبع کیا جائے اور جن مختصر مسائل کا اضافہ کرنا ہو اسی کتاب میں اس کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ یہ کتاب عوام و خواص دونوں کے لئے قابل استفادہ ہو۔ اور اصحاب علم و اہل ذوق و دانش کے لئے جدید مسائل سے متعلق تفصیلی تحریروں کو الگ الگ عنوان سے جمع کر دیا جائے تاکہ ان مجموعہ مضامین کی مستقل حیثیت بھی ہو اور وہ جدید مسائل کے سلسلے کی ایک کڑی بھی ہو، اس طرح جو لوگ چاہیں پورے سیٹ کو حاصل کر لیں اور جوان میں سے کسی خاص موضوع کا ذوق رکھتے ہوں وہ اس موضوع سے متعلق کتاب لے سکیں۔

اس طرح ”جدید فقہی مسائل“ کا ایک ہی حصہ ہوگا۔ لیکن اس کتاب کے علاوہ جدید مسائل کا سلسلہ درج ذیل کتابوں پر مشتمل ہوگا:

- * جدید فقہی مسائل
- * اسلام اور جدید معاشی مسائل
- * اسلام اور جدید سماجی مسائل
- * اسلام اور جدید میڈیکل مسائل
- * اسلامی عبادات اور جدید مسائل

راقم الحروف نے جدید مسائل کے حل کے اصول اور طریقہ کار پر ایک مستقل تحریر مرتب کی تھی، جو کم و بیش ایک سو صفحات پر مشتمل تھی۔ اس رسالہ کی حیثیت جدید فقہی مسائل کے لئے ”مقدمہ“ کی تھی۔ افسوس کہ اس کی طباعت کی نوبت نہیں آ سکی۔ چنانچہ بعض احباب کے مشورے سے اس رسالہ کا خلاصہ ”جدید مسائل کا حل..... اصول اور طریقہ کار“ کے عنوان سے بطور مقدمہ اس تازہ ایڈیشن میں شریک اشاعت کیا جا رہا ہے اور بہت سے مسائل کا اس ایڈیشن میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ نیز کتاب کے عربی ایڈیشن کے لئے عالم اسلامی کے مشہور و ممتاز فقیہ اور مفسر قرآن ڈاکٹر وہبہ الزحیلی حفظہ اللہ (مصنف الفقہ الاسلامی وادلتہ، اصول الفقہ الاسلامی، التفسیر المنیر) کے مقدمہ کا اردو ترجمہ بھی بطور ”پیش لفظ“ شریک اشاعت کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ کتاب کا یہ نیا ایڈیشن ظاہری اور معنوی ہر دو اعتبار سے زیادہ بہتر ثابت ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے نافع بنائے اور یہ عند اللہ اور عند الناس قبول ہو!!

۱۱
رحمۃ

خالد سیف اللہ رحمانی
کیم ربیع الاول ۱۴۱۹ھ



کچھ آراء: اس کتاب کے بارے میں

بڑا قابل قدر کام مولانا ابوالحسن علی ندوی

آپ کی مرسلہ کتابیں ”قاموس الفقہ“ اور ”جدید فقہی مسائل“ موصول ہوئیں اندازہ ہوا کہ آپ نے بڑا قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ اور فقہ اسلامی کی اچھی خدمت کی ہے۔ امید ہے کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن آپ کی مزید فقہی بصیرت کا آئینہ دار ہوگا اللہ تعالیٰ آپ کو مزید توفیق سے نوازے اور دینی خدمت کا موقع دے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی
(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

ایک اہم ضرورت کی تکمیل مولانا منت اللہ رحمانی

”جدید فقہی مسائل“ کے مسائل کی فہرست دیکھنے اور جا بجا پڑھنے کا موقع ملا، اس کتاب نے بحمد اللہ وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی ہے، سہل زبان، عام فہم اسلوب اور اختصار کی وجہ سے عام لوگ بھی اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتے ہیں، جب کہ حوالوں کے اہتمام اور اہم مسائل پر مدلل بحث نے علماء اور ارباب افتاء کے لئے بھی اس کو مفید کتاب بنا دیا ہے۔ واقعہ ہے کہ یہ کتاب اس کی مستحق ہے کہ ہر مسلمان کے گھر میں رہے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی
(امیر شریعت بہار و اڑیسہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

شمع راہ

”جدید فقہی مسائل“ پوری کتاب کا مطالعہ کیا۔ مصنف قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے اس اہم نازک اور مشکل موضوع پر قلم اٹھایا اور وسیع مطالعہ کے بعد مستند حوالہ جات کے ساتھ تمام نئے مسائل کا حل پیش کیا۔ زبان بھی ایسی عام فہم رکھی کہ ہر آدمی استفادہ کر سکے..... تمام برادران اسلام سے اپیل ہے کہ وہ اس کتاب سے بھرپور استفادہ کریں۔ واقعہ ہے کہ یہ کتاب موجودہ حالات میں ”شمع راہ“ کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل مدظلہ
(امیر ملت اسلامیہ آندھرا پردیش و بانی دارالعلوم حیدرآباد)

احسانِ عظیم

اس کتاب کے مصنف مولانا خالد سیف اللہ صاحب کچھ دنوں دفتر امارت شرعیہ پھلواری شریف میں رہ چکے ہیں اور مجھ سے ملاقات بھی ہوتی تھی، اس لئے ان کی ذہانت و فطانت اور علمی استعداد سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ حالانکہ مولانا کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

”جدید فقہی مسائل“ جو اس صدی عیسوی میں پیدا ہوئے ہیں ان کا علم بہت سے مسلمانوں کو نہیں ہے اور وہ ان مسائل سے واقفیت کے محتاج ہیں، مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی نے یہ کتاب لکھ کر مسلمانوں کے دینی حلقہ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ ہماری رائے ہے کہ یہ کتاب انگریزی میں بھی شائع کی جائے، تاکہ ہندوستان کے ان صوبوں میں جہاں کے مسلمان اردو سے ناواقف ہیں، ان مسائل سے واقف ہو جائیں، بلکہ اس کتاب کو عربی میں منتقل کر کے عرب ممالک میں بھی اس کی اشاعت ہو، اس لئے کہ وہاں بھی اصلاح کی ضرورت بہت ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف علام کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی اس کتاب کو مقبول خاص و عام کرے۔ آمین

حضرت مولانا شاہ امان اللہ قادری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی

(سجادہ نشین خانقاہ مجیبہ پھلواری شریف پٹنہ)

عوام و خواص کے لئے مفید

کوئی شبہ نہیں آپ نے اچھی محنت کی ہے اور حالاتِ زمانہ کی رعایت سے ان تمام مسائل پر روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے جو آج کل عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں اور اس کی ترتیب بھی فقہی رکھی ہے، قابل ذکر تقریباً سارے مسائل آگئے ہیں۔ انشاء اللہ اس سے عام اور خاص دونوں طبقہ کو کافی نفع پہنچے گا اور جدید مسائل سے دلچسپی رکھنے والے اس کتاب سے خوب فائدہ حاصل کر سکیں گے اور مفتی صاحبان سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔

مسائل سارے کے سارے فقہ و فتاویٰ کی روشنی میں حوالہ جات کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں۔ دو چار مسئلوں کا اختلاف ہونا کوئی تعجب انگیز نہیں۔ لیکن اپنا یقین ہے ۹۵ فیصدی مسائل متفقہ علیہا ہیں، جن میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں۔ خاکسار نے بھی آپ کی اس کتاب سے استفادہ کیا اور دل سے دعائیں نکلیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد ظفر الدین صاحب صدیقی مدظلہ

(مفتی دارالعلوم دیوبند)

ماقل و دل کی تصویر

آپ نے موجودہ مسائل کا جس درجہ احتواء کیا ہے، وہ خود اپنی جگہ بہت ہی قابل قدر اور آپ کے ذہن رسا کی بین دلیل ہے اور پھر اکثر جگہ مسائل کے جوابات بھی بہت مناسب اور چچے تلے ہیں، سب سے زیادہ قابل بلکہ لائق تقلید بات یہ نظر آئی کہ مائل و دل کی ایسی جامع و مکمل تصویر ہے کہ شاید اس سے بہتر پیش کرنا مشکل ہو لیکن ظاہر ہے کہ مسائل کے جوابات میں ہر جگہ اتحاد خیال ضروری نہیں ہے، بلکہ شاید ممکن نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ نافع بنائے اور آپ کی ذات کو منارہ نور۔

حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی مدظلہ
(ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ایک اہم ضرورت کی تکمیل

جدید مسائل کا حل اور اس کے شرعی احکام کا تعین ان مسائل میں سے ہے جس کی اہمیت پر بحث و نظر کی اب کوئی حاجت باقی نہیں رہی۔ علامہ اقبال دو کاموں کے لئے بڑے فکر مند تھے ایک اسلامی الہیات کی تشکیل جدید دوسرے نئے قانونی مسائل کا حل۔ پہلے کام کا آغاز خود انہوں نے ”خطبات مدراس“ کی صورت میں کیا، گو کہ ان کی بعض آراء سے علماء کو اختلاف تھا، تاہم یہ ایک اچھی پیش رفت تھی، دوسرے کام کے لئے ان کی نظر انتخاب کبھی علامہ سید سلیمان ندوی پر پڑی تو کبھی مولانا سید انور شاہ کشمیری پر۔ لیکن آخر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور اپنی حسرتوں اور آرزوں کے ساتھ خدا سے جا ملے۔

خود میرے ذہن میں ایک عرصہ سے یہ کام تھا میں نے اس کے لئے فاضل گرامی برادر عزیز جناب مولانا خالد سیف اللہ صاحب سے تحریک کی اور خوشی کی بات ہے کہ انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اس کام کو انجام دیا اور قریب قریب تمام ہی مسائل کا جو کسی اعتبار سے جدید کہلا سکتے ہیں، احاطہ کر لیا، پھر زبان عام فہم رکھی اور اختصار و ایجاز کا غایت درجہ اہتمام کیا۔ نیز ہر مسئلہ کے لئے مستند کتب فقہ کے حوالہ جات بھی نقل کئے..... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف سے مزید علمی و دینی کام لے اور احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی جو کامل رعایت ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے ہر دور میں مستحکم بنیادوں پر دینی و فقہی خدمات انجام پاتی رہیں۔

حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی

(ناظم دارالعلوم سبیل السلام، حیدر آباد)

سخنہائے اولین

جس طرح قرآن مجید خدا کی آخری کتاب ہے اور پیغمبر اسلام سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں اسی طرح اسلام کا پیش کیا ہوا نظام حیات سب سے آخری، ابدی اور مکمل دستور ہے۔ یہ نہ صرف اسلام کا دعویٰ ہے بلکہ ایک طویل تاریخ ہے جو اس کی تصدیق کرتی آرہی ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں جو بھی انسان کے خود ساختہ نظام ہیں ان میں قوانین، وسائل و ذرائع اور تغیر پذیر اسباب کو سامنے رکھ کر وضع کئے گئے ہیں۔ وسائل اور اسباب کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہمیشہ تبدیلی اور تغیر پیش آتا رہتا ہے۔ اس لئے ان قوانین کا بھی حال یہ ہوتا ہے کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد دوسرے زمانے میں وہ فرسودہ اور OUT OF DATE ہو جاتے ہیں..... اس کے برخلاف اسلامی قانون میں انسان اور اس کی فطرت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ انسانی فطرت ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ مثلاً مسرت و غم، آرام و تکلیف، غصہ و جم، دوستی و دشمنی، مختلف واقعات پر منفی رد عمل، کھانے پینے اور معاشرت کی بنیادی ضرورتیں اور اس میں خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ، یہ وہ چیزیں ہیں جو ابتداء آفرینش سے انسان میں ہیں۔ اور جب تک انسان رہے گا اس کی یہ خصوصیات بھی قائم رہیں گی۔ اب فطری بات ہے کہ جس دستور حیات میں مرکزی حیثیت ان ہی امور کو دی جائے گی وہ خود بھی ابدی اور لافانی ہوں گے۔

اس طرح اصولی اعتبار سے زمانہ اور حالات کی تبدیلی کا شریعت اسلامی پر کوئی ایسا اثر نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کو دوران کار اور غیر عصری بنادے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اس تہذیبی اور صنعتی انقلاب کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ سے یقیناً بہت سے ایسے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا حل تلاش کرنا اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی حیثیت متعین کرنا ضروری اور ناگزیر ہے۔

عموماً ان مسائل کے حل کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولا جائے پھر فقہ اسلامی کے پورے ذخیرہ پر نظر اصلاح ڈالی جائے اور اس میں ایسی تراش خراش اور کترو بیونت کی جائے کہ فقہ اسلامی اور موجودہ مغربی تہذیب کے درمیان کم سے کم فاصلہ رہ جائے۔

مگر اس قسم کی تحریک نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی ہے بلکہ غیر معقول بھی ہے۔ اگر ایک نئی شریعت ہی وضع کرنی

مقصود ہو تو اس کے لئے اس طویل کام کی بجائے ایک نیا دستور ہی بنالینا چاہیے۔ آخر کیا ضرور ہے کہ اس کے لئے اسلام ہی کو قربانی کا بکرا بنایا جائے۔

جہاں تک اجتہاد کا دروازہ کھولنے کا مسئلہ ہے تو ضروری حد تک خود فقہاء اور سلف صالحین نے اس کو کھلا رکھا ہے۔ اجتہاد کی ایک قسم ”تحقیق مناط“ ہے۔ تحقیق مناط سے مراد یہ ہے کہ ہر زمانے میں پیدا ہونے والے جدید مسائل کو اسلامی قوانین پر چسپاں کیا جائے۔ ابواسحاق شاطبی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے لکھا ہے کہ اجتہاد کی یہ وہ قسم ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔

بچ رہا ”اجتہاد مطلق“ تو واقعہ یہ ہے کہ اس علمی و اخلاقی انحطاط اور زوال کے دور میں اس کو بند رکھنا ہی ضروری ہے۔ علماء اور سلف صالحین نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا اور کیا ہے خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ لوگ اسے علماء کی تنگ نظری قرار دیتے ہیں مگر اقبال جیسے ”دانائے راز“ بھی اپنے ماحول کے مطالعہ کے بعد اسی کے قائل ہو گئے تھے چنانچہ فرمایا:

جلوہ اش مارا از مایگانہ کرد
ساز مارا از نوایگانہ کرد
از دل ما آتش دیرینہ برد
نور و نار لالہ از سینہ برد
اجتہاد اندر زمان انحطاط
قوم را برہم ہی بیچد بساط
زا اجتہاد عالمان کم نظر
اقتداء بر رفتگان محفوظ تر

پھر اسلام کے پاس فقہ و قانون کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ قانونی دقیقہ نخی اور ژرف نگاہی، مصالح کی رعایت اور انسانی فطرت سے ہم آہنگی کا ایک شاہکار ہے اور دنیا کے کسی جدید سے جدید قانون کو بھی اس کے مقابلہ میں پیش کرنا مشکل ہے۔

فقہاء اسلام نے اپنی بالغ نظری اور بلند نگاہی سے انسانی زندگی کی جزئیات کا اس قدر احاطہ کیا ہے کہ بجا طور پر آج کی اس نئی دنیا میں بھی ایسے کم ہی مسائل ملیں گے جس کے لئے فقہ کے اس قدیم ذخیرہ میں کوئی نظیر موجود نہ ہو۔ خود اس کتاب کے مطالعہ کے وقت بھی قارئین اس کا اندازہ کر سکیں گے۔ بالخصوص فقہاء احناف کے

یہاں چوں کہ ”فقہ تقدیری“ کا حصہ زیادہ ہے اس لئے ان کی کتب فقہ میں جامعیت اور وسعت بھی زیادہ ہے۔ عام طور پر یہ غلط فہمی بھی ہے کہ علماء اپنے فرائض سے غافل ہیں اور وہ ایسے جدید پیش آمدہ مسائل کا حل پیش نہیں کرتے۔ مگر یہ بھی غلط ہے۔ خود ہندوستان کے علماء میں ماضی قریب میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے فتاویٰ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ان مسائل کو خصوصی اہمیت دی ہے اور بڑی جہد و کاوش سے ان کا حل پیش کیا ہے علماء کی ”فرد جرم“ میں یہ بھی ہے کہ وہ تنگ نظری برتتے ہیں اور وہ ابتدائی مرحلہ میں ہر جدید مسئلہ کی بابت شدت اختیار کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اصل میں جدید آلات و وسائل کے سلسلہ میں بعض پہلوؤں پر خود ماہرین فن کی رائے تبدیل ہوتی رہی ہے۔ مثلاً لاؤڈ اسپیکر سے نماز کا مسئلہ ہے۔ ابتداءً جب تحقیق کی گئی تو اس کی آواز کو بولنے والے کی آواز کا چر بہ قرار دیا گیا۔ پھر تحقیق ہوئی کہ وہ اس کی اصل آواز ہے۔ اب فطری بات ہے کہ اس لحاظ سے پہلے ایک فتویٰ دیا گیا پھر دوسرا۔

بعض احکام ایسے ہوتے ہیں کہ حالات کے لحاظ سے ان میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً تشبہ کا مسئلہ ہے۔ ایک لباس اور وضع قطع جب تک کسی خاص قوم کا شعار ہو اس میں تشبہ باقی رہے گا اور مسلمانوں کے لئے اس کی ممانعت ہوگی۔ پھر اگر اس کا استعمال اتنا عام ہو جائے کہ اس قوم کا امتیاز باقی نہ رہے تو تشبہ بھی ختم ہو جائے گا۔ ایک چیز کا اگر استعمال بہت عام ہو گیا اور اس کی ممانعت کتاب و سنت سے ثابت نہ ہو بلکہ قیاس و اجتہاد پر مبنی ہو تو اس کی ممانعت کا حکم نسبتاً خفیف ہو جائے گا۔ ان حالات میں فطری بات ہے کہ احکام میں تغیر کو قبول کرنا ہوگا۔ یہ تنگ نظری یا شدت نہیں ہے بلکہ حقیقت پسندی ہے۔

جدید پیش آمدہ مسائل میں واقعہ ہے کہ افراط و تفریط سے بچنے اور اعتدال سے کام لینے کی ضرورت ہے، نہ یہ صحیح ہے کہ ہر نئی ایجاد اور نئے نظام کو ناجائز قرار دے دیا جائے اور اس سے زیادہ غلط یہ ہے کہ ہر صحیح غلط کیلئے اسلام میں راہ نکالنے کی سعی کی جائے۔ ہمیں ہر مسئلہ پر اسلام کے چوکھٹے اور دین کے حدود و اربعہ میں رہ کر غور کرنا ہے۔ اور جن چیزوں میں امت کے لئے سہولت پیدا ہو سکتی ہے ان میں لچک بھی رکھنی ہے۔ اُمّ المؤمنین سیدہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

”وما خیر بین امرین الا اختار ایسرهما ما لم یکن مأثماً۔“^۱

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو باتوں کے بارے میں اختیار دیا گیا آپ نے اس میں سہل

^۱ فقہ تقدیری سے مراد ایسے واقعات پر رائے کا اظہار کرنا ہے جو وجود میں تو نہ آئے ہیں لیکن مستقبل میں ان کا پیش آنا ممکن ہو۔

^۲ شمانل ترمذی

کا انتخاب فرمایا بشرطیکہ وہ گناہ کی بات نہ ہو۔

فقہاء کا طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ جب کسی بات کا ابتلاء عام ہو جائے تو اس میں شریعت کی حدوں میں رہتے ہوئے جواز کے حیلے نکالے جائیں جن کا مقصد حرام سے بچنا اور خلاصی حاصل کرنا ہو۔

”وکل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام اوليتوصل بها الى الحلال فهي حسنة.“^۱

ترجمہ: ”وہ حیلے جن سے آدمی حرام سے خلاصی حاصل کرنا چاہے یا حلال صورت پیدا کرنی مقصود ہو، بہتر ہیں۔“

لیکن ظاہر ہے اس قسم کی سہولت اجتہادی احکام ہی میں برتی جاسکتی ہے، منصوص احکام میں نہیں۔ اس طرح جدید فقہی مسائل کا حل ایک بڑا نازک کام ہے اور یہ علماء کی ذمہ داری اور ان کا فریضہ منصبی بھی ہے۔ ماضی قریب میں اس طرح کے احکام کو یکجا کرنے کا کام غالباً سب سے پہلے مولانا تھانوی نے ”حوادث الفتاویٰ“ کے نام سے کیا۔ پھر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ”آلات جدیدہ کے شرعی احکام“ اور ”جواہر الفقہ“ مرتب کی۔ کچھ دنوں پہلے دارالعلوم دیوبند کے مفتی مولانا نظام الدین صاحب کے ایسے فتاویٰ ”نظام الفتاویٰ“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

تقریباً یہ بھی کتابیں چونکہ فتاویٰ اور جوابات ہیں اس لئے فطری بات ہے کہ ان میں تمام جزئیات کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے اور نہ ان کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پھر جیسا کہ سوال کی نوعیت اور وقت کے لحاظ سے جواب میں اختصار اور اطناب سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق کہیں اختصار اور دلائل ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے اور کہیں جواب نے رسالہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بعض مسائل ایسے ہیں جن میں اب علماء کی رائے بدل چکی ہے اور بعض مسائل بالکل حال کی پیداوار ہیں۔

ان حالات میں ضرورت محسوس کی گئی کہ ایسی کتاب مرتب ہو جس میں جدید مسائل کا ممکن حد تک احاطہ ہو جائے۔ زبان سہل اور عام فہم ہو، احکام مدلل لکھے جائیں اور حتی الوسع اختصار سے کام لیا جائے۔ یہ کتاب اسی ضرورت کی تکمیل کی جانب ایک قدم ہے۔

جدید مسائل کی فہرست میں میں نے صرف ان ہی احکام کو نہیں رکھا ہے جو جدید آلات و وسائل کی پیداوار ہیں بلکہ ان کو بھی جو نئے معاشی و سیاسی نظام اور عرف و عادت سے متعلق ہیں اور ان کو بھی جن کا ابتلاء عام ہو گیا ہے۔

ہر مسئلہ پر فقہ کی مستند کتابوں سے نظائر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر سلف صالحین کی آراء کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کہیں عرف کی تبدیلی اور عموم بلوی کی وجہ سے جزوی تغیر کی ضرورت محسوس کی گئی تو اس کو فتویٰ کی بجائے ”تجویز“ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کی صراحت کر دی گئی ہے کہ فتویٰ تو اس پر ہے جو عام علماء کی رائے ہے، عوام کو عمل بھی اسی پر کرنا چاہئے مگر علماء کو اس دوسرے پہلو پر بھی غور کرنا چاہئے اور جو کچھ لکھا گیا ہے اجمال یا تفصیل کے ساتھ اس کے دلائل بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔

ان میں بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کے لئے ایک مستقل رسالہ درکار تھا مگر میں نے کوشش کی ہے کہ ہر مسئلہ غایت درجہ اختصار کے ساتھ لکھا جائے۔ البتہ ”مجلس“ کے پروگرام میں ہے کہ آئندہ ان موضوعات پر مستقل رسائل کی اشاعت عمل میں آئے۔ ”وباللہ التوفیق۔“

آخر میں عرض ہے کہ قارئین اور خصوصاً علماء کرام و ارباب افتاء جہاں کہیں کوئی سقم پائیں مولف کو مطلع فرمائیں۔ انشاء اللہ یہ عاجز بہ سر و چشم ان کی تنقید کو قبول کرے گا اور آئندہ ایڈیشن میں اس کو ملحوظ رکھے گا۔ اس میں جہاں کہیں دماغ و قلم نے صحیح کام کیا ہے وہ خدا کی توفیق اور بزرگوں سے استفادہ کا ثمرہ ہے اور جہاں کہیں قلم نے ٹھوکر کھائی ہے وہ اپنے قصور فہم اور تہی دامن کا نتیجہ ہے جس کے لئے خدا کے سامنے عفو و درگزر اور بندگان خدا سے نصیح کا طالب ہوں۔

ربنا لا تؤاخذنا إن نسينا أو أخطانا. ربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفر لنا
وترحمنا لنكونن من الخاسرين.

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۵/رجب ۱۴۰۳ھ ۲۹/اپریل ۱۹۸۳ء



جدید مسائل کا حل..... اصول اور طریقہ

(مقدمہ کتاب)

اسلام کی دو وہ بنیادی خصوصیات ہیں جو اس کو دوسرے تمام الہامی اور غیر الہامی مذاہب کے خود ساختہ جدید و قدیم نظام ہائے زندگی سے ممتاز کرتی ہیں۔

فقہ اسلامی کی جامعیت

پہلی بات یہ ہے کہ اسلام ایک ہمہ گیر اور جامع دستور ہے۔ جس سے انسانی زندگی کا کوئی گوشہ باہر نہیں ہے۔ شخصی اور عائلی مسائل، معاشیات، سیاسیات، تعزیری اور فوج داری، جنگی اور دفاعی احکام، خارجہ اور داخلہ پالیسی، بین الاقوامی روابط و سلامتی کے قوانین، ریاستی نظام اور ریاست و فرد کے باہمی روابط، اخلاقی ہدایات، عصری مصالح اور عرف و رواج کی رعایت اور ان ضرورتوں کا حل..... قانون کے یہ سارے شعبے، ان شعبوں کی تفصیلات اور اس سلسلے میں بنیادی اصول و قواعد اس نے اس خوبی سے پیش کر دیئے ہیں اور ان کو باہم اتنا مربوط اور متوازن رکھا ہے کہ ان پر ادنیٰ نگاہ رکھنے والا بھی یہ ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ اسلام محض خلوت اور نجی زندگی کا دین ہے، جلوت اور اجتماعی مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسلامی قانون کی ابدیت

دوسری بات یہ ہے کہ اس کی افادیت کسی خاص زمانہ اور عہد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کی انسانی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت اور افادیت ابدی اور لافانی ہے۔ وقت کے بدلتے ہوئے حالات اور سماج کی تغیر پذیر روش اس کے مضبوط قانونی حصار کو کوئی زک نہیں پہنچا سکتی۔ اس نے جس طرح آج سے پندرہ سو سال پہلے تشنہ لب اور پیاسی انسانیت کو امن و سکون کا ساحل دیا تھا اور مردم خوروں اور خون آشاموں کو انسانیت کا پاسبان اور نگہبان بنا کر کھڑا کیا تھا، آج بھی کر سکتا ہے۔ (ان الدین عند اللہ الاسلام)ؑ

یہ اسلام کا دعویٰ ہے اور ایک طویل تاریخ ہے، جو اس کی مکمل تصدیق کرتی ہے کم از کم مسلسل گیارہ بارہ سو سالوں تک اس قانون نے دنیا کے ایک عظیم ترین خطہ پر حکومت کی ہے، بے شمار تمدنی اور علمی انقلابات اور سیاسی اور فکری تبدیلیاں دیکھی ہیں، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوموں کو اپنے دامن میں پناہ دی ہے علم و تحقیق اور صنعت و ایجاد کی مزاحمت کیا معنی، اس کی امامت کی ہے، اور تہذیب کو پروان چڑھایا ہے۔

اس دور میں اہل مغرب کا خیال ہے کہ اب اسلام فرسودہ (Out of Date) ہو چکا ہے اور وہ نئی زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا، اگر اس کو باقی رکھنا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی طرح اپنا دائرہ اختیار محدود کر لے اور زندگی کے انفرادی اور عباداتی رسوم سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔

تغیر پذیر اسباب و وسائل ہیں، نہ کہ انسانی فطرت

پھر اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اب حالات بدل چکے ہیں، صنعتی انقلاب اور یورپ سے اٹھنے والی علم و تحقیق کی نئی لہر نے زندگی کی قدریں یکسر تبدیل کر دی ہیں اسلام اس وقت آیا جب انسانی تہذیب ناپختہ اور بچپن کی حالت میں تھی اب تمدن اپنے شباب پر اور دنیا علم و سائنس کے لحاظ سے اوج کمال پر ہے۔

اس بات کو عموماً بڑی قوت اور ناقابل رد دلیل کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے حالانکہ یہ محض ایک مغالطہ اور سطحی قسم کا استدلال ہے، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جو چیز بدلتی رہی اور بدل رہی ہے وہ کیا ہے؟ کیا انسان کی فطرت بدل گئی ہے؟ اس کے تقاضے تبدیل ہو گئے ہیں؟ یا محض اسباب و وسائل میں تغیر رونما ہوا ہے؟ اور ذرائع زندگی میں فراوانی آئی ہے؟..... اس نکتہ پر جب کوئی شخص غور کرے گا تو اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہے گا کہ شروع سے آج تک دنیا میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان کا تعلق محض اسباب و وسائل کی دنیا سے ہے۔

مثال کے طور پر اپنے حقوق، جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی کوشش انسان کا ایک فطری جذبہ ہے۔ یہی چیز ہے جو دشمن کے خلاف دفاع کا محرک بنتی ہے، ایک زمانہ میں لوگ اس کے لئے لکڑیوں اور پتھروں کا استعمال کرتے تھے پھر جب شعور بالغ ہوا اور انسان لوہے کو پگھلا کر مختلف صورتوں میں ڈھالنے پر قادر ہو گئے، تو اسی مقصد کے لئے ”تیر و شمشیر“ سے کام لیا جانے لگا۔ اسی طرح انسان کا جذبہ انتقام عقل کی رہنمائی میں مختلف مرحلے طے کرتے ہوئے ان ہلاکت خیز ایجادات تک پہنچ گیا جن کی زد میں آج پوری کائنات اور ساری انسانیت ہے۔ یہاں ہتھیاروں اور اس کی نوعیت میں یقیناً غیر معمولی تبدیلی عمل میں آئی ہے مگر ظاہر ہے کہ اس کے پس پردہ جو انسانی فطرت کا فرما ہے، وہ آج بھی وہی ہے جو کل تھی، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

میں نے یہ محض ایک مثال دی ہے ورنہ جس چیز کے بارے میں چاہیں آپ اس انداز میں تجزیہ کر جائیں،

آپ محسوس کریں گے کہ تغیر پذیر اسباب ہیں انسان کی فطرت اپنی جگہ قائم ہے اور اس کو زمانہ کی کہنگی اور وقت کا تیز و سفر بہت یا کچھ نہیں متاثر کر پایا ہے..... اب یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اسلام اور شریعت اسلامی کا اصل موضوع اسباب و وسائل نہیں بلکہ انسان اور اس کی فطرت ہے، تلوار اور نیوکلیر ہتھیار اس کا اصل موضوع بحث نہیں بلکہ وہ انسان کے جذبہ مدافعت کی ایک معتدل رہنمائی کرتا ہے اور مواقع کے اعتبار سے اس کے اقدام کے مناسب اور نامناسب ہونے کا فیصلہ کرتا ہے، اس کی ضرورت اس وقت بھی ہے جب آدمی جنگ کے لئے تلوار استعمال کرتا ہو، اور اس وقت بھی جب جدید ترین اسلحہ کو کام میں لائے، بلکہ وسائل جس قدر بڑھتے جائیں گے، اسی نسبت سے انسان اپنے امن و سلامتی کے لئے اس کی ہدایات اور رہنمائیوں کا زیادہ ضرورت مند ہوتا جائے گا۔

اسلامی قانون کی مصلحت سے ہم آہنگی

اسلامی قانون کی اس ابدیت اور افادیت کا اصل رمز یہ ہے کہ وہ مصلحتوں اور انسانی ضرورتوں کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور اسے قبول کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا کوئی حکم نہیں جو عقل و مصلحت کے خلاف اور حکمت و انسانی ضرورت کے منافی ہو..... قانون شریعت میں بعض مسائل ایسے ضرور ہیں جن کی حکمتیں ہمیں سمجھ میں نہیں آتیں، ایسے مسائل کو اسلامی قانون کے ماہرین ”تعبدی امور“ سے تعبیر کرتے ہیں، عبادات کے مسائل عام طور پر ”تعبدی“ ہیں۔ اس لئے کہ ان کا تعلق خدا اور بندے سے ہے جس میں بغیر سمجھے سر جھکا دینا ہی حقیقی رضا جوئی اور فرمانبرداری کی علامت ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ مسائل عقل و مصلحت کے بھی خلاف ہیں یہ خلاف عقل نہیں ہیں، یہ ”ماورائے عقل“ ہیں جن کی گنہ اور حقیقت تک ہماری عقل نارسا نہیں پہنچ پاتی۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ شریعت اسلامی میں عقل کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور فقہاء اسلام نے ”حفظ عقل“ کو شریعت کے پانچ اہم مقاصد سے میں ایک قرار دیا ہے لیکن اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ عقل کو حکم شرع کے تابع رکھا جائے۔

اس لئے احکام و اشیاء میں حسن و قبح اور نفع و نقصان کے پائے جانے کے سلسلہ میں مسلمانوں میں تین گروہ رہا کئے ہیں، ایک گروہ معتزلہ کا ہے جس کے نزدیک اشیاء کے حسن و قبح میں عقل حاکم اور فیصل کا درجہ رکھتی ہے اور شریعت کے لئے اس کی مطابقت لازم ہے..... دوسرا گروہ اشاعرہ کا ہے، اشاعرہ کے نزدیک کسی شے میں بذات خود حسن اور قبح نہیں ہوتا، حسن و قبح کسی چیز کی ذاتی صفت نہیں ہے، بلکہ حکم شریعت کی بناء پر ہی کوئی حکم

حسن یا فتنج قرار پاتا ہے۔ پس گویا اس گروہ کے نزدیک عقل کا احکام شرعیہ میں کوئی درجہ نہیں۔

تیسرا گروہ ”ماتریدیہ“ کا ہے جس نے ایک درمیانی راہ اختیار کی ہے۔ ماتریدیہ کے نزدیک اشیاء کے حسن و فتنج کی تحقیق میں عقل انسانی کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ البتہ وہ حکم شارع کا تابع ہے، اس لئے اگر شریعت کا کوئی حکم بظاہر خلاف عقل محسوس ہو تو عقل کا اعتبار نہ ہوگا اور حکم شارع کی تعمیل کی جائے گی کہ یہ حکم خلاف عقل نہیں بلکہ ماورائے عقل ہے۔

بہر حال اہل سنت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ عقل نصوص شرعیہ پر حاکم و فیصل نہیں ہے۔ شاطبی نے صحیح لکھا ہے کہ:

”لوجاز للعقل تخطی ماخذ النقل لجاز ابطال الشریعة بالعقل وهذا محال باطل.“^۱

اسلامی قانون جامد نہیں

تاہم چونکہ بعض مسائل میں انسانی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق مصلحتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں، اس لئے فقہ اسلامی میں ایسی لچک موجود ہے کہ نو دریافت شدہ وسائل زندگی، بدلتے ہوئے عرف اور زندگی کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے میں تبدیلی کو سامنے رکھتے ہوئے اسے اپنے عہد سے ہم آہنگ کیا جاسکے اور یہ سب کتاب و سنت کے حدود اربعہ میں ہو، حافظ ابن قیم (۱۲۹۱-۱۳۵۰) نے اپنی گراں قدر تالیف ”اعلام الموقعین“ میں اس موضوع پر ایک مستقل باب قائم کرتے ہوئے لکھا ہے:

عرف و عادات، حالات و مقاصد اور زبان و مکان میں تبدیلی کی بناء پر مسائل میں اختلاف اور تبدیلی کا بیان یہ بڑی مفید اور اہم بحث ہے جس سے ناواقفیت کی وجہ سے شریعت میں بڑی غلطیاں واقع ہوئی ہیں۔ اس نے دشواری، تنگی اور استطاعت سے ماوراء تکلیف پیدا کر دی ہے، جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ شریعت جو مصالح کی غیر معمولی رعایت کرتی ہے، ان ناقابل برداشت کلفتوں کو گوارا نہیں کرتی۔ اس لئے کہ شریعت کی اساس اور بنیاد حکمتوں اور مصلحتوں پر ہے اور اسلام سرپا رحمت اور سرپا مصلحت ہے، لہذا جب کوئی حکم عدل کے دائرہ سے نکل کر ظلم و زیادتی، رحمت کی حدوں سے گزر کر زحمت، مصلحت کی جگہ خرابی اور کارآمد ہونے کے بجائے بے کار قرار پائے تو وہ شرعی حکم نہیں ہوگا۔^۲

علامہ قرانی جو فقہاء مالکیہ میں بڑا اونچا پایہ رکھتے ہیں فرماتے ہیں:

”الجمود علی المنقولات ابد اضلال فی الدین وجہل بمقاصد العلماء المسلمین والسلف الماضیین۔“^۱

ترجمہ: ”ہمیشہ منقولات پر جمود اختیار کرنا، دین میں گمراہی اور مسلمان علماء اور سلف صالحین کے مقاصد سے ناواقفیت ہے۔“

اسی لئے ”مرحوم خلافت عثمانیہ ترکی“ کے مرتب کردہ مجموعہ اسلامی قوانین ”مجلۃ الاحکام“ کے فاضل مرتبین نے ایک مستقل قاعدہ فقہیہ کی حیثیت سے یہ اصل مقرر کی ہے کہ ”لاینکر تغیر الاحکام بتغیر الزمان۔“^۲ علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”بہت سے احکام ہیں جو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتے ہیں اس لئے کہ اہل زمانہ کا عرف بدل جاتا ہے، نئی ضرورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اہل زمانہ میں فساد (اخلاق) پیدا ہو جاتا ہے اب اگر حکم شرعی پہلے ہی کی طرح باقی رکھا جائے تو یہ مشقت اور لوگوں کے لئے ضرر کا باعث ہو جائے گا، اور ان شرعی اصول و قواعد کے خلاف ہو جائے گا، جو سہولت اور آسانی اور نظام کائنات کو بہتر اور عمدہ طریقہ پر رکھنے کے لئے ضرور و فساد کے ازالہ پر مبنی ہے۔“^۳

جدید مسائل کا فقہی حل اور دنیا کے بدلتے ہوئے نظام پر اسلامی قانون کا انطباق ان مسائل میں سے ہے، جس کو اس دور کا اہم ترین اور بنیادی مسئلہ کہا جاسکتا ہے، اور شرع اسلامی کو زندہ و حاضر اور عصری ثابت کرنے کی سب سے بہتر اور واحد صورت یہی ہے کہ ہم اسلامی قانون کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کریں کہ وہ جدید مسائل کا متوازن اور مناسب حل پیش کرتا ہو۔

حضرت عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا شورائی اجتہاد

اسلامی تاریخ میں موجودہ دور کے علاوہ غالباً دو دفعہ اس کی نوبت آئی..... اس وقت بالغ نظر علماء اور فقہاء نے پوری بصیرت کے ساتھ اس فریضہ کو انجام دیا، ان میں پہلا واقعہ سیدنا حضرت عمر فاروق رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے عہد کا ہے، عہد رسالت میں اسلامی مملکت، حجاز اور اس کے گرد و نواح تک محدود تھی، عہد صدیقی میں حضور ﷺ کے وصال کے ساتھ ہی مختلف سمتوں سے نبوت کے جھوٹے دعویدار اٹھ کھڑے ہوئے، جن کی وجہ سے ایک قابل لحاظ تعداد مرتد ہو گئی، بعض لوگوں نے زکوٰۃ کی فرضیت سے انکار کر دیا اور کچھ لوگ زکوٰۃ کے قائل تو تھے مگر اس کے لئے تیار نہ تھے کہ اسلامی مملکت کے بیت المال کو یہ مال حوالہ کریں اور خلیفۃ المسلمین کے دست

^۱ کتاب الفروق: ۱/۱۷۷ مسئلہ الثالثہ ^۲ مجلہ الاحکام دفعہ: ۳۹ ^۳ رسائل ابن عابدین: ۲/۱۲۵

اختیار میں دیں۔

ان حالات میں ضروری تھا کہ بروقت ان فتنوں کو کچل دیا جائے، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مختصر عہد خلافت میں پوری توجہ اسی پر مرکوز رکھی، یہاں تک کہ وہ جان آفریں سے جا ملے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فتوحات کی طرف توجہ کی، اور وقت کی دو عظیم الشان ملکیتیں روم و ایران اسلام کے زیر نگین آ گئیں، حکومت اسلامی بہت وسیع ہو گئی، ریاست کے مختلف صوبوں میں باضابطگی پیدا کرنا ضروری ہو گیا، دنیا کی دو ایسی تہذیبوں سے سابقہ پیش آیا، جو عربوں سے یکسر مختلف تھیں، ان حالات نے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے، اس وقت اکابر صحابہ موجود تھے، انہوں نے انفرادی طور پر بھی ان مسائل کو حل کرنے کی سعی کی اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرکاری سطح پر بھی ایک مجلس تشکیل دی جو ایسے جدید مسائل پر اجتہاد اور غور و فکر کیا کرتی تھی۔

اسلامی حکومت کے ساتھ مجلس شوریٰ کا اصل مفہوم تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ امیر کو سیاسی مسائل پر مشورے دیا کرے گی، مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جن ارکان کو اپنی شوریٰ کے لئے منتخب کیا تھا وہ محض سیاسی دانشمندی اور بصیرت ہی سے بہرہ ور نہ تھے بلکہ قانونی باریکیوں پر گہری نظر رکھتے تھے اور تفقہ کی زبردست صلاحیت کے مالک تھے، ان سے صرف سیاسی، انتظامی اور جنگی مسائل و مہمات ہی پر مشورے نہیں ہوتے تھے بلکہ خالص فقہی اور قانونی مسائل پر بھی ان کو اجتہاد اور غور و فکر کی دعوت دی جاتی تھی۔

ان علماء کئی تعداد قیاس ہے کہ گھٹی بڑھتی رہی ہوگی، مگر خاص طور پر جن لوگوں کے نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں: حضرت علی، حضرت معاذ بن جبل، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین شراب نوشی کی سزا اسی کوڑے، ایسے ہی اجتماعی مشورہ سے طے ہوئی، اسلامی سنہ کا آغاز واقعہ ہجرت سے ہوا یہ کلینڈر بھی اسی طرح طے کیا گیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب (م ۱۷۶۷ھ) لکھتے ہیں:

”کان من سيرة عمر انه كان يشاور الصحابة ويناضرهم حتى تنكشف الغمد

ويأتيه اشبه فصار غالب قضاياه وفتاواه متبعة في مشارق الارض ومغاربها۔“

ترجمہ: ”حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طریقہ تھا کہ صحابہ کرام سے مشورہ اور بحث کرتے تھے،

یہاں تک کہ پردہ اٹھ جائے اور مسئلہ کا صحیح تر حل سامنے آ جائے، اسی وجہ سے ان کے اکثر فیصلوں

کی مشرق و مغرب میں پیروی کی گئی۔“

اس قسم کے شورائی اجتہاد کا سب سے مشہور واقعہ ان زمینوں کی تقسیم کا ہے، جو عراق و شام فتح کئے جانے کے

بعد پیش آیا، بعض صحابہ چاہتے تھے کہ عام اسلامی قانون کے مطابق زمین کے چار حصے مجاہدین میں تقسیم ہوں اور ایک حصہ بیت المال کی ملکیت رہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چاہتے تھے کہ دفاعی اخراجات اور دوسری انتظامی ضروریات کے لئے اس کو مستقل ذریعہ آمدنی بنایا جائے، اور اس طرح زمین اس کے موجودہ باشندوں ہی کو دے کر ان پر لگان عائد کر دیا جائے، حضرت علی، عثمان، طلحہ اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بھی یہی رائے تھی، چنانچہ اس مسئلہ پر کئی دنوں تک بحث کا سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ صحابہ کا اس رائے پر اتفاق ہو گیا جو خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تھی۔^۱

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو اس کام کو اسٹیٹ کی سطح پر کرتے تھے، لیکن اسلام میں اخذ و استنباط اور تفقہ و اجتہاد نے میں جو فکری آزادی دی گئی تھی اس کا تقاضہ تھا کہ عوامی سطح پر بھی اہل علم شرعی احکام میں غور و خوض کریں، اگر یہ آزادی نہ دی جاتی تو اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ بعد کو جب اہل ہوس مسند آراء اقتدار ہوں تو وہ ایسی کوششوں کا سیاسی فائدہ اٹھانا شروع کر دیں اور افتاء و اجتہاد کو سرکاری نظام کے تابع کر کے حسب خواہ فتاویٰ حاصل کیا کریں۔ اس لئے دوسرے اہل علم بھی اپنی سطح پر ”اجتماعی اخذ و استنباط“ اور ”شورائی فکر و اجتہاد“ میں مصروف رہتے تھے امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے بقول عہد فاروقی میں ایسی دوسہ رکنی مجلسیں تھیں، ایک میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما تھے اور دوسری میں حضرت علی، ابی بن کعب اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے۔^۲

قرن اول میں اجتماعی اجتہاد اور پیش آمدہ احکام پر شورائی غور و فکر کی بابت احمد امین لکھتے ہیں:

میمون بن مہران سے منقول ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے جب مقدمات آتے تو کتاب اللہ پر نظر کرتے، اگر اس میں فیصلہ کی بنیاد مل جاتی تو اس سے فیصلہ فرماتے، کتاب اللہ میں نہ مل پاتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مروی ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے..... سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ مل پاتی تو سربر آوردہ اور ممتاز لوگوں کو جمع فرماتے (جمع رؤس الناس وخیارہم) اور ان سے مشورہ کرتے، اگر وہ کسی بات پر متفق ہو جاتے تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے..... سرحسی کی مبسوط میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجود خود فقیہ ہونے کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ کرتے، جب کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو کہتے کہ علی اور زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور فلاں فلاں کو میرے پاس بلا لاؤ۔ چنانچہ ان سے مشورہ کرتے اور جس بات پر اتفاق ہو جاتا اس کے مطابق فیصلہ فرماتے، شععی سے منقول ہے کہ معاملات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں پیش

^۱ الاستخراج لاحکام الخراج للامام عبدالرحمن ابن رجب حنبلی: ۹

^۲ کتاب الآثار للامام محمد، باب فضائل الصحابة

ہوتے تو بعض اوقات ایک ایک ماہ اس میں غور کرتے اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ فرماتے اور کبھی ایک ہی مجلس میں سو، سو فیصلے فرماتے۔^۱

سعید بن مسیب حضرت علی رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے ناقل ہیں۔ حضرت علی رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا، میں نے دریافت کیا، اللہ کے رسول ﷺ! بعض ایسے معاملات ہمارے یہاں پیش آتے ہیں جن کے بارے میں نہ قرآن نازل ہوا اور نہ اس بارے میں حدیث موجود ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا ایسے معاملات کے لئے اہل ایمان میں سے علماء کو جمع کرو اور باہمی مشورہ سے طے کرو، محض کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔^۲

امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا طریق اجتہاد

عہد صحابہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ کے بعد جب کہ خلافت کی جگہ بادشاہت نے لے لی، نظم مملکت بہت وسیع ہو گیا، مختلف نوزائیدہ فرقوں نے اپنے مخصوص اعتقادات اور نظریات کو درست قرار دینے کے لئے حدیثیں گھڑنی شروع کر دیں، اور صحابہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ کے گزر جانے کی وجہ سے ”جدید فقہی مسائل“ کے حل کے لئے کوئی مرجع باقی نہ رہا، ایک مرتبہ پھر فقہی مسائل کے حل اور اس کی باضابطہ تدوین کی ضرورت پیش آئی۔

اس وقت بھی عالم اسلام میں بیدار مغز اور بالغ نظر علماء کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو انفرادی اور ذاتی اجتہاد کے ذریعہ لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، اس دور میں امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے سر یہ سہرا بندھا کہ انہوں نے حضرت عمر رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی طرح ”شورائی اجتہاد“ سے کام لیا اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین کو یکجا کر کے کی باہمی تعاون سے فقہ مرتب کی چنانچہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی اس ”مجلس تدوین“ کے ارکان کی تعداد چالیس تک تھی، جن میں اسلامی علوم کے مختلف شعبوں میں مہارت اور امتیاز رکھنے والے شامل تھے۔

خود امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے ایک بار اپنی اس مجلس کے ممبروں کے علمی اور فقہی مقام پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ان میں سے ۲۸/۱ ایسے ہیں جو قاضی بن سکیں، ۶/۱ اپنے اندر افتاء کی صلاحیت رکھتے ہیں اور دو قاضیوں اور مفتیوں کی تربیت کے اہل ہیں۔

امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے سوانح نگاروں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی مجلس میں ہر مسئلہ پر کھل کر اور آزادانہ بحث ہوتی تھی، موفق بن احمد کی نے عبد اللہ بن مبارک سے نقل کیا ہے کہ ایک مسئلہ پر تین دنوں تک بحث کا سلسلہ جاری رہا، تیسرے دن شام کے وقت جب میں نے اللہ اکبر کی صدا سنی تو معلوم ہوا کہ

اب اس مسئلہ میں کوئی فیصلہ ہو گیا ہے۔^۱

علامہ شبلی نعمانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۱۲۷۴-۱۳۳۲) نے اپنی مایہ ناز تصنیف ”سیرۃ النعمان“ میں امام صاحب کے شورائی اجتہاد کے طریق کار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

”امام صاحب نے جس طریقہ سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا وہ نہایت وسیع اور پر خطر تھا، اس لئے انہوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا، اس غرض سے انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور شخص انتخاب کئے جن میں سے اکثر خاص خاص فنون میں جو تکمیل فقہ کے لئے ضروری تھے، استاد زمانہ تسلیم کئے جاتے تھے۔ محمد بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، قاضی ابویوسف، داؤد الطائی، حبان مندل حدیث و آثار میں نہایت کمال رکھتے تھے، امام زفر قوت استنباط میں مشہور تھے، قاسم بن معن اور امام محمد کو ادب اور عربیت میں کمال تھا، امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ان لوگوں کی شرکت سے ایک مجلس مرتب کی اور باقاعدہ طور سے فقہ کی تدوین شروع ہوئی امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے تلامذہ جنہوں نے فقہ کی تدوین کی، چالیس تھے، جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے، ابویوسف، زفر، داؤد الطائی، اسد بن عمر، یوسف بن خالد سمی، یحییٰ بن ابی زائدہ۔ امام طحاوی نے یہ بھی روایت کی ہے کہ لکھنے کی خدمت یحییٰ سے متعلق تھی۔“^۲

مدینہ کے فقہاء سبعہ

ہر چند کے صحابہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کے بعد امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کو اس شورائی اجتہاد اور اجتماعی طور پر فقہ کی تدوین اور پھر اس کی اشاعت میں خاص مقام حاصل ہے اور انہوں نے صرف کوفہ کے رجال بلکہ عالم اسلام کے مغز و قلب اور لالہ و جگر اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین بلکہ مجتہدین کو اپنی مجلس میں جمع کر لیا تھا، تاہم محدود سطح پر اسلامی فنون کے دوسرے مراکز میں بھی ایسی خدمتیں انجام پا رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں خصوصیت سے مدینہ کے فقہاء سبعہ قابل ذکر ہیں۔ جن کا عبداللہ بن مبارک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے بیان کے مطابق معمول تھا کہ:

”جب ان کے پاس کوئی مسئلہ آتا تو اجتماعی طور پر اس میں غور و فکر کرتے قاضی اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتا جب تک مسئلہ ان کی مجلس میں پیش نہیں کیا جاتا اور وہ اس میں غور و فکر کے بعد اپنی رائے

صادر نہ فرمادیتے۔“ ۱

نیا زمانہ، نئے تقاضے

اس کے بعد تقلید کا رواج ہوا، اور مختلف دبستان فقہ کے الگ الگ قانونی مجموعے مرتب ہوئے جو اس قدر جامع اور مسائل زندگی کو حاوی و شامل تھے جن کی نظیر دنیا کے کسی قانون میں شاید آج بھی نہ مل سکے..... چنانچہ صدیوں فقہی مجموعے کسی اضافہ اور ترمیم کے بغیر کفایت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سترھویں صدی عیسوی کا آفتاب دنیا میں ایک نئے انقلاب کے ساتھ طلوع ہوا، یہ انقلاب صنعت و حرفت کی ترقی اور مشینوں کا تھا، اب وسائل بدل گئے اور ایجادات و اکتشافات کی ایک ایسی دنیا منصفہ شہود پر آئی جہاں تک شاید پہلے شاعروں کے تخیل کی پرواز بھی نہ ہوئی ہو اور کسی مرد خوش خیال نے خواب میں بھی ان کا تصور نہ کیا ہو، اس علمی غلبہ نے سیاست و اقتدار کے ایوانوں کو بھی لرزہ بر اندام کر دیا اور عالم اسلام کو اپنی کوتاہ عملی اور عشرت سامانی کی سزا میں سیاسی مغلوبیت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس سیاسی شکست نے زاویہ فکر میں بھی تبدیلی پیدا کی، نئے نئے سیاسی نظام ابھرے، اخلاقی قدروں میں زوال آیا، دنیا کے معاشی ڈھانچے میں بھی ایک غیر معمولی تغیر رونما ہوا، اور مسلمانوں کی شامت اعمال سے عالمی نظام معیشت کی لگام اسلام کے ہاتھوں میں نہ رہ سکی، اس طرح بہت سے مسائل پیدا ہوئے اور چونکہ مسلم ممالک میں بھی نظم مملکت کی باگ ڈور اسلام کے ہاتھ میں نہ تھی اس لئے سرکاری اور اجتماعی سطح پر وہ حل نہ ہو سکے۔

افراط و تفریط

اب جو مسائل عصر حاضر میں حل طلب ہیں، بعض حضرات اس کے لئے دین کے مسلمات میں تغیر کو ضروری سمجھتے ہیں، گویا ان کے نزدیک (نعوذ باللہ) خدا اور اس کے رسول کے احکام بھی اصلاح کے محتاج ہیں، پاکستان میں سود، شراب، ارتداد اور خواتین کے حقوق وغیرہ کے سلسلہ میں بعض معروف شخصیتیں اور ملک کے اعلیٰ ترین قانونی اداروں نے جو رویہ اختیار کیا اور آج بھی کر رہے ہیں، یہ اس کی ادنیٰ مثال ہے، مصر و شام اور عراق و ترکی کے حالات تو اس سے بھی زیادہ ناگفتنی ہیں..... یہ دراصل ایک بڑی جسارت ہے۔ قرآن و حدیث آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے ”ابدی ماخذ“ ہیں، ان میں ادنیٰ تغیر کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ضرورت، ان احکام کی حیثیت دراصل ”حدود اربعہ“ کی ہے، اس کے اندر رہ کر ہم جس قدر توسع چاہیں، برت سکتے ہیں، مگر ان سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔

۱۔ تہذیب التہذیب: ۳/۴۷ ترجمہ سالم بن عبد اللہ

اس کے بالمقابل کچھ لوگ ہیں، جو جدید حالات کے پیش نظر فقہ کے قدیم ذخیرہ میں ادنیٰ تغیر اور تبدیلی کے روادار نہیں ہیں اور اجتہادی اور ^{مصلحتی} احکام کو بھی نصوص کی طرح ناقابل تغیر سمجھتے ہیں۔ یہ دوسری انتہاء ہے جو اسلام کے ساتھ ”نادان دوستی“ کا مصداق ہے اور شریعت کے مزاج و مذاق سے نا آگہی ہے، اس سے شریعت اسلامی کے تئیں بدگمانی جنم لے گی اور نئی نسل اسلام کو ایک فرسودہ اور دوراز کار نظام حیات تصور کر کے مغرب کے دروازہ پر دستک دینے لگے گی اور اسی طرح کا تصور ابھرے گا جو عیسائیت کے بارے میں پیدا ہوا کہ مذہب کا دائرہ اعتقادات و عبادات تک محدود رکھا جائے اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں انسان اپنی خواہشات کی شریعت وضع کر لے۔

تغیر پذیر اور ناقابل تغیر احکام

یہاں اس بات کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ شریعت میں کچھ احکام ناقابل تغیر ہیں، یہ ہیں عبادات، حقوق و فرائض، وہ محرمات جن کا نصوص میں ذکر موجود ہے، حدود و قصاص، اوزان و مقادیر، وہ مباحات جن کی اباحت پر نص وارد ہے، اجماعی احکام..... کچھ احکام وہ ہیں جن میں متورع، اصحاب فضل و تقویٰ اور ارباب علم و بصیرت حالات زمانہ کی روشنی میں غور کر سکتے ہیں یہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱ وہ مباح جن کی اباحت پر نص وارد نہیں ہے، بلکہ اس کے جائز و ناجائز ہونے کی بابت نص کے سکوت کی وجہ سے ان کو مباح مان لیا گیا ہے، فقہاء ایسی مباحات کو ”عفو“ سے تعبیر کرتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اگر کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا جسے نص کے ذریعہ حرام نہیں کیا گیا ہے، تو جواب دیتے کہ ”عفو“ ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حلال کو نص کے ذریعہ حلال کر دیا ہے، اور حرام کو حرام کر دیا ہے، پس جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا وہ حلال ہے، اور جسے حرام قرار دیا وہ حرام ہے، اور جس سے خاموشی اختیار کی، وہ ”عفو“ ہے۔ اکثر انتظامی قوانین اسی نوعیت کے ہیں، اس لئے ہر زمانہ کے حالات اور مصالح کے اعتبار سے ان میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

۲ قرآن و حدیث کی وہ اصطلاحات جن کا خود صاحب شریعت نے قطعی مفہوم متعین نہیں کیا ہے، بلکہ ان کو ہر زمانہ اور ہر عہد کے عرف سے متعلق رکھا ہے، جیسے: قبضہ، عدل وغیرہ کہ قرآن و حدیث میں ان الفاظ کا مصداق متعین و محدود نہیں ہے اس لئے ہر عہد کے حالات کے لحاظ سے ہی اس کا مفہوم متعین ہو سکے گا۔

۳ تیسرے تعزیری قوانین ہیں، شریعت نے کچھ بڑے جرائم..... زنا، چوری، رہزنی، شراب نوشی، تہمت

اندازی اور ارتداد..... کی سزا مقرر کر دی ہے، ان کو ”حدود“ کہتے ہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان پر جسمانی زیادتی کرے، اور اسے قتل یا زخمی کر دے، اس کے لئے بھی شریعت نے سزا مقرر کی ہے، جس کو قصاص و دیت کہتے ہیں، ان کے علاوہ بے شمار جرائم ہیں، جن کی سزا متعین و مقرر نہیں ہے، حکومت وقت اور عدالت کو اختیار ہے کہ جرم کے حالات اور اپنے زمانہ کے سماجی و اخلاقی احوال کو سامنے رکھ کر اس کی سزا متعین کرے۔ اس طرح جرم و سزا کے باب میں اختیار تمیزی کا ایک وسیع باب کھلا ہوا ہے۔

پس اعتدال کی راہ یہ ہے کہ شریعت کی متعین حدود پر قائم رہتے ہوئے زمانہ، مقامی حالات، عرف و عادت، سیاسی اور اخلاقی قدروں کی تبدیلی کی رعایت کی جائے، اس سلسلہ میں حافظ ابن قیم (۱۲۹۱-۱۳۵۰) کا قول ہم ابھی نقل کر آئے ہیں، یہی ہر عہد میں سلف صالحین اور فقہاء اسلام کا طریقہ رہا ہے۔

تعبیر احکام

اس کے لئے فقہ اسلامی میں کسی جوہری تبدیلی کی ضرورت نہیں، نہ دین کے مسلمات اور متفق علیہ مسائل و احکام پر نظر ثانی کی گنجائش ہے، ایسا کرنا دین میں تحریف و تصحیف کے مترادف ہوگا..... اس کے لئے تین باتیں درکار ہوں گی! اول یہ کہ جن نوپید مسائل کی بابت قرآن و حدیث کی صراحت نہیں ملتی اور گزشتہ فقہاء و اہل علم کا اجتہاد بھی اس باب میں خاموش ہے، ان پر دین کے اصول و قواعد کی تطبیق کی جائے۔

یہ بھی ایک طرح کا اجتہاد ہے جو ”تحقیق مناط“ کہلاتا ہے، اجتہاد کے تین مرحلے ہیں، پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کتاب و سنت کے کسی صریح حکم میں غور کیا جائے کہ اس میں وہ کیا باتیں پائی جاتی ہیں جو کسی درجہ میں بھی اس حکم کا سبب بن سکتی ہیں اسے ”تخریج مناط“ کہتے ہیں۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ایسے مختلف اسباب میں وہ سبب متعین کیا جائے جو واقعی اس حکم کی وجہ قرار دی جاسکتی ہے، یہ ”تنقیح مناط“ ہے اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ وہ سبب اور علت جہاں جہاں پائی جائے وہی حکم اس پر لگایا جائے، اس کو ”تحقیق مناط“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جیسے قرآن مجید میں ”خمر“ (انگوری شراب) کو حرام قرار دیا گیا ہے، اب سب سے پہلے اس بات پر غور کیا گیا کہ اس کے حرام قرار دینے کے کیا ممکنہ اسباب ہو سکتے ہیں؟ مثلاً یہ بات کہ وہ انگور سے بنائی گئی ہے یا یہ کہ اس میں مٹھاس اور شیرینی ہے، یا یہ کہ وہ ایک سیال مشروب ہے یا یہ کہ اس میں نشہ پایا جاتا ہے، یہ گویا ”تخریج مناط“ ہوا، دوسرے مرحلہ میں اس پر غور کیا گیا کہ ان امور میں سے وہ کیا چیز ہے جو حقیقی معنوں میں اس کے حرام ہونے کا سبب ہو سکتی ہے؟ تو دیکھا گیا کہ انگور خود حلال ہے، مٹھاس اور سیال ہونا ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی چیز کو حرام کہا جائے، لہذا اب یہ بات واضح ہو گئی کہ حرمت کا اصل سبب اس کا ”نشہ آور ہونا“ ہے اسے

”تنقیح مناط“ کہیں گے، اب جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ نشہ کی وجہ سے ”خر“ کے حرام ہونے کا حکم دیا گیا ہے تو جو چیزیں نشہ آور ہوں گی، ان کو حرام قرار دیا جائے گا اور یہ ”تحقیق مناط“ کہلائے گا۔

امام ابواسحاق شاطبی نے لکھا ہے کہ اجتہاد کی پہلی دونوں صورتوں کا دروازہ تو بند ہو چکا ہے لیکن تیسری صورت یعنی ”تحقیق مناط“ کا سلسلہ قیامت تک رہے گا اور اجتہاد کی یہ وہ قسم ہے، جس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوگا۔

”الاجتہاد علی ضربین احدهما لا یمکن ان ینقطع حتی ینقطع اصل التکلیف وذلک عند الساعة والثانی یمکن ان ینقطع قبل فناء الدنیا فاما الاول فهو الاجتہاد المتعلق بتحقیق المناط وهو الذی لاخلاف بین الائمة فی قبوله.“^۱

ترجمہ: ”اجتہاد کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک کہ انسان احکام شرعیہ کا مخاطب ہے، یعنی قیام قیامت تک، دوسری وہ جو دنیا کے ختم ہونے سے پہلے ختم ہو سکتی ہو، پہلی قسم سے مراد وہ اجتہاد ہے جو تحقیق مناط سے متعلق ہو۔ یہ اس کی وہ قسم ہے جس کے قبول کئے جانے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔“

اجتہاد سے میری مراد اسی نوعیت کا اجتہاد ہے!

اس طرح کے اجتہاد کی ضرورت دنیا کے ان بعض جدید نظاموں اور طریقوں کے لئے ہوگی جو خاص ہمارے دور کی پیداوار ہیں، مثلاً سیاسی بیعت کا تصور اسلام میں موجود ہے کیا موجودہ زمانہ میں بعض تبدیلیوں کے ساتھ الیکشن کے ووٹ اس کو پورا کر سکتے ہیں؟ یہ قابل غور ہے، ریلوے ٹکٹ، ”اجارہ کا وثیقہ“ ہے، بینک کی بعض صورتوں پر سود کا اطلاق ہوگا، انشورنس کی بعض اسکیمیں ”قمار“ اور جوئے میں داخل ہوں گی، الکحل نشہ آور ہونے کی بناء پر حرام ہوگا۔ ٹیسٹ ٹیوب سے بچوں کی پیدائش اور ان کے نسب کے ثبوت کا مسئلہ، فیملی پلاننگ کے لئے ”عزل“ اسقاط حمل اختصاء اور حمل کی صلاحیت ضائع کرنے کے موجب دیت ہونے کے احکام کو نظیر بنانا یہ سارے احکام اور اس نوعیت کے دوسرے احکام کے حل کے لئے اسی ”تحقیق مناط“ کی ضرورت پیش آئے گی۔

اسلامی متبادل

دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ذرائع مواصلات کی ترقی، بین ملکی روابط، ملکوں کے فاصلوں میں کمی، کاروبار

ومعاملات میں تنوع اور نئی مشینیں ایجادات کے استعمال میں بڑھتے ہوئے امکانی خطرات نے بعض ایسے کاروباری نظام کو وجود بخشا ہے جو ماضی میں نہیں تھا، یا اس درجہ منظم اور وسیع ڈھانچہ نہیں رکھتا تھا، مثلاً بینک کا نظام، خطرات سے پر صنعتوں اور کاروباروں کیلئے انشورنس، بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا قیام وغیرہ، ان کو محض یہ کہہ کر رد کر دینا کافی نہیں کہ اس میں سود اور قمار ہے یا فلاں خلاف شرع بات ہے، بلکہ ضروری ہے کہ کتاب و سنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس کا اسلامی متبادل تلاش کیا جائے۔ اس کے بغیر ہم شریعت اسلامی کی ابدیت اور ہر عہد میں اس کی افادیت و نافعیت اور بدلتے ہوئے حالات میں اس کی رہنمائی کی صلاحیت ثابت نہیں کر سکیں گے، ہمیں غیر اسلامی عناصر سے پاک کر کے اس کے مثبت اور مفید پہلوؤں کو نیا ڈھانچہ اور قالب دینا ہوگا۔

دوسرے دبستان فقہ سے استفادہ

جدید مسائل کے حل کے سلسلہ میں تیسرا اہم کام یہ ہے کہ جن مسائل میں فقہ حنفی پر عمل میں واقعی حرج و تنگی ہو، اجتماعی ضرورت کو سامنے رکھ کر دوسرے دبستان فقہ سے جزوی استفادہ کیا جائے، البتہ اس کے لئے حد درجہ حزم و احتیاط سے کام لینے اور ایسے مسائل میں علماء و ارباب افتاء کے اجتماعی فیصلہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں کسی قدر وضاحت مناسب ہوگی۔

ضرورت کی بناء پر عدول

ضرورت کی بناء پر جزوی عدول کے جائز ہونے پر اکثر لوگوں کا اتفاق ہے، چنانچہ فقہاء شوافع میں سے زرکشی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے نقل کیا ہے:

”الثالثة ان يقصد بتقليده الرخصة في ما هو محتاج اليه لحاجة لحقته او ضرورة ارفقته فيجوز ايضا ان يعتقد رجحان مذهب امامه ويقصد تقليد الاعلم فيمتنع وهو صعب والاولى الجواز.“^۱

ترجمہ: ”تیسری شرط یہ ہے کہ وہ رخصت کی پیروی ایسی صورت میں کر رہا ہو جس میں وہ کسی پیش آمدہ حاجت یا ضرورت کی وجہ سے اس کا محتاج ہو تو یہ صورت بھی جائز ہے سوائے اس کے کہ وہ اپنے امام کے مذہب کے رائج ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو اور نیت عالم ترقیہ کی تقلید کی ہو، تو ایسی صورت میں دوسرے فقیہ کے یہاں موجود رخصت کی پیروی جائز نہ ہوگی، یہ مشکل ہے اور صحیح تر رائے یہ ہے کہ اس صورت میں بھی جائز ہے۔“

زرکشی ہی نے امام نووی کے فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ ان سے کسی مقلد مذہب کی بابت دریافت کیا گیا:

”هل يجوز له ان يقلد غير مذهبه في رخصة لضرورة ونحوها؟“

ترجمہ: ”کیا اس کے لئے ضرورت وغیرہ کی بناء پر دوسرے مذہب کی رخصت کی تقلید جائز ہوگی؟“

اور امام نووی نے اس کا جواب مثبت دیا۔^۱

فقہاء حنفیہ کے اقوال

فقہاء حنفیہ کے یہاں ایسے اقوال بھی صریحاً منقول ہیں جو ازراہ ضرورت دوسرے مذہب پر فتویٰ کو درست قرار دیتے ہیں اور عملاً ایسی جزئیات بھی موجود ہیں جن سے اس نقطہ کی تائید ہوتی ہے، خاتم الفقہاء علامہ شامی کا بیان ہے:

”والحاصل انه اذا اتفق ابوحنيفة وصاحباہ علی جواب لم یجز العدرل عنه
الضرورة“^۲

ترجمہ: ”خلاصہ یہ ہے کہ امام صاحب اور صاحبین جس جواب پر متفق ہوں اس سے عدول جائز نہیں، البتہ ضرورت کی بناء پر جائز ہے۔“

”ممتدة الطهر“ (جس کو باوجود جوان ہونے کے عرصہ تک ماہواری نہ آئے) عورت کی عدت کے سلسلہ میں فقہاء مالکیہ کی رائے ہے کہ نو ماہ کے اختتام پر اس کی عدت تمام ہو جائے گی۔ بزازیہ میں اسی قول پر فتویٰ دیا گیا ہے۔ شامی اسی کے ذیل میں فرماتے ہیں:

”نظیر عدة ممتدة الطهر التي بلغت بروية الدم ثلاثة ايام ثم امتد طهرها فانها تبقى في العدة الى ان تحيض ثلاث حيض وعند مالك تنقضي عدتها بتسعة اشهر وقد قال في البزازیة الفتوى في زماننا علی قول مالك وقال الزاهدی كان بعض اصحابنا يفتون به للضرورة.“^۳

ترجمہ: ”جس عورت کو تین دن خون آیا اور وہ بالغ ہوگئی، پھر اس کا طہر طویل تر ہوتا گیا، ایسی ممتدة الطہر عورت تین حیض تک عدت میں رہے گی، امام مالک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک نو ماہ میں اس کی عدت پوری ہو جائے گی اور بزازیہ میں کہا ہے کہ ہمارے زمانہ میں امام مالک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی

^۱ البحر المحیط: ۳۲۶/۶ رسم المفتی: ۷۰ سعید یہ سہارنپور

^۲ رد المحتار: ۳۳۰/۳ نیز دیکھئے کتاب مذکور: ۲۰۲/۲

کے قول پر فتویٰ ہے اور زاہدی کا بیان ہے کہ ہمارے بعض اصحاب اسی پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔“
حنفیہ کے یہاں مدیون کی کوئی ایسی چیز حاصل ہوئی ہو جو دین کی جنس سے ہو تو وہ اس سے اپنا دین وصول کر سکتا ہے اگر خلاف جنس شی حاصل ہوئی ہو تو اس سے دین وصول نہیں کر سکتا، لیکن امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک وصول کر سکتا ہے، اس پر ہسکفی نے ”المجتبیٰ“ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اس میں زیادہ وسعت ہے، لہذا ازراہ ضرورت اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ ”وہو اوسع فیعمل بہ عند الضرورة۔“ شامی نے اس پر قہستانی سے یہ توجیہ نقل کی ہے:

”وان لم یکن مذهبنا فان الانسان یعذر فی العمل بہ عند الضرورة۔“^۱
تَرْجَمَہُ: ”گو ہمارا یہ مذہب نہیں مگر آدمی ضرورت کے مواقع پر اس پر عمل کرنے میں معذور ہے۔“
شاہ ولی اللہ صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ”عمدة الاحکام“ کی ”کتاب الکراہیت“ سے نقل کیا ہے:
”سورالکلب والخنزیر نجس خلا فاما لک وغیرہ ولو افتی بقول مالک جاز۔“^۲
تَرْجَمَہُ: ”کتے اور سور کا جوٹھا ناپاک ہے، بخلاف امام مالک وغیرہ کے، تو اگر امام مالک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے قول پر فتویٰ دے دیا جائے تو جائز ہے۔“

فقہاء حنفیہ کے یہاں اس سلسلہ میں بہت سی نظیریں موجود ہیں، شوہر میں بعض عیوب وامراض پیدا ہو جانے کی صورت میں تفریق کا حق، مفقود الخبر کی زوجہ کے لئے تفریق کا حق، تعلیم قرآن اور اذان وامامت پر اجرت، کمیشن ایجنٹ (سمسار) کا کاروبار وغیرہ، کتنے ہی مسائل ہیں جن میں فقہاء متاخرین نے دوسرے مکاتب فقہ کی آراء سے فائدہ اٹھا کر امت کو مشقت سے بچایا ہے اور ”اختلاف امتی رحمۃ“ کا عملی ثبوت پیش کیا ہے۔

عرف وعادت کی بناء پر تغیر احکام عدول نہیں ہے

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ عدول کا تعلق ان مسائل سے ہے جن میں مجتہد کی رائے دلائل وبرہان پر مبنی ہو، اگر کوئی رائے اپنے زمانہ کے عرف اور مصالح پر مبنی ہو اور عادات واحوال بدل جانے کی وجہ سے احکام میں تغیر کو قبول کیا گیا ہو تو وہ عدول ہے ہی نہیں، بلکہ یہ دراصل اصحاب مذہب ہی کے منشاء و مذاق اور فکر و مزاج کی رعایت کی پیروی سے عبارت ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے متعدد مقامات پر اس سلسلہ میں بڑی نفیس اور عمدہ بحث کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

”وافقاء هم بالعفو عن طين الشارع للضرورة وبيع الوفاء والاستصناع والشرب من السقا بلا بيان مقدار ما يشرب ودخول الحمام بلا بيان مدة المكث ومقدار ما يصيب من الماء واستقراض العجين بالخبز بلا وزن وغير ذلك مما بنى على العرف وقد ذكر من ذلك في الاشباه مسائل كثيرة (فهذه) كلها قد تغيرت احكامها لتغير الزمان اما للضرورة واما للعرف واما لقرائن الاحوال وكل ذلك غير خارج عن المذهب لان صاحب المذهب لو كان في هذا الزمان لقال بها ولو حدث هذا التغير في زمانه لم ينص على خلافها.“^۱

ترجمہ: ”ضرورت کی بناء پر سڑک کی کچھڑ سے درگزر، بیع وفاء، استصناع، پینے کی مقدار بتائے بغیر مشکیزہ سے پینا، ٹھہرنے کی مدت اور پانی کے استعمال کی مقدار بتائے بغیر حمام میں داخل ہونا، بلا وزن کئے ہوئے روٹی اور گوندھے ہوئے آٹے کا قرض لینا وغیرہ، ان احکام میں سے ہے جو عرف پر مبنی ہے ”اشباہ“ میں اس نوع کے بہت سے مسائل مذکور ہیں۔ تو ان سب میں تغیر زمان کے باعث احکام میں تغیر ہوا ہے یا تو ضرورت کی بناء پر یا عرف کی بناء پر اور یا قرائن احوال کی وجہ سے، ان تمام صورتوں میں مذہب سے خروج نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس زمانہ میں صاحب مذہب موجود ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے اور اگر عرف و احوال کا تغیر ان کے زمانہ میں پیش آیا ہوتا تو انہوں نے بھی اس کے خلاف نہیں کہا ہوتا۔“

علامہ شامی نے مختلف مواقع پر اس مسئلہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے یہاں ان سب کا نقل کرنا خاصی طوالت کا باعث ہوگا، لیکن ان کی ایک عبارت اگر اس موقع پر نقل نہ کی جائے تو موضوع کے ساتھ انصاف کا حق ادا نہ ہو پائے گا۔ فرماتے ہیں:

”فكثير من الاحكام تختلف باختلاف الزمان لتغير عرف اهله اولحدوث ضرورة اوفساد اهل الزمان بحيث لوبقى الحكم على ماكان عليه اولاللزوم منه المشقة والضرر بالناس ولخالف قواعد الشريعة المبنية على التخفيف والتيسير ودفع الضرر والفساد لبقاء العالم على اتم نظام واحسن احكام ولهذا ترى مشائخ المذهب خالفوا مانص عليه المجتهد في مواضع كثيرة

بناھا علی ماکان فی زمنہ لعلمہم بانہ لو کان فی زمنہم لقال بما قالوا بہ
اخذا من قواعد مذہبہ۔“^۱

ترجمہ: ”بہت سے احکام زمانہ کی تبدیلی سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کا عرف بدل جاتا ہے۔ نئی ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اخلاقی مفاسد در آتے ہیں۔ ان حالات میں اگر پہلے ہی حکم کو باقی رکھا جائے تو یہ لوگوں کے لئے مشقت اور ضرر کا باعث ہوگا۔ اور شریعت کے ان بنیادی قواعد کے مغائر ہوگا جو تخفیف، آسانی اور ضرر و فساد کے دور کرنے پر مبنی ہے۔ تاکہ دنیا صحیح نظام اور بہتر طریقہ پر قائم رہے۔ اسی لئے تم دیکھتے ہو کہ مشائخ نے بہت سے مواقع پر مجتہد کی رائے سے اختلاف کیا ہے جو انہوں نے اپنے زمانہ میں اختیار کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر امام مجتہد اس زمانہ میں ہوتے تو وہی کہتے جو یہ مشائخ قواعد مذہب سے استفادہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔“

یہی بات مالکی مکتبہ فکر کے ممتاز اور مایہ ناز صاحب نظر فقیہ علامہ قرانی نے اس طرح کہی ہے:

”ان اجراء الاحکام اللتی مدرکھا العوائد مع تغیر تلك العوائد خلاف
الاجماع و جہالة فی الدین و کل ما ہو فی الشریعة یتبع العوائد یتغیر الحکم
فیہ عند تغیر العادة الی ما تقتضیہ العادة المتجددة و لیس تجدیدا لاجتہاد
من المقلدین حتی تشتط فیہ اہلیۃ الاجتہاد بل ہذہ قاعدة اجتہاد فیہا
العلماء فأجمعوا علیہا نتبعہم فیہا من غیر استثناف اجتہاد ألا تری أنہم لما
أجمعوا علی ان المعاملات اذا اطلق فیہا الثمن یحمل علی غالب النقود فاذا
كانت العادة نقدا معینا حملنا الاطلاق علیہ فاذا انتقلت العادة الیہ ألغینا
الاول لانتقال العادة عنہ و كذلك الإطلاق فی الوصایا والأیمان و جمیع ابواب
الفقہ المحمولة علی العوائد اذا تغیرت العادة تغیرت الأحکام فی تلك
الأبواب۔“^۲

ترجمہ: ”جن احکام کی اساس عرف و عادت پر ہو ان میں عرف کے تغیر کے باوجود انہیں احکام کو باقی رکھنا اجماع کے خلاف ہے اور دین میں جہالت ہے، شریعت کے وہ تمام احکام جو عرف و عادت پر مبنی ہوں، عرف کے تغیر کے بعد نئے تقاضوں کے مطابق تبدیل ہو جائیں گے، یہ مقلدین کی طرف سے نیا اجتہاد نہیں کہ اس میں اجتہاد کی اہلیت مطلوب ہو بلکہ یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جو اہل علم

کے اجتہاد کا نتیجہ ہے اور اس پر ان کا اجماع و اتفاق ہے، ہم کسی نئے اجتہاد کے بغیر اس میں ان کی پیروی کر رہے ہیں۔

مقام غور ہے کہ چونکہ فقہاء نے اس پر اجماع کر لیا ہے کہ معاملات میں ثمن مطلق ہو تو مروج ترین سکہ مراد ہوگا، لہذا جب عرف ایک متعینہ سکہ کا تھا تو ہم نے اطلاق کو اس پر محمول کیا، پھر جب عرف و عادت میں تبدیلی آئی تو ہم نے اس نئے رواج کے مطابق ثمن کا مصداق متعین کیا اور تبدیلی رواج کی وجہ سے پہلی رائے کو چھوڑ دیا۔

یہی حکم وصیت اور یمین نیز دوسرے فقہی ابواب میں آنے والے مطلق احکام کی بابت ہے کہ وہ عرف پر محمول ہوں گے اور ان ابواب میں بھی عرف کی تبدیلی سے احکام تبدیل ہوں گے۔“ پس عرف اور مصالح زمانہ پر مبنی احکام میں تغیر در حقیقت اپنے مذہب سے عدول نہیں بلکہ اس کے مقصد و منشاء کی تکمیل ہے!

اب ایک نگاہ اس پر بھی ڈالنی چاہئے کہ وہ کیا اسباب و محرکات ہیں جو اسوئال زمانہ میں تغیر کی وجہ سے احکام فقہیہ میں تغیر اور نئے حالات سے ہم آہنگی کے لئے کسی قدر تبدیلی کے متقاضی ہوتے ہیں؟..... اس سلسلہ میں قطعی تحدید تو مشکل ہے لیکن فقہاء کے عمومی طرز عمل کی روشنی میں چند اہم امور کا ذکر کیا جاتا ہے:

اخلاقی زوال

اسلام کے ابتدائی عہد میں اخلاقی سطح جتنی بلند تھی اور احتساب نفس، عند اللہ جواب دہی کا احساس، فکر آخرت اور ایمانی حمیت کی جو سطح تھی، ظاہر ہے اب وہ باقی نہیں رہی۔ جیسے جیسے عہد رسالت اور اس سرچشمہ علم و ہدایت کے فیض یافتہ صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے دوری ہوتی گئی اخلاقی انحطاط بھی بڑھتا گیا، یہاں تک کہ آج اباحت پسندی کا جیسار حجام اور گناہ کو ثواب قرار دینے کی جیسی ہوس کا رانہ خواہش پائی جاتی ہے وہ ہمارے سامنے ہے، ان حالات میں ظاہر ہے وہ احکام جن میں اس زمانہ کی اخلاقی سطح پر اعتماد کیا گیا ہوگا، یا اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے شرطیں لگائی گئی ہوں گی، بدل جائیں گے، اور ان میں تغیر ناگزیر ہو جائے گا..... مثلاً اگر امین سے امانت غیر ارادی طور پر ضائع ہو جائے تو اس سے جرمانہ (ضمان) وصول نہیں کیا جائے گا..... اس اصول کا تقاضا تھا کہ صنعت پیشہ لوگوں کو دی گئی رقم کھو جائے تو ان کو اس کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ لیکن اس کا قوی اندیشہ تھا کہ صنعت کار اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو اپنے لئے ڈھال بنالیں اور اجرت لے کر لوگوں کو مطلوبہ اشیاء نہ دیں۔ اس لئے حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنے دور میں فیصلہ کیا کہ کاریگروں سے ضمان لیا جائے گا

اور ان کا عذر قابل قبول نہ ہوگا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی رائے کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں کے لئے مصلحت اسی میں ہے۔ ”لا یصلح الناس الا بذالك.“^۱

ایسی عورت جس کو طلاق مغلظہ دے دی گئی ہو، اس وقت تک اپنے شوہر کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کوئی مرد اس سے نکاح کر کے بہ طور خود اس کو طلاق نہ دے دے، اس سلسلے میں حضور اکرم ﷺ نے ایسے شخص پر لعنت بھیجی ہے، جو اس نیت سے نکاح کرے کہ وہ اس کو طلاق دے کر پہلے شوہر کے لئے حلال کر دے گا لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے اور صرف اخلاقی رکاوٹ اس کے سد باب کے لئے کافی نہیں ہو رہی ہے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پر سرزنش بھی فرمائی۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے:

”وقواعد عمر فاعلة بالرجم وكانوا عاملين بالطلاق الماذون فيه.“^۲
ترجمہ: ”حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو رجم کر دیا جائے حالانکہ وہ طلاق دے رہا ہے جس کی شرعاً اجازت ہے۔“

قاضی کے لئے ایک اہم شرط ”عادل“ ہونا ہے جس کا مفہوم یہ ہوا کہ ”فاسق“ کا قاضی بنایا جانا درست نہیں ہے۔ چنانچہ اس بات پر اکثر فقہاء کا اتفاق ہے کہ امیر پر کسی عادل شخص ہی کو قاضی مقرر کرنا ضروری ہے..... لیکن اگر امیر کسی فاسق کو قاضی مقرر کر ہی دے تو اس کا فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں؟..... اس باب میں اختلاف ہو گیا۔ امام شافعی کی رائے ہے کہ اگر امام کسی فاسق کو قاضی مقرر کر دے تو بھی وہ قاضی نہیں ہوگا، احناف سے اس سلسلے میں دورائیں منقول ہیں ”نوادر“ کی روایت ہے کہ درست نہیں اور صاحب ”مجمع الانہر“ نے اسی کو ائمہ ثلاثہ کا قول قرار دیا ہے:

”وفی النوادر عن اصحابنا انه لا يجوز قضاء كما فی الاختیار وهو قول الاثمة الثلاثة.“^۳

ترجمہ: ”نوادر میں ہمارے اصحاب سے مروی ہے کہ فاسق کو قاضی بنانا جائز نہیں جیسا کہ ”اختیار“ (نامی کتاب) میں ہے اور یہی ائمہ ثلاثہ کی رائے ہے۔“

لیکن ظاہر روایت کے مطابق احناف فاسق کے قاضی مقرر کرنے کو بھی صحیح اور قابل تنفیذ تصور کرتے تھے ابن ہمام (۸۶۱ھ) اور دوسرے مصنفین کی بھی یہی رائے ہے..... خود شوافع نے بھی محسوس کیا کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے بدلتے ہوئے حالات میں اختیار کی جانی ممکن نہیں ہے، چنانچہ امام غزالی

رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی (۴۰۵ھ) نے اجتہاد کی طرح ”عدالت“ کی شرط بھی حذف کر دی۔

”لكن الغزالي قال اجتماع هذه الشروط من العدالة والاجتهاد وغيرهما متعذر في عصرنا لخلو العصر من المجتهدين العدل فالوجه تنفيذ قضاء كل من ولاه سلطان ذوشوكة وان كان جاهلا فاسقا۔“^۱

ترجمہ: ”لیکن امام غزالی نے فرمایا کہ عدالت و اجتہاد وغیرہ شرطوں کا جامع ہونا مجتہد اور عادل افراد کے فقدان کی وجہ سے دشوار ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ ہر شخص کا فیصلہ نافذ ہوگا جس کو صاحب شوکت بادشاہ نے قاضی مقرر کیا ہو گو وہ فاسق اور غیر مجتہد ہو۔“

بالکل یہی الفاظ مجمع الانہر میں شنی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی سے نقل کئے گئے ہیں۔ قاضی طرابلسی نے قاضی کے علمی درجہ و مقام کی بابت گفتگو کرتے ہوئے زمانہ کے انحطاط کی رعایت کرتے ہوئے لکھا ہے:

”قال بعض الفقهاء وجمهور المقلدين في هذا الزمان لاتجد عنه من آثار الصحابة التابعين كبير شيء وانما مصحفهم مذهب امامهم۔“^۲

ترجمہ: ”بعض فقہاء اور عام مقلدین نے کہا ہے کہ اس میں تم کو صحابہ و تابعین کے عہد کی خوبیاں نہیں مل سکتیں، یہ تو بہت بڑی بات ہے اس زمانہ میں تو ان کے امام کا مذہب ہی گویا ان کے لئے مصحف ہے۔“

یہی مسئلہ شہادت و گواہی کے باب میں پیدا ہوا، قرآن میں گواہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: ”واشهدوا ذوی عدل منکم“ اپنے میں سے دو عادلوں کو گواہ بناؤ۔^۳ اس سے معلوم ہوا کہ صرف عادل ہی گواہ بن سکتے ہیں فاسق گواہ نہیں ہو سکتا، چنانچہ امام ابوحنیفہ، امام محمد اور امام شافعی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے ہے کہ فاسق کی شہادت قبول کرنا درست نہیں ہے۔ البتہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اگر قاضی ”فاسق“ کی شہادت قبول ہی کر لے تو اس کی روشنی میں کیا گیا فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں؟ امام شافعی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں اس کے باوجود اس کی شہادت نادرست اور ناقابل عمل ہے جب کہ امام ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی ایسی صورت میں قاضی کا فیصلہ نافذ تسلیم کرتے ہیں۔ بعد کو خود فقہاء شوافع نے بھی امام صاحب ہی کی رائے پر فتویٰ دیا۔

لیکن امام ابو یوسف رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی (۱۱۳-۱۸۳) مطلقاً فاسق کی شہادت کو ناقابل قبول اور واجب الرد قرار نہیں دیتے، بلکہ فرماتے ہیں:

”ان الفاسق اذا كان وجيها في الناس ذامرة تقبل شهادته لانه لا يتجاسر لو

جاہتہ ویمتنع عن الکذب لمروتہ۔^۱

تَرْجَمَہ: ”فاسق جب لوگوں میں ذی وجاہت اور بامروت ہو تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی اس لئے کہ وہ اپنی وجاہت کی وجہ سے جھوٹ کی جسارت نہیں کرے گا اور اپنی مروت کے باعث جھوٹ سے رک جائے گا۔“

گویا امام یوسف رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے ہاں ”بامروت شخص“ گواہ بن سکتا ہے۔ اس لئے کہ عام طور پر وہ اپنی ظاہری وجاہت اور وقار کی وجہ سے جھوٹ بولنے کی جسارت نہیں کرتا..... پھر رفتہ رفتہ یہی رائے جمہور فقہاء احناف کا مسلک بن گئی۔ بلکہ اس میں مزید نرمی پیدا کی جاتی رہی۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اس طرح بہت سے لوگوں پر انصاف کا دروازہ ہی بند ہو جاتا۔ چنانچہ قاضی طرابلسی لکھتے ہیں:

”اذا کان الرجل یشرب سرا وھو ذو مروۃ فللقاضی ان یقبل شہادۃ“^۲

تَرْجَمَہ: ”جب کوئی شخص چھپ کر شراب پیتا ہو اور وہ بامروت ہو تو قاضی کے لئے جائز ہے کہ اس کی گواہی قبول کر لے۔“

اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۱۲۲۵ھ) فرماتے ہیں:

”بل فی زماننا ھذا الفاسق اذا کان وجیہا ذا مروۃ یغلب علی الظن انہ لا

یکذب فی الشہادۃ اودلت القرائن علی صدقہ تقبل شہادۃ۔“^۳

تَرْجَمَہ: ”بلکہ ہمارے زمانہ میں فاسق اگر وجیہ اور بامروت ہو اور غالب گمان ہو کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دے گا یا قرائن اس کی سچائی پر دلالت کر رہے ہوں تو اس کی گواہی قبول کر لی جائے گی۔“

گواہ عادل اور قابل اعتبار ہے یا نہیں؟ اس کی تحقیق کس طرح کی جائے اس کے لئے امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے تھی کہ خود اسی گواہ سے اس کی بابت استفسار کر لیا جائے اور اس کو کافی سمجھا جائے، امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا عہد چونکہ تابعین کا تھا اور صحابہ کرام کے تربیت یافتہ لوگ موجود تھے۔ اس لئے یہ طریقہ ایک حد تک کافی تھا۔ مگر بعد کو جب فسق و کذب کا غلبہ ہو گیا، فقہاء نے محض اس قدر تحقیق کو کافی نہ سمجھا اور خود امام ابو یوسف و امام محمد رَحِمَہُمَا اللہُ تَعَالٰی نے تزکیہ کا حکم دیا یعنی قاضی اپنے مخصوص اور معتمد کارکنوں کے ذریعہ خفیہ طور پر ان گواہوں کے حالات اور کردار کا تفحص کرے۔ اس طرح جب وہ عادل قرار پائیں۔ تو ان کی گواہی معتبر سمجھی جائے گی۔^۴

^۱ معین الحکام: ص ۱۴۶

^۲ الہدایہ مع فتح القدیر: ۱۱/۶

^۳ الہدایہ: ۱۴۰/۳، ۱۴۱

^۴ تفسیر مظہری: ۳۲۷/۱

لیکن بعد کے ادوار میں کذب اور فسق کا اس قدر غلبہ ہو گیا کہ تزکیہ کے بعد مشکل ہی سے کوئی ”عادل“ آدمی نکل پاتا اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مظلوموں کے لئے عدل کا دروازہ بند ہو جاتا، ان حالات میں فقہاء نے کہا کہ خود گواہوں سے قسم لے لی جائے کہ وہ جھوٹ نہ بولیں گے تاکہ اس کے بعد ان کے سچ بولنے کا غالب گمان ہو جائے:

”وفی زماننا لما تعذرت التزکیة بغلبة الفسق اختار القضاة كما اختار ابن ابی

لیلی استخلاف الشهود بغلبة الظن.“^۱

ترجمہ: ”ہمارے زمانہ میں چونکہ فسق کے غلبہ کی وجہ سے تزکیہ دشوار ہو گیا ہے اس لئے قاضیوں

نے ابن ابی لیلیٰ کی رائے اختیار کر لی ہے کہ غلبہ ظن کے لئے گواہوں سے قسم لے لی جائے۔“

اگر کوئی شخص کسی کا مال غصب کر لے اور کچھ دنوں اس سے فائدہ اٹھا کر پھر مالک کو اس کی چیز واپس کر دے، تو فقہاء احناف کے ہاں ”غاصب“ کو اس منفعت کا تاوان یا اجرت دینی نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ اصول یہ ہے کہ ”تاوان“ اور ”جس چیز کا تاوان دیا جا رہا ہو“ اس میں مماثلت ضروری ہے، یہاں اگر تاوان دلایا جائے تو ظاہر ہے وہ ”قیمت والا مال“ ہوگا۔ جب کہ ”استفادہ“ کوئی ایسی چیز نہیں جس کی قیمت لگائی جاسکے ”اجارہ“ (کرایہ) میں تو محض ضرورت اس کی قیمت لگائی جاتی ہے اور کام کی اجرت متعین کر دی جاتی ہے..... لہذا غاصب کو تاوان نہیں دینا ہوگا۔

اس کا تقاضہ ہے کہ اگر کوئی شخص یتیم کا مال یا وقف کا مال غصب کر لے تو اس صورت میں بھی ”غاصب“ سے تاوان نہیں لیا جائے اور یہی متقدمین کی رائے بھی تھی۔

لیکن چونکہ یتیم کی بے کسی اور وقف کے مال کا کوئی متعین مالک نہ ہونے کی وجہ سے اس کا قوی اندیشہ تھا کہ اس شیوہ کے لوگ ایسی املاک سے فائدہ اٹھانے پر جری ہو جائیں گے، اس لئے بعد کو فقہاء نے یتیموں اور اوقاف کی املاک کے غاصب پر فائدہ اٹھانے کا تاوان بھی لازم قرار دیا۔

”لما نظر المتأخرون طمع الناس بمال الواقف والیتیم فقد جوزوا إستحسانا

تضمین الغاصب منافع مالهما وقایة لصوالحهما.“^۲

ترجمہ: ”جب متاخرین نے وقف اور یتیموں کے مال میں لوگوں کی حرص دیکھی تو استحساناً اس بات

کو جائز قرار دیا کہ غاصب سے ان دونوں کے مال سے نفع اٹھانے کا تاوان وصول کیا جائے تاکہ ان

کے مصالح کی حفاظت کی جائے۔“

امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۱۵۰-۲۰۴) کا خیال ہے کہ قاضی کے لئے ”مجتہد“ ہونا ضروری ہے۔ یعنی وہ براہ راست کتاب و سنت کے معانی، الفاظ اور رجال حدیث پر گہری نظر رکھتا ہو، قیاس کے اصول سے پوری طرح واقف ہو اور اس کی صلاحیت رکھتا ہو کہ اگر کسی ایسی صورت سے سابقہ پیش آئے، جس کا نصوص میں ذکر نہیں ہے۔ تو اپنی مجتہدانہ بصیرت سے اس کا صحیح حل تلاش کر سکتا ہو، اس لئے کہ:

”النصوص معدودة والحوادث ممدودة۔“^۱

ترجمہ: ”نصوص چند ہیں اور حوادث بے شمار۔“

لیکن چوتھی صدی ہجری کے بعد جب دین کو خواہشات نفس اور سہولت پسندی کے سیلاب سے بچانے کے لئے خود فقہاء نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا اور شاہ ولی اللہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۱۱۷۶) نے تو تقلید میں غلو پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ قضاۃ اپنے اجتہادات کے نام پر جو رونا نصابی اور جانبداری کی راہ اختیار کرنے لگے تھے۔^۲

ان حالات میں ظاہر ہے کہ قاضی کے مجتہد ہونے کا سوال ہی کیا رہ جاتا ہے؟ چنانچہ امام ابو حامد الغزالی (۴۰۵) نے کہا کہ بادشاہ اگر کسی جاہل کو قاضی مقرر کر دے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔^۳

بلکہ اخلاقی حالات کے تغیر سے حکم میں تبدیلی کا ثبوت نہ صرف یہ کہ بعد کے ادوار میں ملتا ہے، بلکہ عہد اول میں بھی ملتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ کے حالات دیکھتے ہوئے فرمایا کہ اب ”ہدیہ“ رشوت کے حکم میں ہے۔

مدت اجارہ کی عام حالات میں کوئی تحدید نہیں ہے۔ لیکن بہت سے لوگ تھے جو اوقاف کی زمینوں اور عمارات کو کرایہ پر لے کر واپس کرنے کا نام نہ لیتے تھے اور کرایہ کا نرخ اتنا معمولی رکھتے تھے کہ وہ غیر مؤثر ہو کر رہ جاتا تھا، متاخرین نے یہ صورت حال دیکھ کر قید لگا دی کہ اوقاف اور یتامی کے مکانات و دوکانات کی زیادہ سے زیادہ مدت کرایہ داری ایک سال اور زرعی زمینوں اور باغات کی کرایہ داری کی زیادہ سے زیادہ مدت تین سال ہوگی تاکہ اس طرح کی نا انصافیوں کا سد باب ہو سکے۔^۴

سیاسی حالات کا فرق

کتب فقہ میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق قوانین کا جو گراں قدر ذخیرہ جمع ہے ان میں بعض مسائل

^۱ حافظ ابن رشد: بدایۃ المجتہد الباب الثانی معرفۃ ما یقضی بہ

^۲ حجة اللہ البالغہ: ۳۶۰/۱

^۳ شمس الانامہ سرخسی: المبسوط: ۶۲/۱۶

^۴ اصول الفقہ لابی زہرہ: ص ۲۱۸

^۵ ابن ہمام: فتح القدیر: ۵/۵۴

ایسے بھی ہیں جن میں اس زمانہ کے مخصوص سیاسی حالات اور مسلمانوں یا اسلام کے اقتدار کو ملحوظ رکھ کر فتاویٰ دیئے گئے ہیں۔ دارالاسلام کی مخصوص ہیئت میں ہی ان کو جگہ مل سکتی ہے اور اقتدار اعلیٰ سے محرومی کے بعد بڑی حد تک وہ ناقابل عمل رہ جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں خود فقہاء متقدمین کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مسائل میں بدلتے ہوئے حالات میں شریعت کے بنیادی مصالح، اسلام کے تشریحی مقاصد اور اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے..... ایسی قابل عمل صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں جو فقہ اسلامی کے مجموعی مزاج اور دین کی روح سے ہم آہنگ ہوں۔ مثلاً امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے یہاں بالاتفاق کسی بھی ایسی طاعت یا عبادت پر اجرت درست نہیں جس کا تعلق خالصتہً مسلمانوں کے فرائض سے ہو۔ چنانچہ ان کی رائے تھی کہ:

”لا يجوز الاستیجار علی الاذان والاقامة وتعليم القرآن والحج والفقہ.“^۱

ترجمہ: ”اذان، اقامت، تعلیم القرآن، حج اور تعلیم فقہ پر اجرت لینا جائز نہیں۔“

اور اس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو شخص اس نیت سے قرآن پڑھے گا کہ اس کے ذریعہ لوگوں سے کھائے گا، تو وہ قیامت کے دن اس حال میں ہوگا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا۔“ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری عہد میں حضرت عثمان ابن ابی العاص کو اس کی نصیحت فرمائی کہ اگر تم مؤذن بنائے جاؤ تو اذان دینے کی اجرت نہ لینا۔^۲

لیکن بعد کے دور میں جب حالات بدل گئے، قرآن کی تعلیم دینے والے معلمین کو بیت المال سے جو ”کفاف“ ملتا تھا وہ بند ہو گیا اور اپنی معاش کے لئے تعلیم القرآن چھوڑ کر دوسرے دروازے کھٹکھٹانے پر مجبور ہو گئے تو فقہاء نے تعلیم القرآن پر اجرت لینے کو مباح قرار دیا، اس لئے کہ:

”لو لم یصح الاستیجار واخذ الاجرة لصاع القرآن وفيه ضیاع الدین.“^۳

ترجمہ: ”اگر اجرت پر رکھنا اور اجرت لینا جائز نہ ہو تو قرآن ضائع ہو جائے اور اس میں دین کا ضیاع ہے۔“

برہان الدین مرغینانی رحمہم اللہ تعالیٰ (۵۹۳ھ) اپنے زمانہ کے بعض مشائخ کی رائے نقل کرتے ہیں:

”وبعض مشائخنا استحسنوا الاستیجار علی تعلیم القرآن الیوم لانه ظهر

^۱ ھدایہ: ۳۸۷/۳ ^۲ بیہقی فی شعب الایمان بحوالہ مشکوٰۃ: ۱۹۴/۱ باب فضائل القرآن

^۳ ابن عابدین شامی۔ شرح رسم المفتی: ص ۳۸ ^۴ ھدایہ: ۳۸۷/۳

التوانی فی الامور الدینیۃ۔“ ۱

ترجمہ: ”اور ہمارے بعض مشائخ نے اس زمانہ میں تعلیم قرآن کے لئے اجرت پر رکھنے کو مستحسن قرار دیا ہے اس لئے کہ دینی امور میں سستی پیدا ہوگئی ہے۔“

پھر بعد کو امامت، اذان اور تعلیم فقہ پر بھی فقہاء نے اسی مصلحت کے پیش نظر اجرت لینے کی اجازت دے دی، چنانچہ تنویر الابصار، درمختار، مفتی اور درر وغیرہ میں اسی قول کو ”مفتی بہ“ بتایا گیا ہے۔ اور متاخرین نے لکھا ہے کہ ہم اس کے جواز کا فتویٰ اس لئے دے رہے ہیں کہ اگر اس دور میں امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی ہوتے تو وہ بھی یہی بات کہتے:

”ان ابا حنیفۃ واصحابہ لو کانوا فی عصرہم لقالوا بذالک ورجعوا عن قولہم الاول۔“ ۲

ترجمہ: ”امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اور ان کے ساتھی اگر اس زمانہ میں ہوتے تو یہی بات کہتے اور اپنے پہلے قول سے رجوع کر لیتے۔“

اگر کسی کا شوہر لاپتہ ہو جائے اور نان و نفقہ چھوڑ کر نہ جائے یا رہے لیکن اپنی تنگدستی اور عسرت کی وجہ سے بیوی کا نفقہ ادا نہ کر سکے یا ظلم اس کو نان و نفقہ کی تکلیف دے۔ ان تمام صورتوں میں فقہ حنفی کی رو سے قاضی نفقہ کی عدم ادائیگی کی وجہ سے اس کا نکاح فسخ نہیں کرے گا اور اس کو دوسری شادی کا مجاز نہیں گردانے گا بلکہ ان حالات میں فقہاء احناف کے نزدیک عورت مرد کے نام پر قرض لیتی اور خرچ کرتی رہے گی۔

”العجز عن الانفاق لا یوجب الفراق۔“ ۳

ترجمہ: ”نفقہ دینے سے عاجز ہونا علیحدگی کا سبب نہیں بنتا۔“

مالکیہ اور بعض دیگر فقہاء کی رائے ہے کہ ان حالات میں بھی قاضی نکاح فسخ کر دے گا۔ اور اس طرح عورت کے لئے یہ راہ ہمارا ہو جائے گی کہ وہ کوئی دوسرا رشتہ تلاش کر لے۔ ۴

حنفیہ کی یہ رائے دراصل ”دارالاسلام“ کی مخصوص ہیئت کے پیش نظر تھی وہاں اسلامی ”بیت المال“ کے ذریعہ اس طرح متوقع ادائیگی پر قرض لیا جانا ممکن تھا پھر یہ کہ اگر وہ دوسروں سے قرض لیتی تو بھی ایسے مقروض کے لئے بیت المال کی طرف سے مدد ہوتی تھی اور وہ صدقات واجبہ کے مستحق قرار پاتے تھے، لیکن بعد کو چل کر جب حالات بدل گئے۔ مسلمانوں کے زیر اقتدار علاقہ کا ایک بڑا حصہ ”دارالکفر“ بن گیا یا جن ممالک پر

۱ شرح رسم المفتی: ص ۳۸

۲ ہدایہ: ۳/۳۰۳

۳ الفقہ علی المذاهب الاربعہ: ۴/۵۸۰

۴ مجمع الانہر: ۱/۹۸۸

مسلمانوں کو غلبہ حاصل تھا وہاں بھی اسلامی نظام باقی نہیں رہا اور ایسے محروموں کے لئے اعانت کا دروازہ بند ہو گیا تو ظاہر ہے ان حالات میں بھی اگر ایک عورت کو اسی طرح معلق رکھا جائے کہ وہ فاقہ سے رہے، بھوکوں مرے اور اس سردی ظالمانہ قید سے نکلے بھی نہیں تو یہ اس پر سراسر ظلم اور تعدی ہوگی۔

چنانچہ فقہاء احناف نے بھی ضرورت اس کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ حنفی قاضی کسی شافعی کو اپنا نائب مقرر کرے اور وہ ان معاملات میں اپنے مسلک کے مطابق نکاح فسخ کر دے۔ مگر ہر جگہ ایسے شافعی المسلک کا ملنا دشوار تھا اس لئے ایک جلیل القدر فقیہ ابو حفص استروشی نے یہ راہ نکالی کہ حنفی مجتہد قاضی اگر اس بناء پر فسخ نکاح کو درست سمجھتا ہو تو خود ہی زوجین میں تفریق کر دے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حل پہلے حل سے زیادہ دشوار ہے، شافعی قاضی کی تلاش، مجتہد قاضی کی تلاش سے زیادہ آسان ہے۔ اس لئے مولانا عبدالصمد رحمانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں حنفی قاضی مالکی مسلک پر عمل کرتے ہوئے خود ہی نکاح فسخ کر دے گا۔ اور اسی پر ”دارالقضاء امارت شرعیہ بہار واڑیسہ پھلواری شریف، پٹنہ“ کا عمل ہے۔

اسی طرح شرعاً ”قضاء“ کا منصب عوامی انتخاب کا نہیں ہے بلکہ عامۃ المسلمین اپنے لئے امیر و والی کا انتخاب کریں گے اور ”امیر“ قاضی نامزد کرے گا۔ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں یہی طریقہ رہا اور قاضی کے نصب و عزل کا حق ہمیشہ سربراہ مملکت کو دیا گیا۔ لیکن بعد کو چل کر جب اندلس میں مسلمانوں کو شکست ہو گئی اور اسلامی حکومت باقی نہیں رہی نیز دوسری طرف چونکہ غیر مسلم ”حجز“ کے فیصلے شرعاً نافذ نہیں ہوتے اس لئے ”مسلم قاضی“ کی ناگزیر ضرورت اور مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار نکل جانے میں مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے منتخب ہونے والا قاضی ہی شرعاً ”قاضی“ قرار پائے گا۔ ”و یصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین“۔ فقہاء کی آراء و فتاویٰ میں یہ تبدیلیاں دراصل دارالاسلام اور دارالحرب کی سیاسی صورت حال کے اختلاف اور نزاکتوں میں پیدا ہونے والے مسائل سے تھیں جن کے معاملہ میں سلف صالحین کے یہاں ذرا بھی تساہل اور جمود نہ تھا۔

عرف و تعامل

احکام شرعیہ کا بڑا حصہ جو منصوص نہیں ہے۔ اپنے زمانہ کے عرف و عادت پر مبنی ہے۔ عرف یعنی مسلمانوں کا عام تعامل اور طرز عمل فقہ اسلامی کا ایک مستقل ماخذ ہے۔ جس کی تبدیلی سے احکام بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ایک خاص: مانہ یا ایک خاص علاقہ کے عرف کو پیش نظر رکھ کر جو احکام دیئے گئے ہوں وہ اس زمانہ اور جگہ کی

۱۔ شرح وقایہ: ۱۷۴، ۱۷۵/۲ ۲۔ عمدة الرعاہ علی شرح الوقایہ للعلامہ عبدالحنی لکھنوی: ۱۷۴/۲

۳۔ کتاب الفسخ والتفریق: ص ۵۸ ۴۔ طحطاوی: ۳۳۹/۱۔ البحر الرائق: ۲۹۸/۲

تبدیلی کے بعد آپ سے آپ بدل جائیں گے۔ علامہ قرافی مالکی (۶۸۴م) لکھتے ہیں:

”ان کل ماہو فی الشریعة یتبع العوائد یتغیر الحکم فیہ عند تغیر العادة الی ما تقتضیہ العادة المتجددة.“^۱

ترجمہ: ”شریعت کے جواہکام عرف و عادت کے تابع ہیں اس میں عرف بدل جائے گا تو نئے عرف کے تقاضوں کے مطابق احکام بھی بدل جائیں گے۔“

مثلاً فقہاء نے نکاح کے باب میں کفائت یعنی زوجین کی ہمسری اور کفائت کا بھی اعتبار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں اس معاملہ میں پیشہ اور صنعت و حرفت میں بھی ہمسری معتبر ہے۔ یعنی عرف میں جس پیشہ کو ذلیل اور کم تر سمجھا جاتا ہے اس کو اختیار کرنے والے ان لوگوں کے ہمسر نہیں ہو سکتے، جن کے پیشہ کو عرف میں معزز تصور کیا جاتا ہو، لہذا جلاہا، چمار اور اس قسم کے پس ماندہ تصور کئے جانے والے پیشہ ور، تجار اور مدرسین وغیرہ کے کفو نہیں ہو سکتے۔ لہذا اگر اس طرح کے اونچے پیشہ کے گھر کی کسی بالغ لڑکی نے کسی پسماندہ پیشہ ور سے شادی کر لی تو لڑکی کے ولی کو حق حاصل ہوگا کہ وہ قاضی سے اس نکاح کو کالعدم قرار دینے کی درخواست کرے..... لیکن امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے شاگرد امام ابو یوسف رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے صنعت و حرفت میں کفائت کو تسلیم نہیں کیا۔

مشہور حنفی فقیہ علاء الدین الکاسانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ عرف کی تبدیلی ہے۔ امام ابو یوسف رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی جب قاضی بنے، اس وقت سماج سے پیشہ کی بنیاد پر امتیاز و تفریق کا مزاج ختم یا کم ہو چکا تھا۔^۲

امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے شہد کی مکھوں اور ریشمی کیڑوں کی خرید و فروخت کو دوسرے حشرات الارض کی طرح منع کیا ہے اور اس کو مال تسلیم نہیں کیا ہے۔ مگر امام محمد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے لوگوں کے عرف و استعمال کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی خرید و فروخت کی اجازت دی ہے۔^۳

عورت (جس کی شوہر کے ساتھ یکجائی رہتی ہو) مدعی ہو کہ شوہر نے مہر کا کوئی بھی حصہ اسے ادا نہیں کیا ہے اور شوہر کہتا ہو کہ اس نے مہر ادا کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں عام اصول یہ ہے کہ شوہر کو ثبوت پیش کرنا چاہئے اور بغیر اس کے اس کا دعویٰ معتبر نہ ہونا چاہئے، مگر چونکہ فقہاء متاخرین کے عہد میں عرف یہ تھا کہ جب تک مہر کا مکمل حصہ ادا نہ کر دیتا عورت شوہر کے حوالہ نہ ہوتی، اس لئے اس زمانہ کے فقہاء نے بدلے ہوئے عرف کے

^۱ شہاب الدین ابوالعباس احمد بن ادريس قرافی مصری: الاحکام فی تمیز الفتاویٰ من الاحکام: ص ۶۷، ۶۸

^۲ ہدایہ: ۳/۳۸

^۳ علاء الدین الکاسانی: بدائع الصنائع: ۲/۳۲۰

پیش نظر فتویٰ دیا تھا کہ چونکہ بیوی کا دعویٰ خلاف ظاہر ہے۔ اس لئے قابل قبول نہ ہوگا۔^۱

نئے وسائل

بعض مسائل ایسے ہیں جن کی صورت فقہاء متقدمین نے اپنے عہد کے اسباب و وسائل کو پیش نظر رکھ کر متعین کی تھیں اور اس وقت تک کے ممکنہ وسائل کے اعتبار سے وہ مناسب بھی تھیں اور ضروری بھی۔ لیکن آج کے نئے وسائل، نئی دریافتوں اور نئے نظام کے تحت اب وہ دور از کار اور غیر ضروری ہو گئی ہیں اور ان سے سہل تر اور جلد تر ذرائع کے ذریعہ وہ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

مثلاً ”کتاب القاضی الی القاضی“ کا مشہور فقہی مسئلہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ایک قاضی دوسرے قاضی کے پاس مقدمہ کے کاغذات بھیجے تو وہ دو آدمیوں کے سامنے ان کاغذات کو ملفوف کرے۔ پھر اس پر اپنی مہر لگائے اور وہ دونوں اسے ساتھ لے کر جائیں یہاں تک کہ راستہ میں دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہوں، پھر یہ کاغذ دوسرے قاضی صاحب کے سامنے جا کر پیش کریں، وہ اسے ان دونوں کے سامنے کھولے اور یہ دونوں گواہی دیں کہ یہ کاغذات وہی ہیں، تب کہیں اس کا اعتبار ہوگا..... یہ طویل العمل طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا کہ دو آدمیوں کی متفقہ گواہی اور شروع سے اخیر تک دونوں کی یکجائی، نیز قاضی کی مہر، ان سب سے اس بات کا غالب گمان ہو جاتا ہے کہ یہ مکتوب قاضی ہی کا ہے کسی اور کا نہیں ہے۔

اس دور کے اعتبار سے یہ طریقہ قطعی مناسب اور ضروری تھا۔ اس لئے کہ اس کے سوا ڈاک کا کوئی دوسرا قابل اطمینان نظم بھی نہیں تھا اور نہ دوسری ایسی ایجادات تھیں کہ ان کے ذریعہ مکتوب الیہ سے براہ راست گفتگو کر کے اطمینان کر لیا جائے۔

بعد کے دور میں فقہاء نے اس طریقہ کار کی دشواری کو مد نظر رکھتے ہوئے بعض امور میں تخفیف بھی کی مثلاً امام ابو یوسف رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا معمول تھا کہ گواہوں کی بجائے خود مدعی کے ذریعہ کاغذات بھیج دیتے تھے۔ انہوں نے مہر لگانے کو بھی ضروری قرار نہیں دیا تھا۔ مشہور فقیہ شمس الائمہ سرخسی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے اور ترجیح دی ہے۔^۲

لیکن عصر حاضر میں ڈاک کا ایسا نظام رو بہ عمل آیا ہے کہ عام حالات میں ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور ان کے ذریعہ امانت بعینہ امین تک پہنچ سکتی ہے۔ نیز ایک طویل ترین فاصلہ پر رہنے کے باوجود کسی خاص موقع پر مکتوب نویس مکتوب الیہ سے فون وغیرہ کے ذریعہ براہ راست گفتگو کر سکتا ہے۔ ان حالات میں اس طریقہ پر

^۱ دیکھئے عالمگیری: ۳۸۴/۳

^۲ عالمگیری: ۳۸۴/۳

^۳ رد المحتار: ۳۶۳/۳

اصرار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

بیع میں بیع یعنی فروخت کی جانے والی چیز کا متعین اور ممتاز ہو جانا ضروری ہے اس کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ بیع مال منقول ہو یا غیر منقول، اس اصول کے تحت اراضی کی فروختگی کے لئے بھی زمین کی پیمائش اس کی تعین اور تحدید اور وہاں حاضر ہو کر خریدار کے حوالے کر دینا فقہاء نے ضروری قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں جب تک فریقین حاضر ہو کر بالمشافہ بتلا نہ دیں کہ یہ زمین بیچ رہا ہوں، زمین متعین ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن آج سروے کے ذریعہ زمین کے جو نمبرات متعین کئے جاتے ہیں، اس کے تحت ”نمبر“ بتا دینے ہی سے زمین متعین ہو جاتی ہے ظاہر ہے ان حالات میں محض پلاٹ اور سروے نمبر وغیرہ بتلا دینا ہی بیع کے لئے کافی ہوگا۔

فقہاء کے یہاں جنون و دیوانگی یا عورت کی بکارت باقی رہنے اور نہ رہنے یا نامردی کی جو علامات ذکر کی گئی ہیں وہ بھی اسی قبیل کے مسائل ہیں جن میں سلف نے اپنے زمانہ کے مسائل تحقیق کے مطابق اپنی رائے دی ہے۔ اب جب کہ ان چیزوں کی واقفیت کے لئے زیادہ ترقی یافتہ میڈیکل ذرائع مہیا ہو گئے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس قسم کے مسائل بذات خود مقصود نہیں ہوتے، بلکہ اپنے زمانے کا زیادہ سے زیادہ بہتر ذریعہ ہوتے ہیں، جو بدلتے رہتے ہیں، اس لئے نئے مسائل سے استفادہ میں قباحت نہیں، پھر اشیاء میں اصل اباحت ہے، اس لئے ہر نئی چیز اگر صریحا ”مناط نہی“ سے خالی ہو تو جائز ہوگی۔ خود فقہاء متقدمین کے یہاں بھی اس کی نظیر ملتی ہے۔ بہت سے مسائل میں فقہاء کا ”طیب حاذق“ کی رائے کو فیصلہ کن ماننا اس کا واضح ثبوت ہے۔

کلمہ آخری

غرض فقہ اسلامی ایک ایسا نظام قانون ہے جو ہر عہد اور ہر سماج میں اپنی افادیت اور رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف اس نے انسانی زندگی کے تمام گوشوں کی بابت کچھ ایسے بنیادی اصول اور حدود کی رہنمائی کی ہے، جن میں قانون فطرت سے پوری مطابقت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور جو ناقابل تبدیل ہیں، اور ایسا ہونا بھی ضروری ہے کیوں کہ جہاں کسی قانون کے لئے جمود ایک عیب ہے وہیں ثبات و دوام سے محرومی بھی کچھ کم عیب نہیں۔

دوسری طرف فقہ اسلامی کا ایک قابل لحاظ حصہ وہ ہے جو بالکل بے پچ نہیں بلکہ احوال زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے مناسب تغیر کو قبول کرتا ہے کہ کسی قانون کے متضاد سماجی، اخلاقی اور معاشی حالات میں مؤثر ہونے کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس میں ایک گونہ پچ پائی جاتی ہو، البتہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل پر انفرادی طور

پر غور کرنے کے بجائے اجتماعی غور و فکر اور تبادلہ خیال کا راستہ اختیار کیا جائے، جیسا کہ حضرت عمر اور امام ابو حنیفہ رَحِمَہُمَا اللہُ تَعَالٰی نے اختیار فرمایا۔ یہ اجتماعی غور و فکر افراد و اشخاص کے اندر پائی جانے والی علمی اور فکری کوتاہی کی تلافی کا باعث ہوگی، اور اس سے اہل ہوئی و ہوس کی طرف سے جو اندیشے ہو سکتے ہیں، ان کا سد باب بھی ہو سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے ایسے مسائل میں شورائی اجتہاد اور اجتماعی غور و فکر کی تلقین فرمائی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُما سے مروی ہے:

”قلت یا رسول اللہ أرأیت إن عرض لنا أمر لم ينزل فیہ قرآن ولم تمض فیہ سنة منك قال: تجعلونه شوری بین العابدین المؤمنین ولا تقضونه برأی خاصة.“^۱

ترجمہ: ”میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اگر کوئی ایسا معاملہ میرے سامنے آئے، جس کے بارے میں کوئی حکم نہ قرآن میں نازل ہوا ہو اور نہ آپ ﷺ کی سنت میں موجود ہو تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ تم اسے عبادت گزار مومنوں کے مشورے سے طے کرو اور تنہا کوئی فیصلہ نہ کرو۔“

نیز حضرت علی رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے:

”قلت یا رسول اللہ ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان أمر ولا نہی فما تأمرنی قال شاوروا فیہ الفقہاء والعابدین ولا تمضوا فیہ رأی خاصة.“^۲

ترجمہ: ”میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جس کے بارے میں نہ کوئی حکم موجود ہو اور نہ ممانعت، تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرو اور تنہا فیصلہ نہ کرو۔“

بحمد اللہ ہندوستان کے علماء کبھی بھی اس حقیقت سے غافل نہیں رہے۔ گزشتہ صدی میں اس سلسلہ میں مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُمَا اللہُ تَعَالٰی کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ جنہوں نے ہندوستان کے موجودہ حالات کے پس منظر میں ”فتح نکاح“ کے مسائل پر علماء کو غور و فکر کی دعوت دی۔ اور ان کی اجتماعی رائے پر فیصلہ کیا۔ جو الحیلۃ الناجزۃ للحیلۃ العاجزۃ کی صورت میں موجود ہے۔ مولانا محمد میاں صاحب مرحوم نے اسی مقصد کے تحت ”ادارۃ المباحث الفقہیہ“ کو قائم فرمایا۔ لیکن یہ ادارہ بوجہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ اور مولانا مرحوم

کی وفات کے ساتھ ہی گویا اس کا وجود بھی ختم ہو گیا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء نے بھی اسی مقصد کے تحت ”مجلس تحقیقات شرعیہ“ قائم کی، جس نے دو تین مسئلوں پر محدود تعداد میں اہل علم کو جمع کیا اور ان پر بحث کی۔

اللہ کا شکر ہے کہ یکم اپریل ۱۹۸۹ء میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی بنیاد پڑی، اور اس نے وسیع تر سطح پر علماء و ارباب افتاء اور علوم جدیدہ کے ماہرین کا اجتماع منعقد کیا تا کہ ماہرین تصویر مسئلہ کریں اور علماء و ارباب افتاء ان پر احکام شرعیہ کو منطبق کریں۔ بحمد اللہ اب تک اکیڈمی نے مختلف معاشی، طبی، عباداتی، معاشرتی اور اصولی مسائل پر گیارہ نہایت کامیاب سمینار منعقد کئے ہیں۔ جن میں نہ صرف ہندوستان کے طول و عرض سے مستند، معروف اور محقق علماء نے شرکت کی ہے بلکہ بیرون ملک سے بھی موقر اہل علم نے اپنے ورود سے اس کو رونق بخشی ہے اور علماء ہند کی اس اجتماعی کاوش کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ادھر جمعیت علماء ہند نے بھی ”ادارۃ المباحث الفقہیہ“ کا احیاء کیا ہے اور کئی اہم موضوع پر علماء دیوبند کا کامیاب اور نتیجہ خیز اجتماع منعقد کیا ہے، یہ خیر کا تعدد ہے اور یقیناً اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے..... عالم عرب کو بہر حال شرف سبقت حاصل ہے، رابطہ عالم اسلامی کے تحت بھی اور اس سے الگ بھی ”مجمع الفقہ الاسلامی“ وہاں عرصہ سے قائم ہے، جس نے سینکڑوں مسائل پر عالم اسلام اور پوری دنیا کو ممتاز علماء و فقہاء کے اجتماعی غور و فکر کی روشنی میں مسائل کا حل پیش کیا ہے فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

اس وقت جدید مسائل کے حل کے لئے یہی بہتر اور قابل عمل صورت ہے اور اسی طرح ہم نئے مسائل پر شریعت کی تطبیق کا اہم ترین فریضہ انجام دے سکتے ہیں اور ان کا حل پیش کر کے اسلام کی ابدیت اور اس کے دوام کو ثابت کر سکتے ہیں۔

وباللہ التوفیق وهو المستعان



عبادات

پاکی و ناپاکی

مغربی طرز کے پیشاب خانے اور بیت الخلاء

آج کل کچھ اس نوعیت کے پیشاب خانے بن رہے ہیں، جن میں بہر حال آدمی کو کھڑے ہو کر ہی پیشاب کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال بیت الخلاء کا ہے۔ اس کی ہیئت ایسی ہوتی ہے کہ کرسیوں پر بیٹھنے کی طرح آدمی بیٹھے اور اپنی ضرورت کی تکمیل کرے۔

رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔^۱ اسی طرح اس انداز سے بیٹھ کر پانخانہ کرنا آپ ﷺ کے اور سلف کے طریقہ کے خلاف ہے۔ حضرت سراقہ بن مالک سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح قضاء حاجت کے لئے کہا ہے کہ کسی قدر بائیں پاؤں پر سہارا لے کر بیٹھا جائے، ”علمنا رسول اللہ اذا اتینا الخلاء ان نتوکأ علی اليسری۔“^۲ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ صورتیں مسنون طریقہ کے خلاف ہیں، بالخصوص پیشاب خانہ کی مذکورہ وضع کیونکہ بلا عذر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کو فقہاء نے مکروہ قرار دیا ہے:

”ویکرہ ان یبول قائما..... من غیر عذر فان کان بعذر فلا بأس به۔“^۳ ترجمہ: ”کھڑے ہو کر پیشاب کرنا مکروہ ہے، ہاں عذر کی بناء پر کھڑے ہو کر بھی پیشاب کرنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ حدیث سے ثابت ہے کہ جہاں بیٹھ کر پیشاب کرنے میں ملوث ہونے اور چھینٹیں پڑنے کا اندیشہ تھا وہاں خود آپ ﷺ نے بھی کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا ہے۔“^۴ یہ تو ایک قانونی اور فقہی بحث تھی۔ مگر اس کا گہرا تعلق ہمارے دینی سانچے سے ہے۔ مغربی تہذیب سے ہم کچھ اس قدر مرعوب ہو چکے ہیں کہ وہاں سے جو کچھ آئے، خواہ وہ بد تہذیبی اور ناشائستگی میں کسی بھی درجہ کی

^۱ ترمذی عن عائشہ وعمر: باب النهی عن البول قائما۔^۲ التلخیص الحبیر علی الرافعی مع المجموع: ۴۷۱/۱

^۳ الفتاویٰ الہندیہ: ۵۰/۱ رد المحتار: ۳۱/۱۔^۴ ابوداؤد عن حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ باب البول قائما

بات ہو اور کتنی بھی غیر انسانی ہو، ہم اسے ایک نعمتِ غیر مترقبہ اور ”گہر نایاب“ سمجھ کر اپنی معاشرت میں جگہ دے دیتے ہیں۔ یہ بھی اسی کا ایک نمونہ ہے۔ طبی اور طبعی ہر دو لحاظ سے پیشاب و پاخانے سے فراغت کے لئے جس ہیئت میں بیٹھنا ہمارے یہاں رائج ہے وہ زیادہ مناسب اور فطری ہے۔

کاغذ سے استنجاء

بڑے شہروں میں کاغذ کا استنجاء کے لئے استعمال بڑھتا جا رہا ہے..... علماء نے اصولاً اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ کاغذ ایک گراں قدر چیز ہے جو علوم و فنون کی امین اور خود اسلام اور اس کی تعلیمات کے لئے بلند پایہ محافظ ہے، اس کی اس عظمت اور اہمیت کا تقاضہ ہے کہ ایسے معمولی اور کمتر کاموں کے لئے اس کا استعمال نہ ہو اور اس کو نجاستوں میں ملوث ہونے سے بچایا جائے، اس لئے فقہاء نے اسے مکروہ لکھا ہے۔ البتہ مجبوری کی حالت اس سے مستثنیٰ ہے۔ علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اس کی کراہت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

”لصفالته وتقومه وله احترام ايضا لكونه آلة لكتابة العلم.“^۱

ترجمہ: اس لئے کہ وہ چکنا ہوتا ہے (جس سے نجاست کے پھیل جانے کا اندیشہ ہے) اور قیمتی ہوتا ہے، نیز علم کی تحریر کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے قابلِ احترام بھی ہے۔

اس کی تائید ان فقہاء کے اقوال سے بھی ہوتی ہے جو مطلق کاغذ کے اس مقصد کے لئے استعمال کو مکروہ نہیں کہتے بلکہ ایسے کاغذ کے استعمال سے منع کرتے ہیں جس میں حدیث و فقہ سے متعلق کچھ لکھا ہوا ہو، مشہور فقیہ ابن قدامہ کا بیان ہے:

”ولا يجوز الاستنجاء بماله حرمة كشيء كتب فيه فقه او حديث.“^۲

ترجمہ: قابلِ احترام چیزوں مثلاً ایسی چیز کہ جس میں فقہ اور حدیث کی عبارتیں درج ہوں، سے استنجاء کرنا جائز نہیں۔

اور علامہ رافعی لکھتے ہیں:

”ومن الاشياء المحرمة ما كتب عليه شيء من العلم كالحدیث والفقه.“^۳
ترجمہ: ”حرام اشیاء استنجاء میں سے ایسی چیزیں بھی ہیں جن پر حدیث اور فقہ جیسی علم کی باتیں لکھی ہوں۔“

یہ نہ صرف فقہاء اسلام کا نظریہ ہے بلکہ عقل و دانش کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ ایک انسان کوناک

صاف کرنی ہو تو وہ کرتہ کے دامن کو اس کے لئے استعمال نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ اس کی نگاہ میں ان چیزوں کی عظمت ہے اور وہ دراصل اس کی شخصیت کا مظہر ہے۔ اسی طرح کاغذ علوم انسانی کے لئے پیرہن اور اس کے لئے نشانِ عظمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا یہ احترام ہونا ہی چاہئے..... ہاں ایسے کاغذ جو خاص اسی مقصد کے لئے تیار کئے جاتے ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان پر لکھا جائے ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

پٹرول سے کپڑے کی دھلائی

پٹرول کے جہاں اور بہت سے فوائد ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے زمانے میں اس کا استعمال کپڑوں کی دھلائی اور صفائی وغیرہ کے لئے کیا جاتا ہے طہارت کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ نجاست دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تو وہ غیر محسوس ناپاکی جسے ہم نہ دیکھ سکتے ہیں نہ محسوس کر سکتے ہیں لیکن چونکہ شریعت اس کو ناپاکی قرار دیتی ہے اس لئے ہم ناپاک باور کرتے ہیں۔ مثلاً نواقض وضو پیش آ جانے کی وجہ سے پورے جسم کا ناپاک ہو جانا، اس کو نجاست حکمی اور حدث و جنابت بھی کہا جاتا ہے۔ ایسی ناپاکی کو دور کرنے کے لئے پانی کا استعمال یا تیمم ضروری ہے۔ پانی کے بجائے اگر کوئی دوسری سیال چیز مثلاً پھلوں کے رس وغیرہ کا استعمال کیا جائے تو کافی نہ ہوگا۔^۱

دوسری قسم کی نجاستیں وہ ہیں جو محسوس کی جاسکتی ہیں، مثلاً پیشاب، پاخانہ وغیرہ۔ ان کے ازالہ کے لئے ہر پاک سیال چیز جو نجاست کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو کافی ہے:

”ويجوز تطهيرها بالماء وبكل مائع طاهر يمكن ازالته به كالخل وماء الورد“^۲

ترجمہ: ”پانی اور ہر وہ چیز جس سے ناپاکی دور کی جاسکتی ہو اس سے نجات دور کرنا جائز ہے جیسے سرکہ یا عرق گلاب۔“

اس اصول سے یہ بات واضح ہوگئی کہ پٹرول سے غسل یا وضو تو ہرگز درست نہیں لیکن کپڑے وغیرہ کا دھونا یا کسی بھی محسوس نجاست کا اس کے ذریعہ ازالہ درست ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے لئے پانی ضروری نہیں، ہر بہتی ہوئی چیز کافی ہے۔

ناخن پالش

ناخن جسم کے ان حصوں میں سے ہے جسے وضو کرتے وقت دھونا ضروری ہے اور اعضاء وضو پر کسی ”واقعی ضرورت“ کے بغیر ایسی چیز لگانا جو پانی کو جسم تک پہنچنے نہ دے وضو کے درست ہونے میں رکاوٹ ہے۔ وضو اسی

^۱ لايجوز الوضوء بماء الفواكه ولا بما اعتصر عن الشجر، خلاصة الفتاوى: ۹/۱ ۲ الهدایہ: ۵۴/۱ باب الانجاس

وقت صحیح ہوگا جب اس کو کھرچ دیا جائے..... اس قسم کے پیٹ جو خواتین لگایا کرتی ہیں ضرورت نہیں ہیں، محض ”زینت“ ہیں۔ اس لئے وضو کرتے وقت ضروری ہوگا کہ ان کو کھرچ کر تہہ تک پانی پہنچایا جائے۔ جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ:

”اولزق باصل ظفره طین یا بس اور طب لم یجز۔“

ترجمہ: اگر اس کے ناخن کی جڑ سے خشک یا مرطوب مٹی چھٹی ہوئی ہو اور اس پر سے پانی گزار دیا جائے تو کافی نہ ہوگا۔^۱

مصنوعی دانتوں کی صورت میں وضو و غسل کے احکام

مصنوعی دانت دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو مستقل طور پر لگا دیئے جائیں اور پھر ان کو آسانی سے نکالنا نہ جاسکے۔ دوسرے وہ جو بنائے ہی اس طرح جاتے ہیں کہ حسب ضرورت ان کا استعمال کیا جائے اور حسب ضرورت نکال لیا جائے۔

پہلی صورت میں یہ مصنوعی دانت اصل دانت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کا حکم اصل دانتوں ہی کا ہوگا۔ وضو میں ان دانتوں تک پانی پہنچانا مسنون ہوگا اور غسل میں فرض، دانت نکالنے اور تہہ تک پانی پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے اس طرح کے دانت لگانے یا دانتوں کو سونے چاندی کے تاروں سے کسے کی اجازت دی ہے۔ اب ظاہر ہے اس اجازت کا مطلب یہی ہوگا کہ ان کے اندرونی حصوں میں پانی پہنچانا ضروری نہیں ہے، ورنہ اجازت بڑی پریشان کن بھی ہوگی اور بے معنی بھی۔

جب کہ دوسری صورت میں اس کی حیثیت ایک ”زائد چیز“ کی ہوگی۔ یعنی غسل اسی وقت درست ہو سکے گا جب اس کو نکال کر اصل جسم تک پانی پہنچ جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو غسل درست نہ ہوگا۔

اور چونکہ وضو میں کلی کرنا سنت ہے اور فقہاء کے نزدیک کلی سے مقصود پورے منہ میں پانی پہنچانا ہے۔

”وحد المضمضة استيعاب الماء جميع الفم۔“^۲

اس لئے اس کو نکالے بغیر کلی کرنے کی سنت ادا نہیں ہو پائے گی۔

مصنوعی اعضاء وضو کا حکم

مصنوعی اعضاء کے احکام بھی اسی طرح ہوں گے جو مصنوعی دانتوں کے سلسلہ میں مذکور ہوئے..... یعنی اگر اس کی بناوٹ اور وضع اس نوعیت کی ہو کہ جراحی (OPERATION) بغیر اس کو علاحدہ کرنا ممکن نہ ہو تو ان کی

حیثیت اصل عضو کی ہوگی۔ غسل میں اس پر پانی پہنچانا واجب ہوگا۔ اسی طرح اگر اعضاء وضو میں ہو تو وضو میں بھی دھونا واجب ہوگا اور اگر ان کی نوعیت ایسی ہو کہ آسانی سے علاحدہ کئے جاسکتے ہوں تو غسل کے وقت اور اگر اعضاء وضو میں ہو تو وضو کے وقت اس حصے کو بھی الگ کر کے جسم کے اصل حصے پر پانی پہنچانا ضروری ہوگا۔ اس کی نظیر چھٹی انگلی ہے کہ اس کو بھی اعضاء وضو میں مانا گیا ہے۔

”وان خلق له اصبع زائد اوید زائدة فی محل الفرض وجب غسلها مع الاصلية.“^۱

ترجمہ: ”اگر کسی کو پیدائشی طور پر زائد انگلی ہو یا محل فرض میں زائد ہاتھ ہو تو اصل عضو کے ساتھ زائد عضو کو بھی دھونا واجب ہوگا۔“

بلکہ یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ محل فرض کے علاوہ کسی حصہ کا چمڑا فرض حصہ تک لٹک جائے تو اس کو دھونا بھی فرض ہو جائے گا۔

”وان تعلق جلدہ من غیر محل الفرض حتی تدلت من محل الفرض وجب غسلها.“^۲

ترجمہ: ”اگر محل فرض کے علاوہ سے چمڑا لٹکا ہو اور وہ محل فرض سے لگ رہا ہو تو اس کا بھی دھونا واجب ہوگا۔“

نتھ اور آرنگ وغیرہ کے احکام

نتھ اور آرنگ اگر تنگ ہوں کہ پانی ان کی وجہ سے جسم تک نہ پہنچ سکتا ہو تو ان کو حرکت دینا یا نکال کر پانی پہنچانا ضروری ہوگا۔ ہاں اگر اتنی ڈھیلی ہوں کہ اس کے بغیر بھی پہنچ جاتا ہو تو نکالنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ پانی پہنچانے کے لئے کان وغیرہ کے اس سوراخ میں لکڑی داخل کرنے اور تکلف کی ضرورت نہیں۔ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

”وجب تحريك القرط والخاتم الضيقين ولولم یکن قرط فدخل الماء الثقب عند مروره أجزاءه وإلا أدخله ولا يتكلف فی إدخال شیء سوی الماء من خشب ونحوه.“^۳

ترجمہ: ”انگوٹھی اور آرنگ کو حرکت دینا ضروری ہے اگر آرنگ نہ ہو اور پانی سوراخ میں صرف

گزارنے کی وجہ سے داخل ہو جائے تو کافی ہے ورنہ خصوصیت سے اس میں پانی داخل کرے۔ البتہ پانی کے علاوہ لکڑی وغیرہ داخل کرنے کی تکلیف نہ کرے۔“

پلاسٹر پر مسح

پاؤں ہاتھ وغیرہ پر بدرجہ مجبوری جو پلاسٹر لگائے جاتے ہیں ان کی حیثیت ”جبیرہ“ (پٹی) کی ہے۔^۱ وضو غسل میں ان پر مسح کر لینا کافی ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ پلاسٹر لگاتے وقت پاکی ہی کی حالت میں رہا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ ٹوٹ گیا اور پٹی باندھ لی تو رسول اللہ ﷺ نے پٹی ہی پر مسح کرنے کا حکم فرمایا۔ اس کے لئے کوئی مدت بھی متعین نہیں ہے، جب تک صحت یاب نہ ہو، مسح کرتا رہے، اگر صحت مند ہونے سے پہلے اپنے آپ ہی یہ پٹی کھل کر گر گئی تو دوبارہ مسح کی ضرورت نہیں۔ ہاں، اگر صحت ہو گئی تو اب پھر دوبارہ دھونا ضروری ہوگا، مثلاً نماز کے درمیان پلاسٹر گر پڑا اور اب وہ صحت مند ہو چکا ہے تو اس کو نماز توڑ کر دوبارہ وضو کرنا ہوگا، پھر نماز ادا کرے گا..... جیسا کہ ”مسح علی الجبیرہ“ کا حکم ہے۔

انجکشن سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ

باہر سے غذا یا دوا کی صورت میں کسی چیز کا اندر جانا ناقض وضو نہیں ہے انجکشن پر جسم کا تھوڑا سا خون لگا رہتا ہے۔ اس مقدار میں خون کا باہر آنا بھی ناقض وضو نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اتنی کم مقدار میں ہوتا ہے کہ بہہ نہیں سکتا۔ چنانچہ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر جسم سے خون نکلے، اسے پونچھ دیا جائے اور اس کی مقدار اتنی کم ہو کہ نہ پونچھا جاتا تو بھی بہہ نہیں سکتا تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

”اذا خرج من الجرح دم قليل فمسحه، ثم خرج ايضا ومسحه فان كان الدم بحال لو ترك ماقد مسح منه فسال انتقض وضوئه، وان كان لا يسيل لا ينتقض وضوئه.“^۲

ترجمہ: ”جب زخم سے تھوڑا سا خون نکلے، پھر اسے پونچھ ڈالے پھر دوبارہ خون نکلے اور اسے بھی پونچھ ڈالے، تو اگر مجموعی طور پر خون کی مقدار اتنی ہو کہ پونچھا ہوا خون چھوڑ دینے کی صورت میں بہہ جاتا تو وضو ٹوٹ جائے گا، ورنہ نہیں۔“

ہاں اگر انجکشن کا منشا ہی خون نکالنا اور کھینچنا ہو تو اس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جائے گا..... اور اس کی نظیر فقہ کا یہ

^۱ فان الجبانہ ما بعد لوضعه علی الکسر لینجبر، المغنی: ۱/۱۷۱

^۲ الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۶

^۳ ابن ماجہ عن حسین بن علی: ۱/۱۴۸

جزئیہ ہے کہ:

”القراد اذا مص عضو انسان فامتلا دمان كان صغيرا لا ينتقض وضوءه كما مصت الذباب او البعوض وان كان كبيرا ينقض وكذا العلقه اذا مص عضو انسان حتى امتلا عن دمه انتقض الوضوء.“^۱

ترجمہ: ”چپڑی جب کسی آدمی کا عضو چوس لے اور خون سے بھر جائے تو اگر وہ چھوٹا ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ جیسے مچھر مکھیاں وغیرہ اور اگر بڑا ہو تو ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح جونک جب آدمی کا عضو چوسے یہاں تک کہ خون سے بھر جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔“

معدہ تک نلکی پہنچائی جائے

بعض میڈیکل تحقیق کے لئے حلق کے ذریعہ معدہ تک نلکی پہنچائی جاتی ہے اور پھر وہ نلکی کھینچ لی جاتی ہے یا گوشت کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر اپنے ساتھ لاتی ہے ایسی صورت میں وضو ٹوٹ جائے گا، کیوں کہ اس کو مقام نجاست سے نکالا گیا ہے اس لئے بعید نہیں کہ اس میں کچھ نجاست لگی ہوئی ہو۔ علامہ کا سانی فرماتے ہیں:

”وكذلك خروج الولد والدودة والحصى واللحم وعود الحقنة بعد غيبوبته الان هذه الاشياء وان كانت طاهرة في انفسها لكنها لا تخلو عن قليل نجس يخرج معها.“^۲

ترجمہ: ”اسی طرح بچہ کی پیدائش، کیڑا، کنکری اور گوشت نیز حقنہ کی لکڑی کا اندر چھپ جانے کے بعد نکلنا ناقض وضو ہے کیوں کہ گویہ بذات خود پاک ہیں لیکن نجاست کی معمولی مقدار سے خالی یہ بھی نہیں ہوتیں جو اس کے ساتھ نکل آتی ہیں۔“

پیشاب کی نلکی سے پیشاب

کسی شخص کا آپریشن کیا جائے اور پیشاب کے باہر نکلنے کے لئے خصوصی نلکی لگا دی جائے جس سے پیشاب آتا رہے تو اس نلکی سے بھی پیشاب کا آنا ناقض وضو ہے۔ کیوں کہ نجاست متعینہ مقام سے نکلے یا کسی اور جگہ سے، وہ بہر حال ناقض وضو ہے البتہ اگر مسلسل اس سے پیشاب آتا رہے اور روکنے کی قوت ختم ہو جائے تو وہ معذور کے حکم میں ہوگا اور ہر نماز کے وقت ایک بار وضو کرنے کے بعد جب تک اس کے علاوہ کوئی اور ناقض وضو پیش نہ آجائے یا نماز کا وقت نہ گزر جائے وہی وضو اس کے لئے کفایت کرے گا۔

^۱ حوالہ سابق ^۲ بدائع الصنائع: ۱/۲۵۱ ^۳ دیکھئے: بدائع الصنائع: ۱/۲۴۱

پائپ کے ذریعہ اندرون جسم دوا

اگر کوئی شخص بواسیر کا مریض ہو اور پائپ کے ذریعہ جسم کے اندرونی حصہ میں دوا پہنچائی جائے تو اس سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا، چنانچہ علامہ کا سانی فرماتے ہیں:

”اذا خرج دبره ان عالجه بیده او بخرقه حتی ادخله تنتقض طهارته لانه يلتزق بیده شیء من النجاسة.“^۱

اگر کمر سے نیچے کا حصہ بے حس کر دیا جائے

آج کل علاج کی بعض صورتوں میں ریڑھ یا کمر میں ایسے انجکشن لگائے جاتے ہیں جس سے کمر سے نیچے کا حصہ بے حس ہو جاتا ہے..... یہ صورت بھی ناقض وضو ہے کیوں کہ فقہاء نے جنون، بے ہوشی اور غشی کو ناقض وضو مانا ہے۔^۲

اس لئے کہ اس کی وجہ سے انسان کی اپنے اعضاء پر گرفت باقی نہیں رہتی اور اس کی وجہ سے ناقض وضو کے پیش آنے کا ادراک نہیں ہو پاتا، واللہ اعلم

آنکھوں سے گرنے والا پانی

آنکھوں سے پانی گرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ رونے کی وجہ سے آنسو گرے یا کوئی تنکہ وغیرہ گر جانے کی وجہ سے پانی گرے۔ ان صورتوں میں یہ پانی بالاتفاق ناقض وضو نہیں ہے۔ البتہ اگر آنکھ دکھنے یا سرخ ہو جانے کی وجہ سے پانی گرے تو اس میں فقہاء کی رائیں مختلف ہیں۔ علاء الدین ہسکفی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی (۱۰۸۸-۱۰۲۵) نے اس کو ناقض وضو قرار دیا ہے۔ مگر علامہ ابن عابدین شامی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی (۱۲۵۲-۱۱۹۸) نے حافظ ابن ہمام رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی (۸۸۸-۸۶۱) سے نقل کیا ہے کہ یہ ناقض وضو نہیں ہے۔ البتہ مستحب اور بہتر ہے کہ وضو کر لیا جائے۔ ابن ہمام رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے اس پر امام محمد رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی (۱۳۵-۱۸۹) کے اس قول سے بھی استدلال کیا ہے:

”اذا كان في عينه رمد وتسيل الدموع منها امره بالوضوء لوقت كل صلوة لاني اخاف ان يكون ما يسيل منها صديدا فيكون صاحب العذر.“^۳

ترجمہ: ”جب آشوب چشم ہو اور اس سے آنسو بہہ رہے ہوں تو اس کو ہر نماز کے وقت کے لئے

وضو کا حکم دینا چاہئے۔ اس لئے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ آنکھوں سے بہنے والا یہ پانی زخم کی پیپ ہو لہذا وہ صاحبِ عذر قرار پائے گا۔“

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام محمد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اس وضو کو محض مستحب اور قرین احتیاط سمجھتے تھے واجب نہیں کہتے تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۱۲۴۴-۱۳۲۳) اور مفتی عزیز الرحمن عثمانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۱۲۷۵-۱۳۳۷) کی بھی یہی رائے ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ ابنِ نجیم مصری کی یہ صراحت قابلِ لحاظ ہے۔

”وهذا التعليل يقتضى انه امر استحباب فان الشك و الاحتمال في كونه ناقضا لا يوجب الحكم بالنقض اذ اليقين لا يزول بالشك نعم اذا علم من طريق غلبة الظن باخبار الاطباء او بعلامات تغلب على ظن المبتلى يجب.“^۱
ترجمہ: ”اس علت کا تقاضا ہے کہ یہ حکم استحبابی ہو، اس لئے کہ محض شک اور احتمال سے نقض وضو کا حکم نہیں لگایا جاسکتا کیوں کہ شک کی وجہ سے یقین زائل نہیں ہوتا۔ البتہ اگر ڈاکٹروں کے بتانے یا بعض مقررہ علامتوں سے غلبہ ظن معلوم ہو جائے تو نقض وضو کا حکم لگایا جائے گا۔“

یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ اس مسئلہ کی اصل اور بنیاد یہ ہے کہ آنکھ سے گرنے والا پانی کس نوعیت کا ہے؟ اگر یہ زخم سے رسنے والا پیپ اور پانی ہے تو نجس ہے اور وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اب غور کیجئے تو آنکھ اسی طرح ایک مرطوب جگہ ہے جیسے زبان۔ اگر زبان پر کوئی پھنسی ہو تو لعاب کا آنا اور بڑھ جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی نہ وہ زخم بنتی ہے اور نہ پھوٹی ہے۔ یہی حال آنکھوں کا ہے۔ اس میں ذرا بھی پھنسی یا خارش ہوگی تو یہ رطوبت بڑھ جائے گی۔ حالانکہ بسا اوقات یہ بات مشاہدہ میں ہوتی ہے کہ پھنسی ابھی اس درجہ کی ہے ہی نہیں کہ اس سے پیپ بہہ سکے۔ اس لئے درحقیقت یہ پانی نہیں ہے اور جیسا کہ ابنِ ہمام رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے کہا ہے اس سے وضو نہیں ٹوٹنا چاہئے..... ہاں اگر کسی کی آنکھ کا زخم بہت بڑھ جائے، پانی گر رہا ہو اور ڈاکٹر کہہ دے کہ اسی زخم کا پیپ اور اس کا رستا ہوا پانی ہے تو اس صورت میں بے شک یہ ناقض وضو ہوگا۔ واللہ اعلم

مسواک کی جگہ ٹوتھ پیسٹ اور برش

مسواک کے دو پہلو ہیں۔ ایک مسواک کا اصل مقصود اور یہ ظاہر ہے کہ نظافت اور صفائی و ستھرائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے دنوں تک مسواک نہ کرنا کہ منہ میں بدبو پیدا ہو جائے اور دانتوں پہ زردی آجائے، مکروہ ہے.....

دوسرا پہلا آلہ مسواک کا ہے یعنی وہ چیز جس کے ذریعے دانتوں کی صفائی و ستھرائی کا کام لیا جائے۔
 ٹوتھ پیسٹ، برش اور منجن کے ذریعہ مسواک کی پہلی سنت ادا ہو جائے گی امام نووی کا بیان ہے:
 ”وبای شی استاك مما يقلع ويزيل التغير كالخرقة وغيرها أجزاء لأنه يحصل به المقصود وإن أمر إصبعه على أسنانه لم يجزئه لانه لا يسمى سواكاً۔“
 ترجمہ: ”گندگی اور دانتوں کی زردی کو ختم کر دینے والی چیزوں میں سے جس چیز سے بھی مسواک کرے کافی ہے کہ اس سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے اگر دانتوں پر محض انگلی سے ملا ہو تو کافی نہیں کہ اس کو مسواک سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔“
 اور شیخ سید سابق رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کہتے ہیں:

”وان كانت السنة تحصل بكل ما يزيل صفرة الاسنان فينظف الفم كالفرشة ونحوها۔“

دوسری سنت اسی وقت ادا ہوگی جب کہ مسواک لکڑی کی ہو اور اسی ہیئت کی ہو جس طرح کی رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے۔

نوم کے موزوں اور بوٹ پر مسح

شریعت میں جن موزوں پر مسح کی اجازت دی گئی ہے..... اس کے لئے تین شرطیں ہیں:

- ۱۔ ٹخنوں سمیت پاؤں کے جتنے حصہ کا دھونا فرض ہے اس کو چھپائے اور تین انگلیوں کی مقدار پھٹن نہ ہو۔
- ۲۔ پاؤں سے لپٹا ہوا ہو۔

- ۳۔ اس کو پہن کر معمول کی رفتار کے لحاظ سے ایک فرسخ (دو میل) یا اس سے زیادہ چلنا ممکن ہو۔ اگر اس کے اوپری حصہ میں اس طرح شگاف ہو کہ فیتہ کے ذریعہ اسے باندھ لیا جائے تو بھی مضائقہ نہیں اور اس پر مسح کیا جاسکتا ہے۔

علامہ علاء الدین ہسکفی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی (۱۰۲۵-۱۰۸۸) لکھتے ہیں:

” (شرط مسحہ) ثلاثة امور الاول: (كونه ساتر) محل فرض الغسل (القدم مع الكعب) او يكون نقصانه اقل من الخرق المانع فيجوز على الزربول لومشد ودالا ان يظهر قدر ثلاثة اصابع (و) الثاني: (كونه مشغولا بالرجل) ... والثالث: (كونه مما يمكن متابعة المشي) المعتاد (فيه) فرسخا فاكثر۔“

تَرْجَمًا: ”موزوں پر مسح کے لئے تین شرطیں ہیں۔ پہلی یہ کہ پاؤں کے جتنے حصے کاٹخنوں سمیت دھونا واجب ہے اس کو چھپائے یا اتنی مقدار کم ہو جتنی مقدار پھٹن کی گنجائش ہے۔ چنانچہ جوتے پر مسح جائز ہے۔ اگر وہ بندھا ہوا ہو۔ مگر اس صورت میں درست نہ ہوگا جب تین انگلیوں کی مقدار پاؤں کھل جائے۔ دوسرے وہ پاؤں سے لپٹا ہوا ہو، تیسرے معمول کی رفتار کے لحاظ سے اس کو پہن کر ایک فرسخ یا زیادہ چلنا ممکن ہو۔“

اور ابن عابدین شامی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی (۱۱۹۸-۱۲۲۵) البحر الرائق کے حوالے سے نقل کرتے ہیں:

”ويجوز على الجاروق المشقوق على ظهر القدم وله ازرار يشدها عليه تسده لانه كغير المشقوق.“^۱

تَرْجَمًا: ”مسح علی الخفین کے لئے ایسا (جاروق) بھی کافی ہوگا جس میں قدم کا بالائی حصہ پھٹا ہو اور اسے ڈوری سے باندھا جاسکے۔ اس لئے کہ وہ بن پھٹے موزوں کی مانند ہے۔“

بوٹ میں تو یہ شرطیں پائی ہی جاتی ہیں۔ امید ہے کہ مضبوط قسم کے فوم (FOAM) میں بھی یہ تینوں شرطیں پائی جاتی ہوں گی۔ اس لئے ان پر مسح درست ہوگا۔ لیکن بوٹ کے سلسلہ میں مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی (۱۲۸۰-۱۳۶۲) کی اس ہدایت کو پیش نظر رکھنا چاہئے:

”البتہ بوجہ اس کے کہ بجائے جوتا کے مستعمل ہوتا ہے۔ اس لئے یا بوجہ نجس ہونے کے اور یا بوجہ سوء ادب کے بلا ضرورت اس سے نماز نہ پڑھنا چاہئے۔“^۲

ٹرین وغیرہ کی دیواروں پر تیمم

ٹرین، بس وغیرہ کی دیواریں عموماً لکڑی، لوہے یا پلاسٹک کی ہوتی ہیں، ان پر تیمم کرنا درست نہیں ہے۔ البتہ عموماً سفر کے دوران ان پر گرد و غبار جم جاتا ہے اور امام ابو حنیفہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں گرد و غبار پر بھی تیمم کیا جاسکتا ہے:

”ويجوز التيمم عند ابني حنيفة ومحمد بكل ماكان من جنس الارض من التراب والرمل والحجر والجص وكذا يجوز بالغبار.“^۳

اگر ٹرین پر اس طرح گرد و غبار ہو تو تیمم کیا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں۔

ٹسٹ ٹیوب سے غسل کا وجوب

ٹسٹ ٹیوب میں نکالی ہوئی منی محفوظ کی جاسکتی ہے۔ پھر اسے انجکشن کے سرنج (SYRINGE) یا خود اسی ٹیوب کے ذریعہ اندر پہنچایا جاتا ہے۔ اس طرح ٹیوب کے ذریعہ منی عورت کے رحم میں پہنچانا موجب غسل نہیں۔ اس سرنج یا ٹیوب کا داخل کرنا ایسا ہی ہے جیسے عورت کے جسم میں انگلی داخل کرنا، لہذا جس طرح یہ موجب غسل نہیں، اسی طرح ٹیوب کا داخل کرنا بھی موجب غسل نہ ہوگا۔

”ولا عند ادخال اصبع ونحوہ کذا غیر آدمی۔“^۱

اس سلسلہ میں بڑی واضح شہادت فقہاء کا یہ جزئیہ ہے کہ:

”اذا وطنی امراء ته دون الفرج فذب ماء ه الى فرجها ثم خرج او وطنها في

الفرج فاغتسلت ثم خرج ماء الرجل من فرجها فلا غسل عليها۔“^۲

ترجمہ: ”اگر کسی نے غیر محل میں اپنی بیوی سے صحبت کی اور اس کی منی شرمگاہ تک چلی گئی پھر نکل

گئی، یا محل ہی میں صحبت کرنے کے بعد عورت نے غسل کیا، پھر مرد کی منی شرمگاہ سے نکلی ہو تو اس

عورت پر غسل واجب نہیں۔“

اصل بات یہ ہے کہ مجرد مادہ تولید کا دخول و خروج موجب غسل نہیں ہے بلکہ انسان اس عمل کی وجہ سے جو جنسی لذت اور کیف محسوس کرتا ہے اور جو لذت پورے جسم کو پہنچتی ہے، شریعت غسل کے ذریعہ اس کی تطہیر کرنا چاہتی ہے۔

اب ٹسٹ ٹیوب کے ذریعہ تشنہ تکمیل ”جنین“ یا انجکشن وغیرہ کے ذریعہ جو مادہ مثیلنی طور پر عورت کے رحم (UTERUS) میں پہنچایا جاتا ہے، ظاہر ہے اس سے وہ تسکین حاصل نہیں ہو سکتی جو اپنے شوہر کے ساتھ ہم بستری میں ہوتی ہے۔

نرودھ کی صورت میں غسل کا وجوب

غسل واجب ہونے کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں: ایک تو شہوت کے ساتھ انزال، دوسرے حشفہ (سپاری) کے مقدار عضو مخصوص کا ادخال..... لیکن اگر عضو مخصوص اس طرح کپڑے میں لپیٹ کر داخل کیا جائے کہ جسم کی حرارت ایک دوسرے کو محسوس نہ ہو اور لذت اندوز نہ ہو سکے، نیز انزال بھی نہ ہونے پائے تو غسل واجب نہیں ہوتا۔ فقہاء نے ان صورتوں کا جن میں غسل واجب نہیں ہوتا ہے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”وایلاج بخرقة مانعة من وجود لذة.“^۱

لیکن نرودھ اس میں داخل نہیں ہے اس لئے کہ اس میں غلاف اتنا باریک ہوتا ہے کہ اس کے باوجود طرفین لذت یاب ہوتے ہیں اور اس کی صنعت کا منشا ہی یہ ہے کہ جنسی لطف بھی اٹھایا جائے اور اولاد کا بار بھی نہ ہو۔ لہذا نرودھ کے ساتھ مجامعت کی صورت میں بھی غسل واجب ہوگا۔

غسل و وضو میں بال کے مصنوعی جوڑوں کا حکم

بالوں کے مصنوعی جوڑے جو ہمارے زمانے میں عورتیں بکثرت استعمال کرنے لگی ہیں، اور جن سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔^۲

اگر ان کو باندھ ہی لیں تو سوال یہ ہے کہ وضو و غسل میں ان کا کیا حکم ہوگا؟..... چونکہ یہ بال اس کے جسم کا حصہ نہیں ہیں، نہ کسی ضرورت کی بناء پر لگائے گئے ہیں اور نہ ان کا نکالنا چنداں دشوار ہے۔ اس لئے اس کی حیثیت ایک خارجی چیز کی ہوگی۔ غسل میں تو یوں بھی عورتوں کے لئے بال کی جڑوں تک پانی پہنچانا کافی ہے بال دھونا ضروری نہیں۔

”ولیس علی المرأة ان تنقص صفائرها فی الغسل اذا بلغ الماء اصول الشعر.“^۳

وضو میں بھی ان کی حیثیت یہی ہوگی۔ مثلاً اگر کوئی خاتون اس طرح سر کا مسح کرے کہ صرف مصنوعی بالوں کے حصہ پر مسح ہو اور اصلی بالوں پر کم از کم چوتھائی سر کے مقدار بھی مسح نہ ہو پائے تو کافی نہ ہوگا۔ ان کو اپنے اصل بالوں پر مسح کرنا چاہئے۔

قرآنی آیات کے کیسٹ بے وضو چھونا

لکھی ہوئی آیات کو ناپاکی کی حالت میں چھونا درست نہیں، اس پر سمجھوں کا اتفاق ہے۔ کیسٹ، ظاہر ہے تحریر نہیں ہے اس لئے مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ) نے اس کو بے وضو بھی چھونے کی اجازت دی ہے۔^۴ اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ ”قرآن کی آواز“ ہے اور قرآن کی آواز کے جسم سے مس ہونے کے لئے پاکی ضروری نہیں، ورنہ تو جنبی کے لئے قرآن کا سننا بھی درست نہیں

^۱ ابو الحسن شرنبلالی، نور الابضاح، مع مراقی الفلاح: ۵۵ ط: دارالایمان دمشق

^۲ بخاری: ۲/ باب الوصل فی الشعر، کتاب اللباس وغیرہ

^۳ امداد الفتاوی: ۱/ ۱۴۵

^۴ ہندیہ: ۱۳/۱ فرائض غسل

ہوتا۔

لیکن مسئلہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ”قرآن“ کو چھونے کی ممانعت کا اصل سبب اس کا ”مکتوب ہونا“ نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید کا احترام ہے۔ یہ تحریر الفاظ قرآنی کا نقش ہے۔ جو قرآن مجید پر دلالت کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ”کیسٹ“ آواز قرآنی کا نقش ہے جو قرآن مجید پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے اگر کاغذ کا احترام واجب ہو جن میں الفاظ محفوظ کئے گئے ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کیسٹوں کا احترام واجب نہ ہو جن میں قرآن کی آواز کو محفوظ کیا گیا ہو۔ اس لئے آیات قرآنی کے کیسٹ بھی بلا وضو چھونا مناسب نہیں، اور کم سے کم احتیاط کے خلاف ہے..... جنبی کے لئے سماعت قرآن کے جائز ہونے سے استدلال محل غور ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید سننے میں سننے والے کے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ آواز بے اختیار اس کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ اس کے برخلاف کیسٹ چھونے میں خود چھونے والا اپنے اختیار سے یہ کام کرتا ہے۔ البتہ فیتہ کے اوپر جو پلاسٹک کا کیس ہے اس کی حیثیت غلاف کی ہوگی اور اس کے ساتھ چھونے میں مضائقہ نہیں۔

جنابت میں قرآن کی کتابت و ٹائپ

جنابت کی حالت میں قرآن مجید کا لکھنا درست نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر کاغذ اس طرح ہو کہ اس پر ہاتھ رکھنے کی نوبت نہ آئے تو بھی درست نہ ہوگا۔ چاہے ایک آیت سے بھی کم کیوں نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنبی کے لئے قرآن مجید کی کمپوزنگ (COMPOSING) اور اس کو ٹائپ کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

”والجنب لا یکتب القرآن وان کانت الصحیفۃ علی الارض ولا یضع یدہ علیہا وان کان مادون الایۃ۔“^۱

ترجمہ: ”جنبی قرآن مجید کی کتابت نہ کرے خواہ ایسا ہی کیوں نہ ہو کہ کاغذ زمین پر ہو اور وہ اس پر اپنا ہاتھ نہ رکھے، چاہے وہ ایک آیت سے کم ہی کیوں نہ ہو۔“
اگر وضو نہ ہو تو اس طرح لکھ سکتا ہے کہ ہاتھ کاغذ سے نہ لگے۔

”لا تکرہ کتابۃ القرآن والصحیفۃ واللوح علی الارض۔“^۲

ترجمہ: ”بے وضو کے لئے قرآن کی کتابت اس طرح مکروہ نہیں ہے کہ کاغذ اور تختی زمین پر ہو۔“

مگر اس میں بھی اختلاف ہے اس لئے احتراز بہتر ہے۔ یہ حکم جس طرح کتابت کے لئے ہے اسی طرح ٹائپ اور کمپوزنگ کے لئے بھی ہے۔

قرآن مجید کی غلاف نما جلد

قرآن مجید کی ایک جلد تو وہ ہے جو جلد سازی میں قرآن کے اوراق کے ساتھ پیوستہ کر دی جاتی ہے، اس کو الگ کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتا کہ ان اوراق کو جس سلائی نے مربوط رکھا ہے اسے توڑ دیا جائے، ایسی جلد بجائے خود مصحف قرآنی کے حکم میں ہے، ناپاک آدمی کے لئے اس کا چھونا اور پکڑنا درست نہیں ہے اور اگر ایسی جلد ہو جو با آسانی اس سے علیحدہ کی جاسکتی ہو جیسا کہ آج کل بیگ نما جلدیں ہیں تو ان کو چھوا جاسکتا ہے اور یہ غلاف کے حکم میں ہے جن کے ساتھ فقہاء نے بلا وضو بھی قرآن مجید کو چھونے کی اجازت دی ہے۔^۱

قرآنی آیات کے تمنع

آج کل دھاتوں کے بنے ہوئے مختلف تمنع گلوں میں پہننے اور بازوؤں وغیرہ پر باندھنے کا ایک گونہ رواج سا ہو گیا ہے۔ اس قسم کی نمائشی مسلمانیت گو اسلام میں نہ مطلوب ہے اور نہ پسندیدہ۔ لیکن اگر کوئی اس قسم کے تمنعوں کا استعمال کر ہی لے جن پر آیات وغیرہ لکھی ہوں تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں پوری آیت لکھی ہو تو قرآن مجید کے حکم میں ہے۔ اس کو چھونا جائز نہیں ہے۔

”لا يجوز لمس شيء مكتوب فيه شيء من القرآن من لوح او دراهم او غير ذلك اذا كانت آية تامة.“^۲

ترجمہ: ”کسی ایسی چیز کا چھونا جائز نہیں ہے جس میں قرآن کا کچھ حصہ لکھا ہوا ہو جیسے تختی یا درہم وغیرہ، بشرطیکہ مکمل ایک آیت ہو۔“

رہ گیا یہ کہ اس کو اس طرح لٹکانا اور باندھنا جائز ہوگا یا نہیں؟

تو جس پر غسل واجب ہو اس کے لئے تو بہر حال ناجائز ہوگا اس لئے کہ شریعت اس کو سراپا ناپاک تصور کرتی ہے، اسی طرح جس کو صرف وضو کی ضرورت ہو وہ بھی اعضاء وضو یعنی ہاتھ وغیرہ سے نہ چھوئے۔ البتہ اعضاء وضو کے علاوہ دوسرے اعضاء سے چھونا اور مس کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں، اس لئے کہ شریعت کا حکم وضو دینا اس بات کی علامت ہے کہ ناپاک صرف یہی اعضاء ہیں اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دوسرے اعضاء سے بھی مس کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ جسم کی یہ غیر محسوس ناپاکی قابل تقسیم نہیں ہے کہ بعض حصوں کو پاک اور بعض کو ناپاک کہا جائے۔

پہلی رائے کے مطابق ایسے تمنعوں کا گلے میں لٹکانا یا بازو میں باندھنا درست قرار پائے گا اس لئے کہ وہ

^۱ الجوہرۃ النبیۃ، ج: ۱

^۲ الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ الابغلاف متجاف عنہ كالخريطة والجلد المشرز.

اعضاء وضو سے مس نہیں کرتے جب کہ دوسری رائے کے مطابق یہ بات ناجائز قرار پائے گی کیوں کہ ان کے نزدیک سارے اعضاء کا حکم یکساں ہے۔ احتیاط اس دوسری رائے میں ہے اور اسی لئے فقہاء نے اس کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔^۱

یہی حکم قرآن مجید کے ان چھوٹے نسخوں کا بھی ہونا چاہئے جنہیں ہمارے زمانے میں تعویذ کے بطور استعمال کیا جاتا ہے اور جسے خوردبین کی مدد کے بغیر پڑھا نہیں جاسکتا..... ہاں البتہ تعویذ یا قرآن مجید تانبے کے غلاف میں ہو جیسا کہ رواج ہے تو اب چھونے میں مضائقہ نہیں۔

ایسے تمنعے اور قرآن مجید کو استنجاء کی حالت میں ساتھ رکھنا یا بیت الخلاء میں لے جانا بھی مکروہ ہے:

”يَكْرَهُ أَنْ يَدْخُلَ فِي الْخَلَاءِ وَمَعَهُ خَاتَمٌ عَلَيْهِ اسْمُ اللَّهِ تَعَالَى أَوْ شَيْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ.“^۲

ترجمہ: ”بیت الخلاء میں ایسی انگلی لے کر داخل ہونا مکروہ ہے جس پر اللہ کا نام ہو یا قرآن کا کچھ حصہ لکھا ہوا ہو۔“

ترجمہ قرآن کا حکم

قرآن مجید کا ترجمہ خواہ کسی زبان میں ہو مسلمان آدمی کے لئے اس کا بلا وضو چھونا مکروہ ہے۔ اس میں اردو، فارسی، انگریزی وغیرہ سب داخل ہے۔ اس لئے کہ گو کہ کلام الہی اصل عربی الفاظ ہیں مگر مقصود تو یہی معانی اور مفہیم ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”ولو كان القرآن مكتوباً بالفارسية يكره لهم مسه عند أبي حنيفة وكذا عندهما على الصحيح.“^۳

دوسرے فقہاء کے نزدیک، ترجمہ قرآن کے حکم میں نہیں ہے، اس لئے اس کو بلا وضو چھونے میں حرج نہیں، تاہم ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالَى کی رائے قرین احتیاط ہے۔

قرآن کے نقوش و اعداد

قرآن کے نقوش و اعداد کی حیثیت قرآن مجید کی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ عدد کسی دوسرے جملے کا بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی کسی آیت کا جنبی کے لئے پڑھنا درست نہیں ہے۔ لیکن اگر اس آیت میں آنے

^۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۵۰/۱ بحث الاستنجاء

^۲ والمنع اصح كذا في الزاھدی، الفتاویٰ الہندیہ: ۳۸/۱

^۳ الفتاویٰ الہندیہ: ۱/ الفصل الرابع فی احکام الحيض والنفاس والاستحاضه

والے تمام حروف تہجی کو الگ الگ کہے تو اجازت ہے:

”اذا حاضت المعلمة فينبغي لها ان تعلم الصبيان كلمة كلمة وتقطع.“^۱

اس لئے کہ یہ علاحدہ حروف کچھ ضرور نہیں کہ آیت قرآنی ہی بنیں۔ یہی حال ان اعداد کا ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ کی بجائے ۸۶ کہہ دینا یا لکھ دینا کافی نہیں ہے۔

اسپرٹ و ٹنکچر

اسپرٹ و ٹنکچر وغیرہ کے بارے میں ڈاکٹروں کی تحقیق ہے کہ یہ ”جوہر شراب“ ہیں البتہ ان میں زہر کے اجزاء بھی پائے جاتے ہیں۔ جو چیز شراب ہو اس میں مفتی بہ قول کے مطابق کم و بیش کی کوئی تفریق نہیں ہے، کم ہوں یا زیادہ، حرام ہوں گے اور اس لئے ناپاک بھی ہوں گے۔

اس لئے یہ ہوں گے تو ناپاک ہی، خواہ مخواہ ان کو لگانا درست نہیں اور لگ جائے تو دھونا واجب ہوگا۔ البتہ چونکہ اس کا استعمال بطور دوا کے ہوتا ہے اس لئے کوئی متبادل دوا نہ ملنے یا اس کے حاصل کرنے کی استطاعت نہ ہونے یا اس کی تلاش تک مرض کے بڑھ جانے اور شدت اختیار کر لینے کی صورت میں اس کا استعمال کرنا درست ہوگا۔ امام ابو حنیفہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا اصل مسلک تو یہ ہے کہ حرام چیزوں سے علاج نہیں کیا جاسکتا۔ مگر فقہاء احناف نے بھی ازراہ حاجت اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔^۲

اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اصحابِ عرینہ کو اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم فرمایا تھا۔^۳

اسپرٹ کا استعمال بعض ایسی چیزوں میں بھی ہوتا ہے جن کا بکثرت تعامل ہے اور ہمارے زمانہ میں اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔ مثلاً کپڑوں کے رنگ، روشنائی، رنگے ہوئے کپڑے وغیرہ، ان کا استعمال بھی درست ہوگا۔ ایک تو اس لئے کہ ان کا استعمال عام ہو گیا ہے اور ”ابتلاء عام“ کی صورت پیدا ہو گئی ہے جو فقہی احکام میں تخفیف کا باعث بن جاتا ہے۔ فمن القواعد الشرعية المتفق عليها ”ان الامراذ اضاق اتسع“۔^۴

دوسرے اسپرٹ، روشنائی وغیرہ میں پڑنے کے بعد گویا اپنی حقیقت کھودیتا ہے اور اس کی اصل ہی بدل جاتی ہے اور ناپاک چیز جب اس حد تک بدل جائے کہ اس کی پہلی حقیقت ہی باقی نہ رہے تو اس کے بعد وہ ناپاک باقی نہیں رہتی۔

^۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۳۸/۱ معلمہ جب حائضہ ہو جائے تو ایک ایک لفظ کر کے اور کاٹ کاٹ کر پڑھنا چاہئے۔

^۲ وجوزہ فی النہایۃ بمحرم اذا اخبرہ طبیب مسلم ان فیہ شفاء ولم یجد مباحیقوم مقامہ، الدرالمختار:

۲۴۹/۵ بخاری: ۳۶/۱، باب ابوال اہل کتاب الوضو الاشباہ والنظائر لابن نجیم: ۸۴

الکحل ملی ہوئی خوشبو

آج کل جو سینٹ استعمال کئے جاتے ہیں ان میں عام طور پر الکحل کی آمیزش ہوتی ہے اور الکحل بنیادی طور پر ایک نشہ آور شے ہے، نشہ آور سیال چیزیں حرام بھی ہیں اور ناپاک بھی، اور محض خوشبو کے لئے اس کا استعمال معمولی درجہ کی ضرورت بھی نہیں کیوں کہ ایسی عطریات بھی موجود دستیاب ہیں جو الکحل سے خالی ہوتی ہیں، اس لئے سینٹ کا استعمال درست نہیں، فتاویٰ عالمگیری میں امام محمد رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کی کتاب الاصل کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے:

”اذا طرح فی الخمر ریحان یقال له سوسن حتی توجد رائحته فلا ینبغی ان یدھن او یتطیب بہا ولا یجوز بیعہا۔“^۱

ترجمہ: ”اگر شراب میں خوشبودار پھول ڈال دیا جائے جس کو ”سوسن“ کہا جاتا ہے تاکہ اس کی بو محسوس کی جائے تو اس سے تیل نکالنا یا اس کو خوشبو کے طور پر استعمال کرنا نہیں چاہئے اور نہ اس کا فروخت کرنا جائز ہے۔“

پیشاب فلٹر کرنے کے بعد

ایک چیز ہے کسی شے کی ماہیت اور حقیقت کو تبدیل کر دینا اور دوسری اس کا تجزیہ کر گزرنا (DECOMPOSE) اگر کسی چیز کی حقیقت ہی یکسر بدل دی جائے تو اس کے احکام بھی بدل جائیں گے۔ اور اگر محض اس کے بعض اجزاء کسی طرح الگ کر لئے جائیں تو اس کی وجہ سے اس کے احکام نہیں بدلیں گے۔ مثلاً پائخانہ جلا کر راکھ بنا دیا جائے تو اب وہ راکھ ناپاک شمار نہ ہوگی۔^۲

شراب میں نمک ڈال کر سرکہ بنا دیا جائے تو اس کی حرمت اور ناپاکی ختم ہو جائے گی۔^۳ لیکن اگر کسی طرح سائینٹفک طریقہ پر اس کے بعض اجزاء نکال لئے جائیں جس سے بو ختم ہو جائے تو اس کے باوجود وہ ناپاک رہے گا۔

پیشاب فلٹر (FILTER) کرنے کی وجہ سے غالباً اپنی حقیقت نہیں کھوتا بلکہ محض اس کے بدبودار اجزاء نکال لئے جاتے ہیں اس لئے وہ ناپاک ہی رہیں گے۔ ان کا پینا یا وضو و غسل وغیرہ کے لئے ان کا استعمال جائز نہ ہوگا اور وہ جسم کے جس حصے کو لگ جائے گا اسے ناپاک سمجھا جائے گا۔

کتے کی زبان کا مرہم

غالباً بعض امراض میں کتے کی زبان کا مرہم استعمال کیا جاتا ہے..... کتا امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک ”نجس العین“ نہیں ہے تاہم اس بات پر فقہاء احناف کا بھی اتفاق ہے کہ اس کا گوشت ناپاک ہے۔ اس لئے بہر حال اس کا مرہم ناپاک ہوگا۔ سخت ضرورت اور کسی متبادل صورت کی عدم موجودگی کے بغیر اس کا استعمال درست نہ ہوگا۔ جہاں دوا لگائی گئی ہو وہ حصہ ناپاک ہو جائے گا اور دھونا مضر نہ ہو تو نماز کے وقت دھولینا ضروری ہوگا۔

غیر مسلموں کے برتن

برتن کی پاکی اور ناپاکی کے سلسلہ میں اصولی طور پر تین باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں:

① برتن دو وجوہ سے ناپاک ہوتا ہے یا تو اس لئے کہ اس کو استعمال کرنے والا وہ ہے جس کا جھوٹا ناپاک ہو۔ مثلاً کتا، سور وغیرہ یا اس لئے کہ اس میں جو چیز رکھی جائے وہ خود ناپاک ہو۔ مثلاً برتن میں خون یا شراب رکھ دی جائے۔

جہاں تک غیر مسلموں کی بات ہے تو ان کے جھوٹے ناپاک نہیں ہوتے تمام انسانوں کے جھوٹے پاک ہیں اور اس میں مسلم و کافر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے ظاہر ہے ان کے برتن اس وجہ سے تو ناپاک نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک ناپاکی کی دوسری وجہ ہے تو چونکہ مشرکین کے ذبیحے اور اہل کتاب کے وہ ذبیحے جن پر حضرت مسیح عَلَیْہِ السَّلَام کا نام لیا جائے حرام اور نجس ہیں۔ اس لئے اس کا امکان موجود ہے کہ شاید برتن ان کے لئے استعمال کئے گئے ہوں۔ اسی طرح بعض قوموں میں کتے، سور وغیرہ بھی کھائے جاتے ہیں، ان کے برتنوں کے بارے میں بھی اس شبہ کی گنجائش ہے۔

② عام حالات میں ان ناپاکیوں سے پاکی کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ ان کو دھولیا جائے اور عادتہ ہر قوم میں کھانے وغیرہ کے بعد برتن دھو بھی لئے جاتے ہیں۔ ان برتنوں کے دھونے میں پاکی کی نیت اور ارادہ بھی ضروری نہیں محض دھو دینا کافی ہے۔ چاہے مسلمان دھوئے یا غیر مسلم۔

③ ناپاکی کا فیصلہ محض شبہ کی بناء پر نہیں کیا جاسکتا تا آنکہ اس کے لئے کافی قوی وجہ نہ ہو اور نہ شریعت ان احکام

۱۔ ابن رشد بدایۃ المجتہد: ۴۱؛ المسئلة الثانية فی تلثیر الزکاة فی الحيوان المحرم الاکل

۲۔ الاختلاف فی نجاسة لحمه وطهارة شعره۔ الدر المختار: ۱۹۲/۱

۳۔ الدر المختار علی رد المحتار: ۲۱۵/۱

میں ضرورت سے زیادہ تفحص اور تجسس کو پسند کرتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ سفر میں ایک صاحب نے مقامی باشندہ سے پانی کے ایک گڑھے کے بارے میں سوال کیا کہ اس سے درندے تو نہیں پیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا جواب دینے سے منع فرمایا۔^۱

لہذا جب تک قرائن کی روشنی میں برتن کے ناپاکی کے لئے استعمال کئے جانے کا غالب گمان نہ ہو اور برتن دھلا ہوا بھی نہ ہو یا اس بات کا گمان غالب ہو کہ اس کے لئے ناپاک پانی استعمال کیا گیا ہوگا اس وقت تک اس کو ناپاک شمار نہیں کیا جاسکتا اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں اہل ذمہ پر یہ شرط بھی عائد کی تھی کہ وہ ان کی طرف جانے والے مسلمان قافلوں کی ضیافت کریں۔^۲ ظاہر ہے کہ اس ضیافت کے لئے انہیں کے برتن استعمال کئے جاتے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک نصرانی کے گھرے سے وضو کرنا بھی مروی ہے۔^۳

البتہ جس جگہ ناپاکی کا احتمال زیادہ ہو جیسے یورپ وغیرہ میں جہاں کہ سور کی چربی کا مختلف قسم کی غذاؤں میں بکثرت استعمال ہوا کرتا ہے وہاں احتیاطاً ان کے برتنوں سے بچنا چاہئے اور ان کے برتن دھو کر استعمال کرنا چاہئے۔^۴

لمبے اور مدور حوض

فقہ حنفی کے مشہور قول کے مطابق پانی کثیر اس وقت سمجھا جائے گا جب دس ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ چوڑا ہو، اگر چوڑا حوض بنایا جائے تب تو ظاہر ہے کہ اسی پر عمل ہوگا۔ لیکن آج کل بعض دفعہ محل وقوع کی رعایت سے یا خوبصورتی اور ڈیزائننگ کے لئے گول اور لمبے حوض بھی بنائے جاتے ہیں۔ تو اگر لمبائی لئے ہوئے حوض ہوں تب تو یہ بات کافی ہوگی کہ بہ حیثیت مجموعی ایک سومربع ہاتھ ہوں مثلاً لمبائی بیس ہاتھ ہو تو چوڑائی پانچ ہاتھ ہو۔ اور اگر حوض گولائی لئے ہوئے ہو تو اس کا قطر اڑتالیس ہاتھ ہونا چاہئے چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”وان كان الحوض مدورا يعتبر ثمانيه واربعون ذراعا كذا في الخلاصة وهو

الاحوط كذا في محيط السرخسي.“^۵

^۱ موطاء امام مالك عن يحيى بن عبد الرحمن

^۲ موطاء امام مالك عن يحيى بن عبد الرحمن

^۳ المغنی: ۶۲/۱، فصل: ۹۷، بخاری: ۱/ باب وضوء الرجل مع امراته الخ

^۴ الفتاویٰ الہندیہ: ۱۸/۱

^۵ رد المحتار: ۱۴۲/۱

^۶ دیکھئے: المغنی: ۱/ بحوالہ بخاری ومسلم

پمپنگ سٹ سے کنویں کی صفائی

بعض حالات میں پورے کنویں کا انخلاء ضروری ہوتا ہے، بعض حالات میں کچھ مخصوص ڈول مثلاً ۲۰، ۳۰، ۵۰ وغیرہ نکالے جاتے ہیں اور ان تمام صورتوں میں حکم یہ ہے کہ پہلے نجاست نکال لی جائے۔ اس طرح اگر پورے کنویں کا پانی کھینچنا ممکن نہ ہو تو آبادی کے عام کنوؤں کی گہرائی کا اندازہ کر کے اتنے ڈول پانی نکالا جائے فقہاء نے اپنے یہاں کے حالات کے لحاظ سے اس کا تخمینہ دوسو ڈول کیا ہے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ہندستان کے لحاظ سے تین سو ڈول کا۔

ان تمام صورتوں میں اصل مقصود ڈول نہیں ہے بلکہ پانی کی مطلوبہ مقدار ہے۔ لہذا اگر نجاست نکلنے کے بعد پمپنگ موٹر کے ذریعہ اتنی مقدار پانی تخمیناً نکال دیا جائے تو درست بلکہ نسبتاً زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ کنویں کا خالی کرنا زیادہ آسان اور بہتر ہے۔

حوض اور ٹنکیوں کی تطہیر

چھوٹے اور گھریلو حوض یا ٹنکیوں میں نجاست گر جائے تو اس کا کیا حکم ہوگا وہ پاک رہے گا یا ناپاک؟ اور اگر ناپاک ہو جائے تو پاک کرنے کی کیا صورت ہے؟ اس سلسلہ میں پہلے دو فقہی اصول سمجھ لینے چاہئیں۔ پانی دو طرح کا ہوتا ہے۔ بہتا ہوا یعنی ”جاری“ اور ٹھہرا ہوا یعنی ”راکد“ پھر یہ ٹھہرا ہوا پانی بھی یا تو زیادہ مقدار میں ہوگا یا کم۔ اگر کم ہے تو تھوڑی سی بھی نجاست گر جائے پانی ناپاک ہو جائے گا چاہے اس نے پانی کے اوصاف، رنگ، بو، مزہ میں کوئی تبدیلی پیدا کی ہو یا نہ کی ہو۔ اور اگر پانی جاری یا کثیر مقدار میں ہے تو تھوڑی بہت نجاست گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ ہاں اگر اتنی مقدار میں نجاست گر جائے کہ پانی کے اوصاف ہی بدل جائیں تو اب پانی ناپاک ہو جائے گا۔ پھر پانی کی کثیر یا قلیل مقدار کا تعین ایک مشکل بات تھی اس لئے فقہاء احناف نے اس کے لئے ایک مخصوص اور واضح حد متعین کر دی کہ اگر حوض دس ہاتھ لمبا اور چوڑا ہو یا دوسرے لفظوں میں وہ درودہ ہو تو یہ کثیر ہوگا اور اتنی مقدار میں نہ ہو تو قلیل، اسی پر فتویٰ ہے۔^۱

اب یہ پانی کی ٹنکیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جس میں دو طرف سے پمپ ہوں ایک طرف سے پانی کی آمد اور دوسری طرف سے نکاسی کا تسلسل ہو تو یہ جاری پانی کے حکم میں ہے، پانی ناپاک ہی نہ ہوگا اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ کسی ایک طرف سے ٹنکی بند ہو، صرف پانی کی آمد یا پانی کی نکاسی کا سلسلہ ہو لیکن مقدار میں وہ درودہ ہو تو اب بھی پانی کثیر ہونے کی وجہ سے ناپاک نہ ہوگا۔ سوائے اس کے کہ اوصاف ہی بدل جائیں۔ ہاں اگر ٹنکی

مقدار میں بھی چھوٹی ہو اور پانی کی آمد و رفت کا تسلسل بھی نہ ہو تو تھوڑی سی بھی نجاست کیوں نہ گرے پانی ناپاک ہو جائے گا۔ اس کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس ٹنکی میں نجاست گری ہے اس میں ایک طرف سے پانی داخل کیا جائے اور دوسری طرف سے نکال دیا جائے۔ جوں ہی پانی نکل جائے ٹنکی پاک ہو جائے گی۔ البتہ اگر کوئی ”ذی جسم“ نجاست گری ہو مثلاً مردہ جانور وغیرہ تو ضروری ہوگا کہ اس عمل سے پہلے اس نجاست کو نکال دیا جائے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”اذا كان الحوض صغيرا يدخل فيه الماء من جانب ويخرج من جانب يجوز الوضوء فيه من جميع جوانبه، حوض صغير متنجس ماء ه فدخل الماء الطاهر فيه من جانب وسال ماء الحوض من جانب آخر كان الفقيه ابو جعفر يقول كما سال ماء الحوض من الجانب الاخر يحكم بطهارة الحوض.“^{۱۷}

ترجمہ: ”جب حوض چھوٹا ہو، اس میں ایک طرف سے پانی داخل ہو اور دوسری طرف سے نکلے تو ہر طرف سے وضو کرنا درست ہوگا..... چھوٹا حوض جس کا پانی ناپاک ہو پھر اس میں ایک طرف سے پاک پانی داخل ہو اور دوسری جانب سے بہہ جائے تو فقیہ ابو جعفر کہتے تھے کہ جیسے ہی پانی دوسری جانب سے بہہ جائے حوض کے پاک ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔“

پیشاب کا نمک

پیشاب کو پکا کر اس کی ”شوریت“ کو نکال کر نمک بنا دیا جاتا ہے، اس نمک کا کھانا درست ہوگا یا نہیں؟..... اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک اصول سمجھ لینا چاہئے دو چیزیں ہیں اور دونوں کے احکام جدا گانہ ہیں۔ ایک ہے حقیقت کا بدل جانا، جس کو فقہاء ”استحالة“ وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں، دوسرے ایک شئی کے مختلف اجزاء کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دینا جس کو ”تجزیہ“ کہا جاسکتا ہے۔ کسی شئی کی حقیقت بدل جائے تو احکام بدل جاتے ہیں، مگر محض ”تجزیہ“ سے احکام نہیں بدلتے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہاں حقیقت ہی بدل گئی ہے یا صرف مختلف اجزاء ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے نمک کو بھی الگ کر دیا گیا ہے..... زیر بحث مسئلہ میں اس کا کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ اس کو ناپاک اور حرام ہی سمجھا جائے۔

^{۱۷} فتاویٰ عالمگیری: ۱/۱۷۱۔ آگے غسل خانے کی ٹنکیوں کے بارے میں مزید احکام مذکور ہیں۔

پتھر کوئلہ پر تیمم

کوئلہ پر تیمم کرنا درست نہیں ہے، لیکن پتھر کوئلہ چونکہ ایک درجہ میں ”پتھر“ ہے اور جلے ہوئے پتھر پر بھی فقہاء نے تیمم کی اجازت دی ہے۔ اس لئے تیمم کیا جاسکتا ہے۔ ”الارماد الحجر فیجوز کحجر مدقوق“^۱۔
 ”سوائے پتھر کوئلہ کے کہ وہ باریک کوئلے ہوئے پتھر کی طرح جائز ہے۔“
 البتہ اگر دوسری کوئی شئی تیمم کے قابل موجود ہو تو بہتر ہے کہ اس پر تیمم کرے۔

صابن میں ناپاک اشیاء ڈالنا

مغربی ممالک سے جو صابن آتے ہیں ان کے بارے میں کبھی کبھی اس قسم کی اطلاعات بھی سننے کو ملتی ہیں کہ ان میں بعض ناپاک اجزاء سور کی چربی وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اول تو یہ یقینی اور معتبر اطلاع نہیں ہوتی۔ محض ظن و گمان کے درجہ کی چیز ہوتی ہے اور شریعت اس قسم کے اندیشہ ہائے دور دراز کو پسند نہیں کرتی۔
 دوسرے فقہاء نے اس کو دو وجوہ سے پاک قرار دیا ہے۔ ایک یہ کہ ایسے ناپاک اجزاء صابن میں مل کر اپنی اصلی حقیقت کھودیتے ہیں اور کوئی ناپاک شئی جب اس حد تک بدل جائے کہ اپنی اصلی حقیقت ہی کھودے تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مثلاً منی ناپاک ہے وہ خون بن جائے تو بھی ناپاک ہے۔ اس کے بعد جب گوشت بن جائے تو اب پاک ہے کہ حقیقت بدل چکی ہے۔ مشک ناپاک خون ہے لیکن جب مشک بن گیا تو پاک ہے۔ غیر ماکول اللحم جانوروں کی ہڈیاں بھی حرام ہیں، مگر جب ان کا نمک بنا دیا گیا تو اب حلال ہیں۔
 دوسرے اس کے استعمال کی اس قدر کثرت ہے کہ اس سے احتراز دشوار ہے۔ ایسی چیز کو فقہاء کی اصطلاح میں ”عموم بلوی“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے حکم میں ایک گونہ نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا تقاضا بھی ہے کہ ایسے صابنوں کا استعمال جائز اور درست ہو۔ علامہ شامی کا بیان ہے:

”جعل الدهن النجس فی صابون یفتی بطهارته لانه تغیر والتغیر یطهر عند

محمد ویفتی به للبلوی۔“^۲

ترجمہ: ”ناپاک تیل صابن میں ڈالا جائے تو اس کے پاک ہونے کا فتویٰ دیا جائے گا۔ اس لئے

کہ وہ تغیر ہے اور تغیر امام محمد رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک پاکی کا باعث ہے اور ابتلاء عام کی وجہ سے

اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔“

^۱ رد المحتار: ۲۱۰/۱ نیز دیکھئے البحر الرائق: ۲۲۷/۱

^۲ الدر المختار: ۱۶۰/۱

ناپاک چیزوں کی تقطیر

بعض یونانی اور آیور ویدک دواؤں کے لئے تقطیر کا عمل کیا جاتا ہے یعنی جس چیز کے قطرات حاصل کرنے ہوں اس کو ابالتے ہوئے اوپر کوئی ایسی چیز رکھ دی جاتی ہے جو نکلنے والے بھاپ کو قطرات کی شکل میں محفوظ کر لے..... اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ اگر ناپاک چیز پر عمل تقطیر کیا جائے تو اس سے حاصل ہونے والے قطرات بھی ناپاک ہی شمار ہوں گے فقہاء لکھتے ہیں:

”فلوا ستقطرا لنجاسة فمائيتها نجسة لانتفاء الضرورة.“^۱

ترجمہ: ”اگر کسی ناپاک چیز پر عمل تقطیر کیا، تو اس سے حاصل شدہ پانی ناپاک ہوگا۔“

دونی میں جانور پیشاب کر دے

ہندوپاک میں دیہات اور قریہ جات کے علاقہ میں دانہ کو پودے سے الگ کرنے کے لئے اب بھی جانوروں کے ذریعہ روندنے کا قدیم طریقہ مروج ہے، جس کو دونی اور بعض علاقوں میں کچھ اور نام دیا جاتا ہے، دونی کے درمیان بعض اوقات جانور پیشاب کر دیتے ہیں، اگر پیشاب دہان پر کیا گیا ہو اور معمولی مقدار میں ہو تب تو چاول تک اس کا اثر نہیں پہنچتا اس لئے اس کے پاک ہونے میں کوئی کلام نہیں، لیکن اگر معاملہ گیہوں کا ہو تو ایسی صورت میں نجاست کا اثر فوراً دانے میں پہنچتا ہے، اور یہ ایسی دشواری ہے جس سے بچنا نہایت مشکل ہے۔

اس لئے فقہاء نے اس کے لئے ازراہ ضرورت ایک تدبیر بتائی ہے کہ چونکہ پیشاب زدہ حصہ معلوم نہیں اس لئے تھوڑا سا گیہوں نکال کر دھولیا جائے اور پھر اسے پورے غلہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو یہ پورا غلہ پاک متصور ہوگا۔

”الحنطة تداس بالحمز تبول وتروث ويصيب بعض الحنطة ويختلط ما اصاب

منها بغيره قالوا لو عزل بعضها وغسل ثم خلط الكل ابيح تناولها.“^۲

ترجمہ: ”گیہوں کی جانوروں کی ذریعہ دونی کی جاتی ہے، جانور پیشاب، پاخانہ کر دیتے ہیں، گیہوں کے کچھ حصہ میں اس کا اثر پہنچ جاتا ہے، پھر نجاست میں ملوث وہی حصہ گیہوں کے دوسرے حصوں سے رل مل جاتا ہے، فقہاء کہتے ہیں کہ اگر اس میں سے کچھ حصہ کو علاحدہ کر کے دھو دے اور پھر پورے گیہوں کو ملا دے تو اس کا استعمال مباح ہے۔“

^۱ ہندیہ: ۵۰/۱ نیز دیکھئے مجمع الانہر: ۶۴/۱

^۲ کبیری: ۱۹۱ نیز ملاحظہ ہو رد المحتار: ۲۳۸/۱

ڈرنج سے قریب کنواں یا بورنگ

جس مقام پر بیت الخلاء کا ٹینک بنا ہوا ہو یا ڈرنج کی نالیاں جہاں سے گزرتی ہوں وہاں کتنی دوری پر کنواں کھودا جاسکتا ہے، یا پائپ کیا جاسکتا ہے؟ یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے، بعض فقہاء نے ایسی گندی جگہوں سے پانچ یا سات ہاتھ کے فاصلے سے کنواں کھودنے کی اجازت دی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمین کی سختی و نرمی کے لحاظ سے یہ مقدار مختلف ہو سکتی ہے، لہذا ماہرین ارضیات اور تجربہ کار حضرات جتنا فاصلہ بتلائیں اتنے فاصلہ سے کنواں وغیرہ کھودنا چاہئے، علامہ شامی کا بیان ہے۔

”والحاصل انه یختلف بحسب رخاوة الارض وصلابتها، ومن قدره اعتبر حال ارضه.“^۱

ترجمہ: ”حاصل یہ کہ زمین کی نرمی اور سختی کے لحاظ سے یہ مختلف ہو سکتی ہے اور جس نے بھی مقدار مقرر کی ہے، انہوں نے اپنے یہاں کی زمینی کیفیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقرر کی ہے۔“
اگر مناسب فاصلہ قائم نہ رکھا گیا اور کنویں کے پانی میں بو، مزا، یا رنگ کو متغیر اور نجاست سے متاثر پایا گیا تو یہ پانی ناپاک ہوگا۔

”بئر الماء اذا كانت بقرب البئر النجسة فهي طاهرة مالم یتغیر طعمه اولونه اور ریحہ.“^۲
ترجمہ: ”پانی کا کنواں اگر ناپاک کنویں کے قریب ہو تو جب تک کہ اس کا رنگ بو اور مزہ نہ بدل دے، اس کا پانی پاک رہے گا۔“

چھتوں میں گوبر کا استعمال

بعض مقامات پر چھتوں کی تعمیر میں گوبر کا استعمال کیا جاتا ہے اور یہی معاملہ مسجد کی چھتوں کے ساتھ ہوتا ہے، اگر گوبر کا کوئی متبادل موجود ہو تو خصوصیت سے مسجد کی چھتوں میں اس سے اجتناب برتنا چاہئے، لیکن اگر چھت کی مضبوطی اور اس کے استحکام کے لئے اس کی ضرورت ہو تو گوبر کا استعمال کیا جاسکتا ہے، علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

”وفی التجنیس اذا نزع الماء النجس من البئر یکره ان یسل به الطین ویطین به فی المسجد او ارضه لنجاسته بخلاف السرقین اذا جعله فی الطین لان فی ذالك ضرورة لانه لا یتھیأ الا بذالك.“^۳

^۱ رد المحتار: ۱/۱۶۳

^۲ تانار خانہ: ۱/۱۹۹

^۳ البحر الرائق: ۱/۱۲۲، وکذا فی الفتاوی السراجیہ: ۷۱

تَرْجَمًا: ”تجنیس میں مذکور ہے کہ اگر کنویں سے ناپاک پانی نکالا جائے تو اس سے مٹی تر کرنا اور اس ترکی ہوئی مٹی سے مسجد یا اس کی زمین لیپنا مکروہ ہے۔ برخلاف مٹی میں ملائے ہوئے گوبر کے کہ اس میں ضرورت ہے، اس لئے کہ وہ اس کے بغیر قابل استعمال نہیں ہو پاتا ہے۔“

گوبر سے لیپائی

دیہات و قریہ جات میں گوبر سے مٹی کے مکانات لیپنے کا رواج عام ہے، سوال یہ ہے کہ اس طرح لیپا ہوا مکان پاک رہے گا یا ناپاک؟ اور اس پر نماز پڑھنی درست ہوگی یا نہیں؟..... اس کا جواب اس پر موقوف ہے کہ گوبر کا کیا حکم ہے؟ فقہاء کے یہاں اس مسئلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے، امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اور ابو یوسف رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک گوبر نجاست خفیفہ ہے، البتہ امام مالک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ابتلاء عام کی وجہ سے پاک قرار دیا ہے۔

”عندہما مخففة لا خلاف العلماء اذا ختلاف العلماء يورث التخفيف

عندہما، فان مالکایری طہارتہ لعموم البلوی۔“^۱

تَرْجَمًا: ”علماء کے مابین اختلاف کی وجہ سے شیخین کے یہاں گوبر نجاست خفیفہ ہے، اس لئے کہ کسی شی کی طہارت و نجاست میں علماء کا اختلاف اس کو ”خفیفہ“ کر دیتا ہے، چنانچہ امام مالک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی عموم بلوی کے پیش نظر گوبر کی طہارت کے قائل ہیں۔“

فتویٰ بھی اس مسئلہ میں اس کے نجاست خفیفہ ہونے ہی پر ہے، لیکن امام محمد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے بارے میں بھی منقول ہے کہ انہوں نے آخر زمانہ میں ابتلاء عام اور لوگوں کی مشقت کو دیکھتے ہوئے گوبر کو پاک قرار دیا تھا۔^۲ لہذا خیال ہوتا ہے کہ اہل شہر کے لئے تو یہ ناپاک ہی ہے، لیکن ایسے علاقے جہاں اس طرح گوبر کے استعمال کا عام رواج ہو، وہاں اس پر نماز پڑھنا درست ہوگا، یہ تو اس صورت میں جب کہ گوبر کے لیپ پر پھر مٹی کا لیپ نہ کیا جائے، اگر گوبر سے لیپی ہوئی زمین کو مٹی سے پھر لیپ دیا جائے کہ گوبر چھپ جائے اور اس کی بو محسوس نہ ہو، تب تو یوں ہی زمین پاک ہی ہوگی۔

ناپاک چیز کے عمل تقطیر سے حاصل ہونے والے قطرات

یونانی دواؤں کی تیاری کے لئے زمانہ قدیم سے جو طریقے مروج ہیں ان میں ایک ”عمل تقطیر“ بھی ہے۔ عمل تقطیر سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو گرم کیا اور جوش دیا جائے اس سے جو بھانپ اٹھے اس کے قطرات کو محفوظ

کر لیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی ایسی چیز کو جوش دیا گیا جو ناپاک ہے اس کے قطرات جمع ہو گئے اور ازراہ علاج بیرونی طور پر ان کا استعمال کیا گیا یا یونہی کپڑے وغیرہ میں لگ جائے تو یہ قطرات پاک سمجھے جائیں گے یا ناپاک؟

فقہاء کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ گو اس سلسلہ میں دونوں طرح کے اقوال ہیں پاک ہونے کے بھی اور ناپاک ہونے کے بھی۔ لیکن صحیح اور رائج قول یہی ہے کہ ان کو پاک سمجھا جائے گا۔ علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”وما یصیب الثوب من بخارات النجاسة قبل پنجسہ وقیل لا وهو الصحیح۔“
 تَرْجَمًا: ”نجاست کے جو بخارات کپڑوں میں لگ جائیں تو بعض حضرات کی رائے ہے کہ وہ ناپاک ہو جائے گا اور بعض حضرات کی رائے اس کے خلاف ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔“

نماز

جن نمازوں کے اوقات نہ آئیں!

اسلام میں اکثر عبادات اوقات سے متعلق ہیں۔ ان میں نماز تو ایسی عبادت ہے جو دن اور رات میں پانچ بار پڑھی جاتی ہے، جن میں دو نمازیں سورج کے روشن ہوتے ہوئے ادا ہوتی ہیں، دو رات میں، ایک رات ختم ہونے اور سورج طلوع کے درمیان، صورت حال یہ ہے کہ سورج کے طلوع و غروب کے اعتبار سے بعض علاقے غیر معتدل واقع ہوئے ہیں۔ یہ تین طرح کے ہیں: ایک وہ ہیں جہاں سورج غروب ہونے کے بعد تھوڑے وقفہ کے بعد ہی شفق پر صبح طلوع ہو جاتی ہے، گویا یہاں فجر کا وقت ملتا ہے، ظہر عصر کے اوقات بھی ملتے ہیں، البتہ مغرب اور عشاء کے لئے بہت معمولی وقت مل پاتا ہے، اسی میں مغرب اور عشاء ادا کر لی جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی شفق پر صبح کی سفیدی پھیل جائے یا غروب ہونے کے ساتھ ہی سورج نکل آئے، ان صورتوں میں مغرب و عشاء یا عشاء اور فجر کا وقت ہی نہیں مل پاتا ہے۔ تیسری صورت ان مقامات کی ہے جہاں کئی کئی ماہ سورج غروب نہیں ہوتا یا غروب ہونے کے بعد طلوع

نہیں ہوتا، جیسا کہ فقہاء نے مقام بلغار وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن نمازوں کے اوقات ہی نہ آئیں وہ نمازیں فرض ہوں گی یا نہیں؟ اور اگر فرض ہیں تو ان کی ادائیگی کی کیا صورت ہو گی؟

ان نمازوں کی فرضیت کے بارے میں دو نقاط نظر پائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ جن نمازوں کے اوقات نہیں آئیں، ان کی فرضیت ساقط ہو جائے گی، یہ رائے، شرنبلالی، طحاویؒ صاحب کنز، صاحب درر، بقالی، حلوانی، مرغینانی اور حلبی رحمہم اللہ تعالیٰ کی ہے۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس صورت میں بھی نماز پنجگانہ کی فرضیت باقی رہے گی، مشائخ حنفیہ میں برہان کبیر، علامہ ابن ہمام، ابن شحنہ، حنفی اور شامی رحمہم اللہ تعالیٰ کا رجحان اسی طرف ہے۔ پہلے نقطہ نظر کی دلیل یہ ہے کہ شریعت میں اوقات کی حیثیت محل اور ظرف کی ہے اور جب کسی چیز کا محل ہی باقی نہ رہے تو اس کو واجب قرار دینے کا کوئی معنی نہیں جیسے اگر کسی شخص کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں تو ظاہر ہے وضو میں ہاتھ پاؤں دھونے کا حکم ساقط ہو جائے گا۔ اسی طرح جن نمازوں کے اوقات نہ آتے ہوں، ان نمازوں کا وجوب بھی ساقط ہو جائے گا۔

جو حضرات وقت کے نہ پائے جانے کے باوجود نماز کے وجوب کے قائل ہیں، ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علاقہ و مقام کی تفریق کے بغیر تمام کرہ ارض میں رہنے والے مسلمانوں پر پانچوں نمازیں فرض قرار دی ہیں، اس لئے کسی خاص علاقہ میں رہنے والے مسلمانوں سے ان میں سے کوئی نماز ساقط نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔ ان حضرات کی ایک اہم دلیل حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے جس میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دجال کے ظہور کے وقت ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا، حضور ﷺ کی اس پیش گوئی پر ایک صحابی کا سوال وجواب اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

”قلنا یا رسول اللہ فذالك اليوم الذي كسنة ايكفينا فيه صلوة يوم قال لا

اقدروا له قدره۔“

ترجمہ: ”ہم لوگوں نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! جس وقت دن سال کے

مساوی ہوگا، تو کیا اس روز ہمارے لئے ایک دن کی نماز ادا کر لینا کفایت کر جائے گا؟ آپ

ﷺ نے فرمایا: ”نہیں وقت کا حساب لگا لو۔“

واقعہ یہ ہے کہ کتاب و سنت اور دین کے مجموعی مزاج سے زیادہ قریب یہی دوسری رائے ہے کہ اوقات نہ

۱/۲۴۲، فتح القدیر: ۱/۲۲۴ ۲۶۶ ص: ۹۶ الدر المختار علی هامش الرد:

۱/۲۴۳ صحیح مسلم عن نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۲/۴۰۱ باب ذکر الدجال ط: دیوبند

ملنے کے باوجود بھی ہر مسلمان پر نماز پنجگانہ فرض ہونی چاہئے۔ بقالی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی وغیرہ کے استدلال پر علامہ ابن ہمام رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

”ولا یرتاب متأمل فی ثبوت الفرق بین عدم محل الفرض و بین سببہ الجعلی الذی جعل علامة علی الوجوب الخفی الثابت فی نفس الأمر وجواز تعدد المعارف للشیء فانتفاء الوقت انتفاء المعرف وانتفاء الدلیل علی شیء لایستلزم انتفاء لجواز دلیل آخر وقد وجد.“^۱

ترجمہ: ”کسی صاحب نظر کو اس بات میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ محل فرض کے نہ پائے جانے اور اس کے جعلی سبب..... جس کو کسی مخفی لیکن نفس الامر میں ثابت شیء کی علامت قرار دیا گیا ہو..... کے نہ پائے جانے کے درمیان فرق ہے، ایک شیء کی متعدد پہچان ہو سکتی ہے، لہذا ایک دلیل کا مفقود ہونا اس چیز کے جائز نہ ہونے کی دلیل نہیں، کیوں کہ ممکن ہے کہ اس کے جواز کی کوئی اور دلیل موجود ہو۔“

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایسے مقامات پر کس طرح نماز ادا کی جائے؟ تو اس سلسلہ میں علامہ شامی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے دو طریقے نقل کئے ہیں ایک یہ کہ اس سے قریب ترین جگہ (جہاں حسب عادت شب و روز کا ظہور ہوتا ہو) کے اوقات کی رعایت کی جائے۔ شامی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے اس کی نسبت شوافع کی طرف کی ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ اسی مقام کے لحاظ سے وقت کا اندازہ کر کے نمازیں ادا کی جائیں شاید اس کا مقصد یہ ہے کہ خود اس مقام پر ان دنوں میں..... جب کہ دن و رات کی آمد و رفت رہی ہو..... اوقات نماز کے درمیان جو تناسب اور تفاوت رہا ہو، اسی فاصلہ کے ساتھ نمازیں ادا کی جائیں..... خیال ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہی طریقے قابل عمل ہیں بشرطیکہ کوئی تضاد کی صورت پیدا نہ ہوتی ہو، مثلاً ایسے غیر معتدل علاقوں میں جس وقت تھوڑی دیر کے لئے سورج غروب ہوتا ہو اسی وقت وہاں سے قریب ترین معتدل الاوقات علاقہ میں فجر کا وقت ہو، ظاہر ہے کہ یہاں غروب آفتاب کے وقت نماز فجر ادا نہیں کی جاسکتی اس لئے اگر کہیں شفق ڈوبنے سے پہلے ہی فجر طلوع ہو جائے تو قضاء کی نیت سے نماز عشاء پڑھ لی جائے چنانچہ تاتارخانیہ میں ہے:

”وفی الظہیریۃ الصحیح انہ ینوی القضاء لفقد وقت الاداء.“^۲

اوقات نماز میں تقویم کی رعایت

ہمارے زمانے میں عموماً اوقات نماز کا تعین تقویم سے ہوتا ہے اور تقویم کی بنیاد جدید فلکیاتی علم

^۱ فتح القدیر: ۲۲۴/۱ ^۲ رد المحتار: ۳۴۱/۱ ^۳ تاتارخانیہ: ۴۰۴/۱

(ASTRONOMY) پر ہوتی ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ وسائل اور ذرائع مقصود نہیں ہوتے بلکہ مطلوب خود مقاصد ہیں۔ اسلام نے اوقات کی بنیاد آفتابی سایوں، طلوع وغروب، شفق اور ظاہری آثار پر رکھی ہے اس لئے کہ یہ ایسے معیار ہیں جن کو سمجھنا ہر عام و خاص کو آسان ہے اور یہ ہر کسی کو دستیاب ہیں۔ مگر ان کی حیثیت فقط علامات کی ہے۔ اگر دوسرے ذریعہ سے گمان غالب ہو جائے کہ شریعت کا مطلوبہ وقت آپہنچا ہے تو اس پر عمل کر لینا کافی ہوگا..... تقویم کی یہی حیثیت ہے اور جدید ترقی یافتہ فلکیات کم از کم اس بات کا ظن غالب پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔

قبلہ نما کی شرعی حیثیت

نماز کی شرطوں میں سے ایک شرط ”قبلہ کا استقبال“ ہے۔ کعبہ جن کی نگاہوں کے سامنے نہ ہو ان کے لئے یہ بات ضروری نہیں کہ بعینہ قبلہ ان کے سامنے پڑے بلکہ یہ بات کافی ہے کہ ان کی نماز قبلہ کی سمت اور جہت میں ہو۔^۱

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت اس معاملہ میں سہولت اور آسانی برتنا چاہتی ہے۔ اس لئے کسی بھی ایسی صورت پر، جس سے غالب گمان جہت کعبہ کے استقبال کا ہو جائے۔ عمل کر لینا کافی ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اس بات کو کافی قرار دیا گیا ہے کہ پہلے سے تعمیر شدہ مساجد اور محرابوں کو بنیاد بنا کر یا ستاروں کو دیکھ کر سمت قبلہ کا تعین کیا جائے۔

”جہۃ الکعبۃ تعرف بالدلیل فی الامصار والقری المحاریب الی نصبھا الصحابہ والتابعون فعلینا اتباعہم فان لم تکن فالسؤال من اهل ذالک الموضع وامافی البحار والمفاوز فالدلیل القبلة النجوم۔“^۲

ترجمہ: ”جہت کعبہ دلیل سے سمجھی جاسکتی ہے اور شہروں اور دیہاتوں میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی نصب کی ہوئی محرابیں ہمارے لئے بدرجہ دلیل ہیں اور ہمارے ذمہ اسی کی پیروی ہے۔ پھر اگر یہ محرابیں نہ ہوں تو اس مقام کے قبلہ کی بابت دریافت کرنا چاہئے اور جہاں تک سمندروں اور میدانوں کی بابت ہے تو وہاں قبلہ کے لئے دلیل ”تارے“ ہیں۔“

قبلہ نما اس بات کا گمان غالب پیدا کرنے کے لئے کافی ہے جیسا کہ مختلف جہات اور سمتوں کو بتانے والے آلات کے تجربے اور استعمال سے اندازہ ہوتا ہے۔

^۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۶۳ فصل فی استقبال القبلة، ط: دارصادر بیروت

^۲ بدائع الصنائع: ۱/۱۸۸

ٹرین اور بس میں استقبال قبلہ

ٹرین اپنی وضع کے لحاظ سے اس نوعیت کی ہے کہ اس میں قبلہ کا استقبال کیا جاسکتا ہے اور درمیان میں اگر انحراف پیدا ہو جائے تو قبلہ درست بھی کیا جاسکتا ہے اس لئے ٹرین میں فرض نمازوں کے آغاز کے وقت بھی اور دوران نماز بھی قبلہ کا استقبال ضروری ہے۔ اگر نماز قبلہ رخ ہو کر شروع کی، درمیان میں ٹرین یا بس نے رخ بدلاتو اپنا رخ بھی بدل لینا چاہئے اور اس کی نظیر فقہ کا وہ جزئیہ ہے جو لنگر انداز کشتی کے متعلق فقہاء نے لکھا ہے:

”والمربوطة بلجة البحر ان كان الريح يحركها شديدا فكالسائرة والافكالوا

قفة ويلزم استقبال القبلة عند الافتتاح وكلما دارت۔“^۱

ترجمہ: ”کشتی اگر تیز ہوا کی وجہ سے بہت متحرک ہو تو چلتی ہوئی کشتی کے حکم میں ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو ٹھہری ہوئی کشتی کے حکم میں ہے، نیز قبلہ کا استقبال نماز کے افتتاح کے وقت بھی ضروری ہوگا اور اس وقت بھی جب وہ مڑے۔“

ہاں اگر اس قدر اثر دھام ہو کہ مڑنا ممکن نہ ہو اور ریل سے باہر نکل کر نماز کی ادائیگی کا موقع نہ ہو تو پڑھ سکتے ہیں۔ مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۱۲۷۵-۱۳۳۷ھ) کے بقول:

”اگر فی الحقیقت ہجوم اس قدر باشد کہ حرکت رکوع وسجود ممکن نیست ونیز بر صلوٰۃ از خارج ریل قادر نیست، بلا استقبال وبلا قیام ادا کنند۔“^۲

بسوں کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اگر بس سمت قبلہ میں نہ جا رہی ہو تو قبلہ کا استقبال نہیں کیا جاسکتا، ایسی صورت میں اگر بس ٹھہری ہوئی ہو تو نیچے اتر کر نماز پڑھنا واجب ہے، چل رہی ہو مگر سوار رکوا سکتا ہو تو اب بھی اتر کر استقبال قبلہ کے ساتھ نماز ادا کرے اور سوار رکوانے پر قادر نہ ہو تو استقبال کے بغیر نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ ابن ہمام کا بیان ہے:

”ولو كان على الدابة يخاف النزول للطين والردغة يستقبل قال في الظهيرية وعندى هذا اذا كانت واقفة، فان كانت سائرة يصلى حيث شاء، ولقائل ان يفصل بين كونه لو وقفها للصلوة خاف الانقطاع عن الرفقة اولا يخاف، فلا يجوز في الثاني الا ان يوقفها ويستقبل۔“^۳

ترجمہ: ”اگر سواری پر ہو اور مٹی کچڑ کی وجہ سے نیچے اترنے سے ڈرتا ہو تو سواری کے اوپر ہی

۱۔ الدر المختار علی هامش رد المحتار: ۷۱۴/۱ ۲۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱۴۶/۲ ۳۔ فتح القدیر: ۲۷۰/۱

استقبال قبلہ کرے، فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ میرے نزدیک یہ حکم اس وقت ہے جب کہ سواری رکی ہوئی ہو، اگر سواری چل رہی ہو تو جدھر چاہے نماز پڑھے اور یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس صورت میں کہ اگر نماز کے لئے روکے تو رفقاء سفر سے پیچھے رہ جائے اور اس صورت میں کہ پیچھے رہنے کا اندیشہ نہیں فرق کیا جانا چاہئے کہ دوسری صورت میں بغیر سواری روکے اور استقبال قبلہ کئے ہوئے نماز درست نہ ہوگی۔“

نیز ابن قدامہ کا بیان ہے:

”وَحُكْمُ الصَّلَاةِ عَلَى الرَّاحِلَةِ حُكْمُ الصَّلَاةِ فِي الْخَوْفِ فِي أَنَّهُ يُؤْمَى بِالرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ وَيَجْعَلُ السُّجُودَ أَخْفَضَ مِنَ الرُّكُوعِ قَالَ جَابِرٌ بَعَثَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَاجَةٍ فَجِئْتُ وَهُوَ يَصَلِّي عَلَى رَاحِلَتِهِ نَحْوَ الْمَشْرِقِ وَالسُّجُودَ أَخْفَضَ مِنَ الرُّكُوعِ.“^۱

ترجمہ: ”سواری پر نماز پڑھنے کا حکم وہی ہے جو خوف کی حالت میں نماز پڑھنے کا حکم ہے کہ رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرے اور سجدہ کو رکوع سے نسبتاً پست رکھے، حضرت جابر رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک ضرورت سے بلایا۔ میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ ﷺ سواری پر پورب رخ نماز ادا کر رہے ہیں اور سجدہ کا اشارہ رکوع سے پست دیکھتے ہیں۔“

ہوائی جہاز میں نماز

زمین کی طرح ہوائی جہاز پر بھی نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ شریعت نے نہ صرف خانہ کعبہ بلکہ اس کے مقابل آنے والی پوری فضا کو قبلہ کا درجہ دیا ہے تاکہ اونچی سے اونچی اور بلند سے بلند جگہ نماز ادا کی جاسکے۔ شیخ عبدالرحمن الجزیری مصری رَحِمَهُ اللہُ تَعَالَى نے بھی ہوائی جہاز کو کشتی پر قیاس کرتے ہوئے اس میں نماز کو درست قرار دیا ہے:

”وَمِثْلُ السَّفِينَةِ الْقَطْرِ الْبَخَّارِيَّةِ وَالطَّائِرَاتِ الْجَوِيَّةِ وَنَحْوَهَا.“^۲

اب رہی یہ بات کہ سجدہ زمین پر پیشانی ٹیکنے (وَضْعُ الْجَبْهَةِ عَلَى الْأَرْضِ) کا نام ہے اور ہوائی جہاز میں یہ بات نہیں پائی جاتی تو اس قسم کے تکلفات واقعہ ہے کہ شریعت کی روح سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ یہ بالکل ایک اتفاقی بات ہے کہ چونکہ عام طور پر زمین پر ہی پیشانی ٹیکنے کی نوبت آتی ہے اس لئے فقہاء نے زمین

^۱ کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعہ: ۲۰۶/۱ دار احیاء التراث العربی بیروت

^۲ المغنی: ۲۶۰/۱

(ارض) کا لفظ استعمال کیا ہے، یہ ٹھیک اس طرح ہے جیسے کوئی شخص کہے ”روئے ارض پر اسلام سے بہتر کوئی دین نہیں“..... کیا اس سے یہ بات سمجھی جائے گی کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ چاند پر اس سے بہتر ایک اور دین موجود ہے؟

شریعت کا اصل منشاء یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز ہو جس پر انسان کی پیشانی ٹک سکے۔ چنانچہ کشتی میں نماز کی اجازت دی گئی حالاں کہ سطح زمین اور کشتی کے درمیان پانی کا ایک بے پناہ فاصلہ موجود ہے..... اس لئے ہوائی جہاز پر اسی طرح نماز کی ادائیگی درست ہے جس طرح زمین پر، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

سمندری جہاز میں نماز

سمندری جہاز اور اسٹیمر کو بڑی حد تک کشتی سے مماثلت حاصل ہے فقہاء نے کشتی میں نماز کے متعلق جو احکام ذکر کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

- ۱ کشتی اگر ساحل سے بندھی ہو، پرسکون حالت میں ہو اور کھڑے ہو کر اس میں نماز ادا کرنی ممکن ہو تو کشتی ہی میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرے۔
- ۲ کشتی ساحل سے بندھی ہو لیکن پرسکون حالت میں نہ ہو، کھڑے ہو کر نماز ادا کرنی ممکن نہ ہو نیز یہ بھی ممکن ہو کہ باہر نکل کر نماز ادا کرے تو اس میں نماز درست نہ ہوگی۔
- ۳ کشتی چل رہی ہو کھڑے ہونے پر قادر نہ ہو تو بیٹھ کر بالاتفاق نماز ادا کی جاسکتی ہے۔
- ۴ کشتی چل رہی ہو کھڑے ہونے پر قدرت ہو تو امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں بیٹھ کر بھی کراہت کے ساتھ نماز ہو جائے گی اور صاحبین رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ضروری ہوگا۔
- ۵ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں سرچکراتا ہو تو بالاتفاق بیٹھ کر نماز ادا کی جاسکتی ہے۔
- ۶ کشتی اگر ساحل سے لگی ہو مگر ساحل پر نکلنا ممکن نہیں تو اس کا حکم بھی چلتی ہوئی کشتی کا ہوگا کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہو تو اسی طرح پڑھے ورنہ بیٹھ کر۔
- ۷ استقبال قبلہ شروع سے آخر تک ضروری ہوگا۔ اگر قبلہ رخ ہو کر نماز کی ابتداء کی، درمیان میں رخ بدل گیا تو اپنا رخ بھی پھیر لے۔

اس طرح سمندری جہاز میں نماز کے حسب ذیل احکام ہوئے:

- ۱ طوفان وغیرہ کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز کی ادائیگی ممکن نہ ہو تو بالاتفاق بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔

- ۲ سرگرانی کے باعث کھڑا ہونا دشوار ہو تو بھی بیٹھ کر ہی نماز ادا کی جائے گی۔
- ۳ کھڑے ہو کر نماز ادا کی جاسکتی ہو تو صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے مسلک کے مطابق بیٹھ کر نماز درست نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے گوکہ کشتی میں بہ کراہت اس کی اجازت دی ہے مگر پانی کے جہاز میں چونکہ عذر اور اضطراب کشتی سے کم ہوتا ہے اس لئے کم از کم جہاز میں فتویٰ صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی ہی کی رائے پر ہونا چاہئے کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کرنی ضروری ہے۔
- ۴ استقبال قبلہ جہاز میں بھی ضروری ہوگا، نماز کے آغاز میں بھی اور درمیان میں بھی یعنی اگر درمیان میں رخ بدل گیا تو اپنا رخ درست کرنا ہوگا۔

ٹرین پر نماز

ٹرین اگر اسٹیشن پر رکی ہوئی ہو اور پلیٹ فارم پر نماز پڑھنا ممکن ہو اس کے باوجود ٹرین پر نماز ادا کی تو ایسا کرنا درست ہوگا کیوں کہ ٹرین کا تعلق بلا واسطہ زمین سے ہے اور اگر گاڑی براہ راست زمین پر ہو تو فقہاء نے اس کو زمین ہی کے حکم میں مانا ہے اور اس پر نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، چنانچہ علامہ شامی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”اذا كانت العجلة على الارض ولم يكن شيء منها على الدابة وانما لها حبل مثلاً تجرها الدابة به تصح الصلاة عليها لانها حينئذ كالسرير الموضوع على الارض.“^۱

تَرْجَمًا: ”اگر گاڑی زمین پر ہو اور اس کا کوئی حصہ جانور پر نہ ہو بلکہ اس سے رسی لگی ہو جسے جانور کھینچتا ہو تو اس پر نماز درست ہوگی کیوں کہ وہ زمین پر رکھے ہوئے تخت کے حکم میں ہے۔“

اسپینج وغیرہ کے گدوں پر سجدہ

سجدہ کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ ایسی جگہ پر سجدہ کیا جائے جہاں پیشانی اور ناک کا ٹکاؤ ہو سکے اور اگر وہ نرم و گداز جگہ ہو تو پیشانی رکھنے کے بعد بالآخر دباؤ اور سختی محسوس کی جائے۔

”ولو سجد على الحشيش او التبن او على القطن او الطنفسة او الثلج ان استقرت جبهته وانفه ويجد حجمه يجوز وان لم تستقرلا.“^۲

تَرْجَمًا: اگر کوئی شخص گھاس یا بھوسا یا روئی یا اسپینج یا برف پر سجدہ کرے اور اس کی پیشانی و ناک ٹک

جائے، اور ساتھ ہی اس کی سختی محسوس ہو تو سجدہ درست ہے اور اگر ٹھہر نہ سکے، تو نا درست ہے۔
روئی اور اسپنج کے گدوں کا حکم بھی اسی اصل پر مبنی ہے، اگر گدے اتنے نرم اور موٹے ہوں کہ ٹکاؤ نہ پیدا ہو جیسا کہ اسپنج کے موٹے گدوں میں ہوتا ہے تو اس پر سجدہ درست نہ ہوگا اور پیشانی وناک ٹک جاتی ہو اور کسی قدر سختی ایسی محسوس ہوتی ہو جو پیشانی وناک کے ٹکاؤ کی وجہ سے عام طور پر محسوس ہوتی ہے، تو اس پر سجدہ درست ہوگا۔

کئی مقامات سے اذان کی آواز آئے

لاؤڈ اسپیکر کی آسانی کی وجہ سے آج کل ایک ہی جگہ پر کئی مقامات کی اذان کی آواز پہنچتی ہے۔ اذان کا زبان سے جواب دینا اکثر فقہاء کے نزدیک مستحب اور بعضوں کے نزدیک واجب ہے۔^۱ تو کیا مذکورہ صورت میں سامعین کو ہر اذان کا جواب دینا ہوگا؟ یہ ایک مسئلہ ہے جس میں ابتلاء عام ہے۔ فقہاء کی تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو پہلی اذان کا جواب دینا چاہئے۔ علامہ حلبی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”اذا سمع الاذان غیر مرة ینبغی ان یجیب الاول سواء کان مؤذن مسجدہ او غیرہ لانہ حیث سمع الاذان ندب لہ الاجابۃ او وجبت فاذا تحقق فی حقہ فالسبب یاتی بالمسبب ثم لا یتکرر علیہ فان سمعہم معا اجاب معتبرا جواب مؤذن مسجدہ۔“^۲

ترجمہ: ”جب کئی بار اذان کی آواز سنے تو پہلی اذان کا جواب دینا چاہئے، خواہ اس کے مسجد کے مؤذن کی آواز ہو، یا دوسرے مسجد کے مؤذن کی، کیونکہ جو پہلی اس نے اذان کی آواز سنی، وہیں اس کا جواب دینا مستحب یا واجب ہو گیا، لہذا جب یہ سبب اس کے حق میں متحقق ہو گیا، تو سبب اپنے ساتھ مسبب کو بھی لائے گا اور پھر اس کا تکرار نہیں ہوگا، اگر کئی سمت سے بیک وقت اذان سنے تو اپنی مسجد کے مؤذن کا جواب دے۔“

نماز میں آلہ مکبر الصوت کا استعمال

لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ نماز درست ہے یا نہیں؟ ابتداء میں علماء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف تھا۔ بعض حضرات کی رائے تھی کہ لائوڈ اسپیکر کی آواز بعینہ امام کی آواز نہیں بلکہ اس آواز کی بازگشت ہے۔ اس طرح اس آواز پر مقتدیوں کی نقل و حرکت گویا امام کی بجائے ایک دوسری آواز کی بناء پر ہوگی اور یہ بات جائز نہیں ہے کہ

مقتدی امام کی بجائے کسی اور کی آواز پر نقل و حرکت کرے۔

اس کے مقابلے میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے باوجود نماز کے لئے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال صحیح ہے اور شریعت میں اس کی نظیر موجود ہے کہ نماز کے باہر کے ایک شخص کی تلقین پر نمازیوں نے نقل و حرکت کی۔ چنانچہ جب بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا گیا اور مدینہ کے مضافات کی بعض مساجد میں جہاں بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے لوگ نماز ادا کر رہے تھے، قبلہ کی تبدیلی کی ایک صحابی رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے اطلاع دی تو سمجھوں نے اپنا رخ بدل لیا۔ ظاہر ہے یہ نقل و حرکت ایک ایسے شخص کی آواز پر عمل میں آئی جو نماز سے باہر تھا۔ اب یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز امام کی نقل اور اس کا چربہ نہیں ہے بلکہ بعینہ امام کی وہی آواز ہے جو اس کی زبان سے نکلتی ہے۔ اس طرح اب لاؤڈ اسپیکر سے نماز و امامت کے جواز پر علماء کا اتفاق ہو چکا ہے۔

بعض علماء اس کے استعمال میں ایک گونہ کراہت سمجھتے ہیں اور ناگزیر ضرورت ہی پر اس سے کام لینے کو درست سمجھتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ فقہاء نے بلا ضرورت امام کی آواز کو تقویت دینے والے ”مکبرین“ کے تقرر کو مکروہ قرار دیا ہے۔ لہذا یہی حکم لاؤڈ اسپیکر کا بھی ہوگا..... مگر یہ استدلال قابل غور ہے۔ مکبرین کی آواز بعینہ امام کی آواز نہیں ہوتی جب کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز کا بعینہ امام کی آواز ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے ان دونوں کو ایک درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کو حسب ضرورت اس طرح استعمال کرنا چاہئے کہ اس کی آواز مناسب حدود اور مسجد میں رہے اور مسجد سے باہر اپنے کاموں میں مصروف لوگوں تک پہنچانے سے گریز کیا جائے کہ اس سے قرآن مجید کی طرف سے بے توجہی ہوتی ہے، جس میں قرآن کی اہانت کا اندیشہ ہے۔

ٹیلی ویژن سے نماز

نماز کوئی مشینی عمل نہیں ہے بلکہ ایک عبادت ہے جس میں انسان اپنے پورے وجود، ظاہری اور باطنی کیفیت، قلب و روح، دل و دماغ، زبان، اعضاء و جوارح اور حرکات و سکنات کے ساتھ خدا کے حضور بچھ جاتا ہے۔ یہ خدا سے ہم کلامی (مناجات) اور قلب کے خوف و عاجزی سے لبریز ہونے (خشوع) کا اظہار اور نشان ہوتا ہے امام جو کچھ بولتا ہے وہ گویا غایت درجہ احترام و ادب اور خوف و محبت کے ساتھ اپنے مقتدیوں کی بات خدا تک پہنچانے کا کام کرتا ہے..... ٹیلی ویژن کی امامت میں جو نماز ہوگی وہ محض ایک مشینی حرکت ہوگی۔ اس میں وہ خوف و خشیت، تواضع و انکسار، ادب و شائستگی اور خوف ورجا کہاں ہو سکتا ہے۔ اس لئے فقہی نقطہ نظر سے ہٹ کر عبادت و بندگی کی روح اور اس کی شان و کیفیت بھی اس کے مغائر ہے کہ انسان ان مصنوعی کل پرزوں کی اقتداء

میں نماز ادا کرنے لگے۔

فقہی اعتبار سے ”اقتداء“ صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ امام اور مقتدی کے درمیان شارع عام (MAIN ROAD) بڑی نہر یا کسی پل وغیرہ کا فاصلہ نہ ہو، اتنے فاصلہ کی موجودگی میں اقتداء درست نہ ہوگی۔^۱ اور اگر بڑا مجمع ہو، صفوں کا تسلسل بھی قائم ہو۔ البتہ نماز گاہ میں آسانی اور نقل و حرکت کے اندازہ کے لئے مختلف جگہ ٹیلی ویژن لگا دیئے جائیں تو نماز تو ہو جائے گی لیکن یہ عمل کراہت سے خالی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ ٹی وی کی فقہی حیثیت سے قطع نظر نمازی کے سامنے اس طرح صورتوں کا آنا بجائے خود بھی مکروہ ہے اور اس لئے بھی کہ اس سے خشوع متاثر ہوگا۔ جہاں تک نقل و حرکت کی اطلاع کا مسئلہ ہے تو وہ لاؤڈ اسپیکر سے بھی ممکن ہے۔

ٹیپ ریکارڈ سے امامت و اذان

ٹیپ ریکارڈ سے نہ امامت درست ہے اور نہ اذان۔ اس لئے کہ امام اور مؤذن وہی ہو سکتا ہے جو ”ناطق“ اور ”گویا“ ہو اور ٹیپ ریکارڈ میں خود گویائی نہیں ہے بلکہ وہ ایک بے ارادہ غیر مختار ناقل اور حاکی (NARRATOR) ہے جو کسی آواز کی نقل کرتا ہے۔ اذان و امامت عبادت ہے جو قلب کی کیفیت کے ساتھ انجام دی جاتی ہے اور ٹیپ ریکارڈ ایک جامد اور غیر حساس شے ہے جس کی آواز کو عبادت نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی آواز کی حیثیت مستقل ”بول“ کی نہیں ہوتی بلکہ وہ تابع محض ہے..... یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص ٹیپ پر طلاق دیتے ہوئے کہے ”میں نے طلاق دی“ اور اسی کو تین دفعہ بجایا جائے تو طلاق ایک ہی واقع ہوگی۔ اس تکرار کی وجہ سے اصل طلاق میں تکرار نہ ہوگا۔ کوئی اسی طرح ٹیپ پر ایک ہزار کا اقرار کرے اور اسے بار بار بجاتا جائے تو اقرار ایک ہی ہزار کا ہوگا۔ تین ہزار کا نہ ہوگا اس لئے کہ اس آواز کی حیثیت تابع کی ہے۔

لہذا اس طرح دی گئی اذان اور امامت، اذان اور امامت نہ ہوگی بلکہ محض اس کا صوتی اور لفظی تکرار ہوگا..... چنانچہ فقہاء نے سکھائے ہوئے پرندوں کی آواز اور تلاوت کو اصل تلاوت کا درجہ نہیں دیا ہے اور اسی لئے اس کی وجہ سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔

”ولا تجب اذا سمعها من طير هو المختار وان سمعها من الصدى لا تجب عليه كذا في الخلاصة.“^۲

نس بندی کئے ہوئے شخص کی امامت

نس بندی کے باوجود آدمی مرد ہی باقی رہتا ہے۔ عورت یا منخث کے حکم نہیں ہو جاتا۔ اس لئے امامت کے

مسئلہ میں بھی اس کے احکام مردوں کے ہیں۔ اس کی امامت درست اور جائز ہے۔ اگر اس کی نس بندی جبراً کی گئی ہے تو اب تو اس کا قصور بھی نہیں اور اگر اس نے از خود برضا و رغبت کی ہو تو موجب فسق ہے۔ توبہ اور ندامت کے بعد کراہت ختم ہو جائے گی جب تک تائب نہ ہو چونکہ نس بندی ناجائز اور خلق اللہ میں تبدیلی ہے۔ اس لئے فاسق ہونے کے باعث اس کی امامت مکروہ ہوگی۔

نماز میں گھڑی دیکھنا

نماز دراصل اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی اور مخاطبت کا وقت ہے۔ اس وقت کسی اور طرف توجہ کرنا بالکل اس طرح ہے کہ ایک شخص کو آپ اپنی طرف متوجہ کریں اور پھر آپ کسی اور کام میں مشغول اور اس کی طرف سے بے توجہ ہو جو۔ اس لئے نماز جیسی عبادت کا صحیح تقاضہ تو یہ ہے کہ اس وقت آدمی اپنے آپ کو کلیتہً خدا کی طرف یکسو کر لے اور قصد اوقات وغیرہ نہ دیکھے۔

لیکن اگر کوئی شخص وقت دیکھ ہی لے اور سمجھ لے البتہ زبان سے اس کا تلفظ نہ کرے تو نماز فاسد نہ ہوگی، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

”لو نظر فی کتاب من الفقہ فی صلوٰتہ وفہم لا تفسد صلوٰتہ بالاجماع کذا فی التاتارخانیۃ واذا کان المکتوب علی المحراب غیر القرآن فنظر المصلی الی ذلک وتأمل وفہم فعلى قول ابی یوسف لا تفسد وبہ أخذ مشائخنا۔“^۱

ترجمہ: ”اگر کوئی شخص دوران نماز فقہ کی کسی کتاب میں سے کچھ حصہ دیکھ لے اور سمجھ لے تو بالاجماع نماز فاسد نہ ہوگی۔ فتاویٰ تاتارخانیہ میں ایسا ہی لکھا ہے اور جب محراب پر قرآن کے علاوہ کوئی دوسری چیز لکھی ہو، نمازی اسے دیکھے، اس پر غور کرے اور پھر سمجھ لے تو امام ابو یوسف رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوگی۔ اور مشائخ احناف نے اسی رائے کو قبول کیا ہے۔“

اور اگر بلا ارادہ نظر پڑ گئی تب تو ظاہر ہے اور بھی مضا لقمہ نہیں۔

مصور کپڑوں میں نماز

اس زمانے میں تصویر کشی اور فوٹو گرافی کے رجحان میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ مصور کپڑے بھی تیار ہونے لگے ہیں۔ ان کپڑوں کا استعمال بجائے خود تو مکروہ ہے ہی نمازوں میں ان کا استعمال کچھ

^۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۱، الباب السابع فیما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیہا وفیہ فصلان

زیادہ ہی ناپسندیدہ ہے۔ پہلے زمانے میں ایسے کپڑے پہننے کا رواج تو نہ تھا لیکن ازراہ زینت بچھانے اور لٹکانے کا رواج تھا۔ فقہاء نے اس صورت کو صراحتاً مکروہ قرار دیا ہے۔ علامہ علاء الدین حکفی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نماز میں مکروہ باتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”أَنْ يَكُونَ فَوْقَ رَأْسِهِ أَوْ يَبِينُ يَدَيْهِ أَوْ بِحِذَائِهِ يَمْنَةً أَوْ يَسْرَةً أَوْ مَحَلَّ سَجُودِهِ تَمَثَالٌ“۔^۱

ترجمہ: ”مکروہات نماز میں یہ بھی ہے کہ سر کے اوپر یا سامنے یا دائیں یا بائیں جانب یا اس کے سجدہ کی جگہ تصویر ہو۔“

لہذا جب مصوّر فرش اور پردوں کا یہ حکم ہے تو اس کا پہننا بھی مکروہ قرار پائے گا۔ ابن قدامہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے خود مصوّر کپڑوں کی کراہت کا ذکر کیا ہے:

”فَمَا الثِّيَابُ الَّتِي عَلَيْهَا تَصَاوِيرُ الْحَيَوَانَاتِ، فَقَالَ ابْنُ عَقِيلٍ يَكْرَهُ لِبْسَهَا وَلَيْسَ بِمَحْرَمٍ، وَقَالَ أَبُو الْخَطَّابِ هُوَ مُحْرَمٌ لِأَنَّ أَبَا طَلْحَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَحُجَّةٌ مَنْ لَمْ يَرَهُ مُحْرَمًا أَنَّ زَيْدَ بْنَ خَالِدٍ رَوَاهُ عَنْ أَبِي طَلْحَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ فِي آخِرِهِ ”الْأَرَقَمَا فِي ثَوْبٍ“ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ“۔^۲

ترجمہ: ”جہاں تک ایسے کپڑے کی بات ہے جس میں جانوروں کی تصویریں ہوں، تو اس سلسلہ میں ابن عقیل رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے کہ اس کا پہننا مکروہ ہے حرام نہیں، ابو الخطاب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کہتے ہیں حرام ہے، اس لئے کہ حضرت ابو طلحہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ”فرشتے ایسے گھر میں قدم رنجہ نہیں ہوتے، جس میں کتاب یا فوٹو ہو“ جو لوگ حرام نہیں سمجھتے ہیں ان کا استدلال حضرت زید بن خالد کی حدیث ابو طلحہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ ہے اور وہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں، اس حدیث کے آخر میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”سوائے اس صورت کے کہ کپڑے پر نقش ہو۔“

علامہ شیرازی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی رقم فرما ہیں:

”وَتَكْرَهُ الصَّلَاةُ فِي الثَّوْبِ الَّذِي عَلَيْهِ الصُّورَةُ“۔^۳

^۱ الدر المختار: ۴۳۵/۱ مکروہات الصلوة

^۲ المغنی: ۳۴۳/۱

^۳ بخاری ومسلم

^۴ المہذب مع الشرح: ۱۷۹/۳

مصور کپڑے میں نماز پڑھنی مکروہ ہے۔

ننگے سر نماز

آج کل ننگے سر نماز پڑھنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ اسلام میں ٹوپی یا عمامہ وغیرہ کی حیثیت صالحین کے شعار کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ کا عام معمول عمامہ باندھنے کا تھا۔ گو بعض روایتیں ایسی موجود ہیں کہ آپ ﷺ نے صرف ایک کپڑے میں نماز ادا فرمائی ہے، لیکن آپ ﷺ کے عام معمول کو دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ عمل کسی عذر کی بناء پر رہا ہوگا یا محض جواز کو بتانے کے لئے ہوگا۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ جیسا کہ ابواسحاق شاطبی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے لکھا ہے کہ اصل میں اس کا تعلق عرف و عادت اور رواج سے ہے، مغربی ملکوں میں جہاں سر ڈھکنے کو داخل احترام نہیں سمجھا جاتا، کھلے سر نماز پڑھنے کی اجازت ہوگی، مشرقی ممالک میں جہاں سر ڈھکنے کو ادب و احترام تصور کیا جاتا ہے، بلا عذر کھلے سر نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں علامہ ہسکلی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”وصلوٰتہ حاسرا ای کاشفا رأسہ للتکاسل ولا بأس للتذلل وأما للإہانۃ بہا فکفر ولو سقطت قلنسوتہ فإعادتها أفضل إلا إذا احتاجت لتکریر او عمل کثیر۔“^۱

ترجمہ: ”اگر سستی کھلے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ ہاں اگر تواضع مقصود ہو تو مضائقہ نہیں اور اگر توہین نماز مقصود تھی تب تو کفر ہے۔ نیز اگر نماز میں ٹوپی گر جائے تو اگر عمل کثیر وغیرہ کے بغیر پہن لینا ممکن ہو تو نماز ہی میں دوبارہ ٹوپی پہن لینا چاہئے۔“

مسافت سفر

حنفیہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا معروف مذہب تو یہی ہے کہ مسافر ہونے کے لئے کوئی مخصوص زمینی مسافت متعین نہیں ہے بلکہ اس وقت سفر سے تین دن اور تین رات جتنی دور کا سفر کیا جاسکے کم سے کم اتنی دور کے سفر سے انسان شرعاً مسافر ہوتا ہے اور اس کے لئے نماز میں قصر کی اور رمضان میں وقتی طور پر روزہ نہ رکھنے کی اجازت حاصل ہوتی ہے، راستہ کی ہمواری و ناہمواری کے اعتبار سے یہ مسافت مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن عوام کی آسانی

^۱ درالمختار: ص ۸۷ مطبوعہ ہگلی باب ما یفسد الصلوۃ وما یکرہ فیہا

کے لئے بعد کے فقہاء نے مسافت کی بھی تعین کی ہے، فقہاء حنفیہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی سے اس سلسلہ میں تین اقوال منقول ہیں:

۲۱ فرسخ = ۶۳ میل

۱۸ فرسخ = ۵۴ میل

۱۵ فرسخ = ۴۵ میل

شوافع، مالکیہ اور حنابلہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی سے منقول ہے:

۱۶ فرسخ = ۴۸ میل

اور اس سلسلہ میں بخاری رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے دو صحابی حضرت عبداللہ بن عباس و عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کا عمل بھی نقل کیا ہے کہ یہ دونوں حضرات چار برید کے سفر پر قصر کیا کرتے تھے اور ایک برید چار فرسخ کا ہوتا ہے۔ پس یہ رائے دوا کا بر صحابہ سے مؤید بھی ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے مسلک کے مطابق بھی ہے اور پندرہ فرسخ والا قول جس پر علماء خوارزم کا فتویٰ ہے سے قریب بھی ہے، اس لئے ہمارے زمانہ میں اکثر علماء ہندوپاک نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک فرسخ تین میل کے برابر ہے اور میل سے میل شرعی مراد ہے جو چار ہزار ہاتھ کے برابر ہے میل انگریزی مراد نہیں۔ پس اس طرح ایک میل شرعی ہزار گز کے برابر ہوا، اور دو ہزار گز، ۱/۱ کلومیٹر ۸۲۸ میٹر ۸۰ سینٹی میٹر کے مساوی ہے اس طرح ۴۸ میل ۸۷۷۷۸۲۴۰ (۸۷ کلومیٹر، ۷۸۲ میٹر، ۴۰ سینٹی میٹر) کے برابر ہوتا ہے، یہی مسافت سفر ہے۔

ریل اور بس کی مسافت میں فرق ہو

جس مقام پر جا رہا ہو اگر وہاں کے بس اور ٹرین کے راستوں میں تفاوت ہو، یا وہاں جانے کے دو راستے ہوں اور دونوں میں مسافت کا خاصا فرق ہو، ایک راستہ سے مسافت سفر پوری ہو جاتی ہو، دوسرے راستے سے پوری نہ ہوتی ہو، تو اس راستہ کا اعتبار ہوگا جس کو سفر کے لئے اختیار کیا ہے، اگر وہ ۸۷ کلومیٹر ۷۸۲ میٹر ۴۰ سینٹی میٹر یا اس سے زیادہ ہو تو قصر کرے گا ورنہ نمازیں پوری پڑھے گا۔

”الرجل اذا قصد بلدة والی مقصده طریقان احدهما مسيرة ثلاثة ايام وليا ليها“

والا خرد ونہا فسلک الابد کان مسافرا عندنا۔^۱
 تَرْجَمًا: ”ایک شخص نے کسی شہر کا قصد کیا اور وہاں کے دور استے ہیں ایک تین شبانہ روز کا اور دوسرا
 اس سے کم کا، اور اس شخص نے دور کا راستہ اختیار کیا تو وہ ہمارے نزدیک مسافر شمار ہوگا۔“

سراں میں قصر کرے یا نہیں؟

ان دنوں ذرائع مواصلات کی سہولت کی وجہ سے دور دراز علاقوں میں باہم عقد نکاح کے واقعات نسبتاً زیادہ ہو گئے ہیں اور اس سلسلہ میں مسئلہ بکثرت درپیش ہوتا ہے کہ سراں میں انسان کی حیثیت مسافر کی ہوتی ہے یا مقیم کی۔ یعنی وہاں اسے نمازیں مکمل کرنی چاہئیں یا چار رکعت والی نمازیں دو رکعت ادا کرنی چاہئیں..... فقہاء نے اس پر بحث کی ہے، یہ بات تو واضح ہے کہ اگر سراں میں مستقل طور پر بیوی کو رکھتا ہو تو وہ اس کا وطن اصلی ہے، ہاں بیوی کے انتقال کے بعد وہ وطن باقی نہیں رہے گا۔ نیز اگر خود بھی سراں میں بس گیا ہو تو اب بیوی کے انتقال کے بعد بھی وہ اس کا وطن ہے اور نمازیں مکمل ادا کرنی ہیں۔

لیکن اگر سراں میں نہ خود آباد ہو نہ بیوی کو مستقل طور پر رکھتا ہو، گا ہے گا ہے آمد و رفت کا سلسلہ ہو تو اس صورت میں قصر کرے گا یا نماز پوری کرے گا اس میں خود فقہاء احناف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، بعض حضرات نے ایسی صورت میں اس کو مسافر مانا ہے اور جب تک ۱۵/ دنوں کے قیام کی نیت نہ کرے، قصر کرنے کا کہا ہے، قاضی خاں رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے:

”أولم یکن مولدہ ولکنہ تأہل بہ وجعلہ دارا یصیر مقیما۔“^۲

تَرْجَمًا: ”یا ایسی جگہ ہو جہاں اس کی پیدائش نہ ہو، لیکن اس نے وہاں شادی کر لی ہو اور اس کو گھر بنا لیا ہو تو مقیم ہو جائے گا۔“

لیکن علامہ حلبی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”ولو تزوج المسافر ببلد ولم ینو الا قامة فقیل لا یصیر مقیما وقیل یصیر مقیما وهو الا وجه لمامر من حدیث عثمان، ولو کان له اهل ببلد تین فأیتھما دخلھا صار مقیما۔“^۳

تَرْجَمًا: ”مسافر کسی شہر میں نکاح کر لے اور اقامت کی نیت نہ کرے، تو بعض لوگوں نے کہا کہ مقیم نہ ہوگا اور بعض لوگوں نے کہا کہ مقیم ہو جائے گا اور یہی زیادہ صحیح ہے جیسا کہ حضرت عثمان

^۱ کبیری: ۵۰۶

^۲ خانہ علی ہامش الہندیہ: ۱۶۵/۱

^۳ خانہ علی ہامش الہندیہ: ۱۶۵/۱

رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی حدیث گزر چکی ہے، اگر ایک شخص کی بیوی دو شہروں میں ہو تو ان میں سے جس شہر میں بھی داخل ہوگا مقیم ہو جائے گا۔“
علامہ حسکفی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا رجحان بھی اسی طرف ہے، چنانچہ انہوں نے مطلقاً ”تاہل“ کو وطن اصلی ہونے کے لئے کافی مانا ہے:

”(الوطن الاصلی) هو موطن ولادته او تأہله او توطنه۔“^۱

تَرْجَمَہ: ””وطن اصلی“ وہ جگہ ہے جہاں ولادت و شادی ہو یا اس کو وطن بنایا ہو۔“

اور شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے..... نیز جیسا کہ حلبی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی صراحت مذکور ہوئی، حضرت عثمان غنی رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس لئے صحیح یہی ہے کہ سرال میں اگر مستقل طور پر بیوی کو نہ رکھتا ہو اور نہ خود شوہر نے اس جگہ کو اپنا وطن بنایا ہو، تب بھی سرال میں نمازیں پوری ادا کرنی چاہئیں۔ واللہ اعلم

منبروں کی نئی وضع

آج کل مسجدوں میں ایسے منبر بنائے جانے لگے ہیں جو زمین سے خاصے اونچے چھجے کی شکل میں ہوتے ہیں اور محراب کی دائیں جانب سے آکر خطیب کو منبر پر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور منبر محض ایک کرسی ہوتی ہے جس پر دو خطبہ کے درمیانی وقفہ میں بیٹھا جاسکتا ہے..... منبر کی یہ صورت بہتر نہیں ہے، اگر اس طرح کا اونچا منبر بنانا ہی ہو تو اس پر تین سیڑھیوں کا لکڑی کا منبر رکھ دیا جائے تاکہ سنت سے مطابقت ہو سکے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ کا جو منبر بنایا گیا تھا وہ تین سیڑھیوں کا تھا..... اسی لئے فقہاء نے بھی ایسا منبر بنانے کو کہا ہے جو تین سیڑھیوں والا ہو اور قبلہ کی جانب سے محراب کی بائیں طرف پڑتا ہو۔

مسجدوں میں پینٹ کا استعمال

مسجدوں کی دیواروں اور لکڑیوں وغیرہ کو پینٹ (PAINT) سے رنگنے کا کیا حکم ہے؟..... اس سلسلہ میں دو اصول یاد رکھنے چاہئیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے بدبودار چیزوں کے مساجد میں لانے سے منع فرمایا ہے۔ اسی لئے ایسے شخص کو آپ ﷺ نے مسجد میں نہ آنے کو کہا ہے جس کے منہ میں پیاز کی بدبو ہو۔ دوسری طرف مسجدوں کی آرائش کی بھی اجازت دی گئی ہے مثلاً آہک پاشی کی جائے یا اس پر سونے کا پانی چڑھایا

^۱ مجمع الزوائد: ۱۸۰/۲

^۲ رد المحتار: ۵۴۳/۱

^۳ درالمختار علی هامش الرد: ۵۳۳/۱

^۴ جامع الرموز: ۱۱۸/۱ ^۵ بخاری و مسلم عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۸۲۰/۲ باب ما یکرہ من الثوم والبقول فیہ

جائے۔

”ولا یکره نقش المسجد بالجص وماء الذهب.“^۱
لہذا پینٹ میں اگر بدبو نہ ہو تب تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں مگر پھر بھی زیبائش و آرائش میں زیادہ مبالغہ شرعاً کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے:

”والأولی أن تكون حیطان المسجد البیض غیر منقوشة ولا مکتوب علیہ.“^۲
ترجمہ: ”بہتر ہے کہ مسجد کی دیواریں سفید اور نقش و تحریر سے خالی ہوں۔“
اور اگر بدبو ہو تو بلا ضرورت اس کا استعمال مناسب نہیں۔ پہلے سے پینٹ کیا جا چکا ہے اور بو محسوس نہ ہوتی ہو، تو کھرچ کر صاف کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

مسجدوں میں قتمے

مسجدوں میں قتموں اور بجلیوں کے مسرفانہ اور آرائشی استعمال کا جو سلسلہ چل پڑا ہے وہ کراہت سے خالی نہیں۔ اگر اس کے لئے مسجد کا پیسہ استعمال کیا جائے تب تو ظاہر ہے کہ یہ ایک امانت کا غلط استعمال ہے۔ فقہاء رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی نے تو ایک تہائی شب سے زیادہ مسجد کا چراغ جلانے سے بھی منع فرمایا ہے۔
”ولا بأس بان یترک سراج المسجد فی المسجد الی ثلث اللیل ولا یترک اکثر من ذالک.“^۳

تو ظاہر ہے اس کا جواز کہاں ہوگا؟

دوسرے اس میں مشرکین سے تشبہ اور ان کی نقل بھی ہے کہ وہ اپنی عبادت گاہوں میں اسی طرح قتموں کا استعمال کیا کرتے ہیں۔ فقہاء نے اسی تشبہ کی وجہ سے مسجدوں میں درخت لگانے سے منع فرمایا ہے کہ عیسائی گرجا میں ایسا ہی کرتے ہیں:

”ویکره غرس الشجرة فی المسجد لانه تشبه بالبیعة“^۴

آیات قرآنی کے طغریے

آیات قرآنی کے طغریوں کا مسجدوں یا گھروں میں استعمال مناسب نہیں۔ ایک تو اس کا اندیشہ ہے کہ کبھی یہ تحریر رفتہ رفتہ زمین پر گر کر پاؤں میں آجائے۔

^۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۱۱۰/۱

^۲ الفتاویٰ الہندیہ: ۳۱۹/۱

^۳ الفتاویٰ الہندیہ: ۱۰۹/۱

^۴ الفتاویٰ الہندیہ: ۱۱۰/۱ فیما یکره فی الصلوۃ وما لا یکره

”ولیس بمستحسن كتابة القرآن على المحارِب والجدران لما يخاف من سقوط الكتابة وأن توطأ“^۱

اس کے علاوہ لوگوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے قرآن کی بے حرمتی بھی ہوتی ہے، جیسے بے توجہ لوگوں کے سامنے تلاوت قرآن مناسب نہیں۔ یہی حکم کتابت قرآن کا بھی ہوگا۔ نیز نماز کے دوران عموماً نظر ادھر چلی جاتی ہے اور آدمی دل ہی دل میں اسے پڑھنے لگتا ہے۔ اس طرح خشوع و خضوع اور انابت الی اللہ کی کیفیت متاثر ہوتی ہے۔ مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (متوفی ۹۷۰ھ) نے صراحت فرمائی ہے:

”ویکرہ ان تكون منقوشة بصور او كتابة“^۲

ترجمہ: ”مسجد کا کسی بھی تحریر یا تصویر سے منقش ہونا مکروہ ہے۔“

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس سے قرآنی آیات و احادیث کے تختے، کیلنڈر وغیرہ مستثنیٰ ہیں جو دعوت و تبلیغ اور اشاعت دین کے نقطہ نظر سے لکھے جاتے ہیں جیسا کہ فقہاء نے تعلیمی اور اصلاحی مصلحت کے پیش نظر چھوٹے بچوں کے ہاتھ میں قرآن مجید دینے کی اجازت دی ہے۔ حالاں کہ بچوں کے ہاتھ قرآن مجید کی بے حرمتی کا اندیشہ اور قوی امکان ہے۔ پس دعوتی مقصد کے تحت اس کو گوارا کیا جاسکتا ہے۔

محراب میں تصویریں یا بزرگوں کے نام

محراب میں تصویروں کی نقاشی خواہ وہ کسی بھی ذی روح کی ہوسخت گناہ اور مکروہ ہے۔ ہدایہ میں ہے:

”أشد كراهة أن يكون امام المصلی ثم من فوق رأسه ثم یمینہ ثم شمالہ ثم خلفہ۔“

ترجمہ: ”سب سے زیادہ کراہت اس تصویر میں ہے جو امام کے سامنے ہو، پھر اس میں جو اس کے سر کے اوپر ہو، پھر دائیں پھر بائیں اور پھر پیچھے کی تصویر۔“

اور یہ کہ:

”یکرہ أن يكون فوق رأسه تصاویر أو صورة معلقة“^۳

ترجمہ: ”مکروہ ہے کہ اس کے سر کے اوپر تصویریں ہوں یا کوئی لٹکی ہوئی تصویر ہو۔“

اس لئے کہ اس میں شرک کا شبہ پیدا ہوتا ہے..... ہمارے زمانے میں قبر پرستی اور اولیاء پرستی کا مرض جس طرح عام ہے، اس فضا میں نمازی کے سامنے دیواروں پر بزرگوں کے نام لکھنا اور ان کے کتبے لگانا بھی کراہت

سے خالی نہ ہوگا۔ غیر ذی روح کی تصاویر کی فقہاء نے اجازت دی ہے یہاں تک کہ علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے سورج و چاند اور ستاروں کی تصویروں کا بنانا بھی جائز قرار دیا ہے..... مگر میرے خیال میں یہ رائے محل نظر ہے۔ چاند، سورج اور ستاروں کی بعض مذاہب میں پرستش کی جاتی ہے اور ان کے عبادت خانوں میں ان کی تصویریں بنائی جاتی ہیں، اس لئے ایسی اور اس قسم کی تمام ہی تصویروں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ علامہ ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے مطلقاً تصویروں کی نقاشی کو مکروہ قرار دیا ہے۔

مساجد میں سونا اور رہنا

آج کل بڑے شہروں میں مساجد کو بعض لوگ مسافر خانہ کے بطور استعمال کرنے لگے ہیں یہ مکروہ اور مسجد کے احترام کے منافی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے:

”ویکرہ فی المسجد اکل ونوم الا للمعتکف والكلام المباح قیدہ فی الظہیریۃ بان یجلس لاجلہ فی النہر الاطلاق اوجہ.“

ترجمہ: ”معتکف کے علاوہ دوسروں کے لئے مسجد میں کھانا اور سونا مکروہ ہے اور جائز قسم کی دنیوی گفتگو بھی..... فتاویٰ ظہیریہ کے مطابق یہ اس وقت ہے جب خاص اسی مقصد کے لئے بیٹھے لیکن ”نہر“ نامی کتاب میں ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ مطلقاً مکروہ ہے۔“

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ایک تو یہ مسجدوں کے مقصود کے خلاف ہے۔ دوسرے سونے کی صورت میں اکثر اوقات فضول گفتگو کی نوبت آتی ہے جو مساجد میں نہیں ہونی چاہئے۔ چنانچہ حضرت عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے اس قسم کی دنیوی گفتگو کے لئے مسجد سے متصل ایک چبوتر ا بنا دیا تھا، جس کا نام ”بطیحا“ تھا۔ تیسرے اس طرح مسجد میں بلا ضرورت اور بار بار خروج رتخ کی نوبت آئے گی اور مسجد میں بالقصد خروج رتخ کو فقہاء نے مکروہ قرار دیا ہے۔ چوتھے اس طرح مساجد میں جنابت کی نوبت بھی آسکتی ہے اس کے علاوہ اس سے مسجد کا احترام اور اس کی توقیر دل میں کم ہو جاتی ہے..... ہاں اگر دینی ضرورت کی بناء پر سونا پڑے تو مضائقہ نہیں جیسا کہ تبلیغی اور دینی اجتماعات اور اسفار میں اس کی نوبت آتی ہے اور اس کی نظیر اعتکاف اور رسول اللہ ﷺ کا بعض وفود کو مسجد نبوی ﷺ میں مہمان بنانا اور ٹھہرانا ہے۔ تبلیغی مقصد کے تحت مسجد میں رہیں، تب بھی بہتر بات ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے اعتکاف کی نیت کر لی جائے۔

۱۔ البحر الرائق: ۲۵۱/۵

۲۔ ردالمحتار: ۶۰۷/۱

۳۔ الدر المختار بحوالہ مجموعہ الفتاویٰ باب احکام المساجد۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد میں سونے والے کی سرزنش کرتے تھے بخاری

عن سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۴۔ موطا امام مالک

مسجدوں میں اجرت لے کر تعلیم دینا

آج کل عام طور پر شہروں میں مساجد میں صبحی اور مسائی تعلیم کا نظم ہے بلکہ بعض مدارس میں مسجدوں ہی کو بطور درس گاہ استعمال کیا جاتا ہے اور ان تمام صورتوں میں معلمین اجرت لے کر تعلیم دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

سوالاً تو قدیم فقہاء خود دینی تعلیم پر اجرت لینے کو ناجائز سمجھتے تھے اور یہی امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا مسلک ہے۔ مگر فقہاء نے بعد میں دینی تعلیم کی مصلحت کے پیش نظر اس کی اجازت دے دی اور اب اسی پر فتویٰ ہے۔ اسی طرح مسجدوں میں بھی اجرت لے کر تعلیم دینے کو فقہاء نادرست قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ مسجدیں عبادت و تذکیر کی جگہ ہیں نہ کہ کسبِ معاش کی۔ مگر ہمارے زمانہ کے حالات کا تقاضہ ہے کہ اس کی اجازت دی جائے۔ اس لئے کہ عموماً وسائل کے فقدان، دوسرے، جگہ کی عدم دستیابی اور مجبوری کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ اب اگر اس معاملہ میں شدت برتی جائے تو یہ سخت نقصان کی بات ہوگی اور شرعی مصلحت کے خلاف بھی کہ عصری درس گاہوں کے طلباء جو اس طرح صبح و شام تھوڑے وقت میں دین کی بنیادی تعلیم حاصل کر لیتے ہیں وہ اس سے بھی محروم ہو جائیں اور ایسے جزوقتی یا ہمہ وقتی مدارس کا بند ہونا اس علاقہ کے لوگوں کیلئے تعلیم سے محرومی کا سبب بنے گا۔ بعض بزرگ اس معاملے میں زیادہ ہی شدت برتتے ہیں۔ حالانکہ خود کتبِ فقہ سے مستفاد ہے کہ ضرورتاً مسجد میں تعلیم دی جاسکتی ہے۔

”أما المعلم الذى يعلم الصبيان بأجر إذا جلس فى المسجد يعلم الصبيان لضرورة الحرو وغيره لا يكره.“^۱

ترجمہ: ”بچوں کو اجرت لے کر تعلیم دینے والا معلم جب گرمی کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری سے مسجد میں بیٹھ کر تعلیم دے تو مکروہ نہیں ہے۔“

یہاں دیکھئے گرمی کے علاوہ کسی اور ضرورت کے پیش نظر بھی اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے بڑی ضرورت اور کیا ہوگی کہ کوئی دوسری جگہ میسر نہیں ہے اور اگر یہ سلسلہ بھی بند کر دیا جائے تو تعلیمی سلسلہ بھی منقطع ہو جائے گا۔ ہاں اگر دوسری جگہ موجود ہو تو مسجد کی بجائے وہیں تعلیم دینی چاہئے۔

مسجد کے نیچے دکانوں کی تعمیر

آج کل اکثر مسجدوں کے نیچے دکانات اور ملکیاں تعمیر کر دی جاتی ہیں جن سے حاصل ہونے والی آمدنی

^۱ خلاصۃ الفتاویٰ: ۲۲۹/۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۱۱۰/۱

سے مسجد کے اخراجات کی تکمیل کی جاتی ہے۔ فقہی نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت جائز ہے۔ ایسی صورت میں یہ پختی منزل ”مسجد“ نہیں بلکہ ایک ایسی عمارت کے درجہ میں ہوگی جسے ”مصالح مسجد“ کے لئے وقف کر دیا گیا ہے اور بالائی چھت سے مسجد کا شمار ہوگا۔

علامہ علاء الدین ہسکفی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

”ان جعل تحته سرداباً لمصالحہ ای المسجد جاز کمسجد القدس۔“^۱

مگر یہ حکم اس وقت ہوگا جب مسجد کی تعمیر ہی کے وقت ایسی نیت کر لی جائے۔ اگر شروع میں کسی زمین پر مسجد تعمیر کر لی گئی اور بعد کو تہہ خانہ بنایا گیا تو درست نہ ہوگا۔

مسجد میں چندوں کا اعلان

مسجد میں دینی اداروں اور کاموں کے لئے اعلان میں کوئی مضائقہ نہیں، رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر جنگی مہمات میں مالی اعانت کے لئے مسجد نبوی میں اعلان فرمایا ہے..... کسی کو ذاتی اور شخصی ضرورتوں کے لئے البتہ اعلان نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ آپ ﷺ نے مسجدوں میں کسی گم شدہ چیز کے لئے اعلان کے متعلق سخت برہمی کا اظہار فرمایا۔ جس کا تعلق انسان کی شخصی ضرورت سے ہوتا ہے۔ ایک بار ایک مفلوک الحال صحابی رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی آپ ﷺ اعانت کرانا چاہتے تھے لیکن آپ ﷺ نے اس کے لئے اعلان نہیں فرمایا اور یہ تدبیر اختیار کی کہ برسرِ مجمع وہ خود کھڑے ہو کر نماز ادا کریں تاکہ لوگ ان کو دیکھیں اور مدد کی طرف متوجہ ہوں۔

یہی حکم کتابوں اور کیلنڈروں کے اعلان کا ہونا چاہئے کہ اگر کسی دینی ادارہ یا دارالاشاعت نے ان کو شائع کیا اور ان تک بھی اس کا نفع پہنچتا ہے، تو مسجد میں ان کا اعلان کیا جاسکتا ہے اور اگر شخصی طور پر کتابیں شائع کی گئیں اور اس کے نفع و نقصان کا تعلق خود اس شخص سے ہے، تو اب اس کا اعلان درست نہ ہوگا۔

ایک مسجد کا قرآن دوسری مسجد میں

شہروں میں آج کل یہ مسئلہ کثرت سے پیش آرہا ہے کہ بعض اہم مساجد میں لوگ بڑی تعداد میں قرآن مجید اور اس کے پارے لائبر رکھتے ہیں جو ضرورت سے زیادہ ہوتے ہیں، جب کہ دوسری مسجدوں بالخصوص گاؤں، دیہات اور قصبات کی مساجد میں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔

دین کے مجموعی مزاج اور فقہی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حالات میں ان مسجدوں سے دوسری

^۱ دیکھئے مشکوٰۃ المصابیح: ۳۵۱/۲ باب مناقب عثمان

^۲ الدر المختار: ۵۷۲/۲

ضرورت مند مسجدوں میں پاروں کی منتقلی میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں ہے:

”ان وقف علی المسجد جاز ویقرء فیہ ولا یکون محصوراً علی هذا المسجد

وبہ عرف حکم کتب الاوقاف من محلہا لانتفاع بہا۔“^۱

ترجمہ: ”اگر (مصحف) مسجد پر وقف کر دے تو جائز ہے اور اس میں تلاوت کی جائے گی اور وہ اسی مسجد کے لئے مختص نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ وقف کی کتابیں انتفاع کے لئے اپنی جگہ سے منتقل بھی کی جاسکتی ہیں۔“

مساجد میں کیلنڈر

آج کل بعض ایسی تقویمیں شائع کی جاتی ہیں جن میں اوقات نماز، دینی مضامین، احادیث اور آیات کے ٹکڑے درج کئے جاتے ہیں اور اس کی طباعت میں اقتصادی سہولت کے لئے تجارتی اشتہار بھی درج کر دیئے جاتے ہیں، جن کی مقدار دوسرے مضامین کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے۔

ایسے کیلنڈروں کا مسجدوں میں آویزاں کرنا جائز ہے۔ اس لئے کہ ان کیلنڈروں کا اصل مقصود دعوت و اشاعت دین ہے۔ اشتہارات کی حیثیت ذیلی ہوتی ہے اس لئے ان کا اعتبار نہ ہوگا۔

فرقہ وارانہ فسادات کے مہلکین شہداء ہیں؟

ان دنوں جو مسلمان فرقہ وارانہ فسادات میں مارے جاتے ہیں۔ اگر وہ ظلماً مارے گئے ہوں تو شہید ہیں شہید صرف وہی نہیں ہے جو میدان جہاد میں قتل کیا گیا ہو بلکہ ہر وہ شخص ہے جس کو ظلماً ہلاک کر دیا گیا ہو، دھاری دار ہتھیاروں ہی سے ان کی موت واقع ہوئی ہو یہ بھی ضروری نہیں۔ ظالم کافروں، باغیوں اور راہزنوں کے ہاتھوں جس طور بھی موت واقع ہوئی ہو شہادت ہے، بندوق سے، بم سے یا کسی اور ذریعہ سے، بہ قول صاحب ہدایہ:

”ومن قتلہ اهل الحرب أو اهل البغی أو قطاع الطريق فبأی شیء قتلوه۔“^۲

ترجمہ: ”شہید وہ بھی ہے جس کو حربی، باغی یا راہزن قتل کر دے، خواہ کسی طرح بھی قتل کر دے۔“

اگر یہ شہید بالغ، پاک اور مظلوم ہو اور زخمی ہونے اور وفات کے درمیان اتنا وقفہ نہ ہو کہ سامان دنیا سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہو تو اس کو غسل نہیں دیا جائے گا، صرف نماز پڑھی جائے گی۔^۳

^۱ بدائع الصنائع: ۱/۲۲۰

^۲ الہدایہ: ۱/۸۳

^۳ الدر المختار: ۳/۳۷۵

مساجد کے لئے غیر مسلموں کا چندہ

مسجد میں غیر مسلموں کا چندہ قبول کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ بعض حضرات نے مساجد کی تعمیر و مرمت میں غیر مسلموں کا چندہ قبول کرنے کو منع کیا ہے، چنانچہ تفسیر خازن میں ”ماکان للمشرکین أن یعمروا مساجد اللہ“^۱ کے ذیل میں لکھا گیا ہے:

”واختلفوا فی المراد بالعمارة علی قولین، أحدهما أن المراد بالعمارة العمارة المعروفة من بناء المسجد وتشییدها ومرتتها عند خرابها، فیمنع من الکافر حتی لو أوصی ببناء مسجد لم تقبل وصيته.“^۲

ترجمہ: ”عمارت سے کیا مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے دو قول ہیں ایک یہ کہ عمارت سے تعمیر یعنی مسجد بنانا اور اس کو پختہ کرنا اور مرمت طلب ہونے پر مرمت کرنا وغیرہ مراد ہے، لہذا کافر کے لئے یہ چیز ممنوع ہوگی، یہاں تک کہ اگر وہ کسی مسجد کی تعمیر کی وصیت بھی کر جائے تو اس کی وصیت قبول نہ ہوگی۔“

لیکن بعض فقہاء نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ چندہ دینے والا غیر مسلم بھی اسے اپنے عقیدہ کے مطابق کارِ ثواب تصور کرتا ہو۔

”ان شرط وقف الذمی أن یکون قربة عندنا وعندهم كالوقف علی الفقراء وعلی مسجد القدس بخلاف الوقف علی بیعة فانه قربة عندهم فقط أو علی حج أو عمرة فانه قربة عندنا فقط.“^۳

ترجمہ: ”غیر مسلم کا وقف قبول کرنے کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے اور ان کے عقیدہ کے مطابق کارِ خیر متصور ہو، جیسے محتاج و نادار لوگوں اور مسجد اقصیٰ کے لئے وقف کرنا، برخلاف گرجا گھر پر وقف کرنے کے، یہ صرف ان کے نزدیک کارِ ثواب ہے، یا حج و عمرہ کے لئے یہ صرف ہمارے نزدیک کارِ ثواب ہے۔“

پس خلاصہ یہ ہے کہ:

① غیر مسلموں سے دینی کاموں میں چندہ قبول کرنے سے حتی الوسع احتیاط برتنا چاہئے۔

② اگر کسی مصلحت یا ضرورت کی بناء پر ان کے تعاون سے استفادہ کرنا ہی پڑے تو ضروری ہے کہ وہ اس کو

اپنے عقیدہ کے مطابق کارِ ثواب تصور کرتا ہو۔

- ۳ یہ اندیشہ نہ ہو کہ آئندہ وہ اپنی عبادت گاہ یا مشرکانہ تیوہار و رسوم کے لئے تعاون طلب کریں گے۔
- ۴ حکومت کے تعاون کی نوعیت علاحدہ ہے، اس لئے کہ جمہوری ملکوں میں حکومت تنہا کافروں کی نہیں ہوتی بلکہ اس میں مسلمان اور غیر مسلم سب شریک ہوتے ہیں، اس لئے اس کی حیثیت قومی حقوق کی ہے نہ کہ تبرع اور عطا کی۔

قبرستان کی اراضی میں مساجد وغیرہ کی تعمیر

قدیم مسلمان شہروں میں موقوفہ وسیع قبرستان کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کو دینی و ملی ضرورتوں کے لئے اراضی مطلوب ہوتی ہیں، بعض اوقات خود مساجد کی تعمیر یا توسیع کی ضرورت ہوتی ہے اور قبرستان کے علاوہ کوئی موزوں جگہ میسر نہیں ہوتی، ایسی صورت میں قبرستان کا ایسا قدیم حصہ جس میں دفن کئے گئے مردوں کے مٹی بن جانے کا غالب گمان ہو۔ علماء و ارباب افتاء کے مشورہ سے ان مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے ممتاز فقیہ مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اس پر شارح بخاری علامہ عینی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے۔^۱

”لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنی فیہا مسجد لم أربذالك بأسا وذاك لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لا يجوز لأحد أن يملكها فإذا درست واستغنى عن الدفن فیہا جاز صرفہا الی المسجد لأن المسجد أيضا وقف من أوقاف المسلمين لا يجوز التملیک لأحد فمعنا هما علی هذا واحد.“^۲

ترجمہ: ”مسلمانوں کے قبرستانوں میں سے کوئی قبرستان مٹ گیا ہو اور اس میں مسجد تعمیر کرے تو میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ قبرستان مردوں کی تدفین کے لئے مسلمانوں کے اوقاف میں سے ایک ہے، کوئی فرد اس کا مالک نہیں ہو سکتا، لہذا جب قبرستان کے آثار مٹ جائیں اور اس میں دفن کرنے کی حاجت باقی نہ رہے تو مسجد میں اس کو صرف کرنا جائز ہے۔ اس لئے کہ مسجد بھی من جملہ مسلمانوں کی اوقاف کے ہے، کسی کے لئے اس کا مالک بن جانے کی گنجائش نہیں۔“

^۱ امداد الفتاوی: ۵۷۹/۲، بنامودن مکان انجمن در قبرستان معطل

^۲ عمدة القاری: ۴/ کتاب الصلوة، بیان حکم نبش قبور المشرکین الخ

اس طرح ان دونوں کی روح ایک ہی ہے۔“

ویران قبرستان پر مساجد یا فلاحی مقصد سے عمارت کی تعمیر

اگر قبرستان بہت قدیم ہو اور گمان غالب ہو کہ دفن ہونے والے اجسام بوسیدہ اور مٹی ہو گئے ہوں گے، نیز اگر قبرستان کی حاجت باقی نہ رہی ہو تو ایسی صورتوں میں اس پر فلاحی مقاصد کے لئے بلڈنگ یا مسجد کی تعمیر و توسیع جائز و درست ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری ہے:

”ولو بلی المیت وصادترا با جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ۔“^۱
ترجمہ: ”اگر مردہ بوسیدہ ہو جائے اور خاک میں مل جائے تو اس قبر میں دوسروں کو دفن کرنا درست ہے، اس جگہ کھیتی کرنا اور عمارت تعمیر کرنا جائز ہے۔“

اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر قبرستان زیر استعمال ہو، لیکن اس کے تحفظ اور ضروریات کی تکمیل کے لئے قبرستان کے چاروں طرف تعمیر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہو تو ایسی صورت میں قبرستان کے مفادات کے تحفظ کے لئے یہ عمل بھی درست ہوگا۔

اوقافی جائیداد کی خرید و فروخت

فی زمانہ اوقاف کی بہت سی جائیداد نہایت کم نفع آور بن گئی ہیں، کرایہ دار عمارتوں پر قابض ہوتے ہیں اور کرایہ ادا نہیں کرتے ہیں، یا نہایت ناواجبی کرایہ دیتے ہیں، راقم الحروف کے علم میں ہے کہ اوقاف کی بعض عمارتیں، جن کا موجودہ حالات میں اقل ترین کرایہ ہزار دو ہزار ہونا چاہئے، محض پچاس ساٹھ روپے ادا کیا جاتا ہے، قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے ایسی عمارتوں کی بازیابی اور کرایہ داروں کا تخلیہ اکثر اوقات جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں ہوتا، البتہ بعض اوقات یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ اسی کرایہ دار یا کسی اور صاحب رسوخ آدمی سے عمارت فروخت کر دی جائے، اس طرح ایک خطیر رقم حاصل ہو جاتی ہے، جس سے آمدنی کے دوسرے وسائل پیدا کئے جاسکتے ہیں۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں وقف کے مفادات کی حفاظت اس کی افادیت میں اضافہ اور دینی مصالح کے تحت اس طرح کا عمل کرنا جائز ہے اور جو جائیداد کسی وجہ سے اپنا نفع کھو چکی ہو، اس کو تبدیل کر کے اس کی آمدنی سے دوسرے نفع آور ذرائع کے حصول میں کوئی قباحت نہیں کہ یہ واقف کے منشا کی تکمیل اور وقف کے مقاصد میں تعاون ہے۔ فقہاء نے بنیادی طور پر وقف کے احکام میں اسی کو ملحوظ رکھا ہے کہ اس کو زیادہ

سے زیادہ نافع اور مفید بنایا جائے، اس سلسلہ میں فقہاء کی یہ تصریحات ملاحظہ کئے جانے کے لائق ہیں:

”وَكَذَا أَرْضُ الْوَقْفِ إِذَا قُلَّ نَزْلُهَا بِحَيْثُ لَا تَحْتَمِلُ الزَّرَاعَةَ وَلَا تَفْضُلُ غَلَّتَهُ عَنْ مَوْنَةٍ، وَيَكُونُ صِلَاحُ الْأَرْضِ فِي الْإِسْتِبْدَالِ بِأَرْضٍ أُخْرَى، وَفِي نَحْوِ هَذَا عَنِ الْأَنْصَارِيِّ صَحَّةُ الشَّرْطِ، لَكِنْ لَا يَبِيعُ الْإِبَازَنُ الْحَاكِمَ وَيَنْبَغِي لِلْحَاكِمِ إِذَا رَفَعَ إِلَيْهِ وَلَا مَنْفَعَةٌ فِي الْوَقْفِ أَنْ يَأْذَنَ فِي بَيْعٍ إِذَا رَأَاهُ أَنْظَرَ لِأَهْلِ الْوَقْفِ وَلَوْ أُرِيدَ تَجْوِيزُ الْإِسْتِبْدَالِ بِغَيْرِ شَرْطٍ الْإِسْتِبْدَالُ فِيمَا إِذَا كَانَ أَحْسَنَ لِلْوَقْفِ كَانَ حَسَنًا.“^۱

ترجمہ: ”اسی طرح وقف کی زمین جب کہ اس کی آمدنی اس قدر کم ہو کہ اس سے کاشت بھی نہ ہو سکے اور آمدنی اخراجات سے زیادہ نہ ہو پائے، اور دوسری زمین سے تبادلہ میں وقف کے لئے نفع اور بہتری ہو، اس طرح کی وقف کی جانب سے شرط لگانا درست ہے، جیسا کہ فقیہ انصاری رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی سے منقول ہے۔ البتہ مناسب ہوگا کہ حاکم کی اجازت کے بغیر فروخت نہ کیا جائے اور حاکم کا فریضہ یہ ہے کہ جب معاملہ اس کے سامنے پیش ہو۔ اور وقف کی اس زمین کو برقرار رکھنے کی صورت میں نفع نہ ہو، اور بیچنے کو مستحقین وقف کے لئے زیادہ بہتر محسوس کرے، تو اس کو فروخت کرنے کی اجازت دے دے اور اگر شرط استبدال کے بغیر بھی اس صورت میں جب کہ تبادلہ وقف کے لئے بہتر ہو، استبدال کا جواز مراد ہو تو بہتر ہوگا۔“

”وَلَوْ كَانَتْ الْأَرْضُ مُتَّصِلَةً بِبُيُوتِ الْمَصْرِ، يَرْغَبُ النَّاسُ فِي اسْتِئْجَارِ بَيْوتِهَا، وَتَكُونُ غَلَّةُ ذَلِكَ فَوْقَ غَلَّةِ الزَّرْعِ أَوْ النَّخِيلِ، كَانَ لِلْقِيمِ أَنْ يَبْنِيَ فِيهَا بَيْوتًا فَيُؤَاجِرُهَا.“^۲

ترجمہ: ”اگر زمین شہر کی آبادی سے ملی ہوئی ہے، لوگ اس کے مکانات کو کرایہ پر لینے کے خواہاں ہیں اس کی آمدنی کھیتی اور کھجور کے مقابلہ میں بڑھی ہوئی ہے تو وقف کے نگران کے لئے جواز ہے کہ اس میں بلڈنگ تعمیر کریں اور اسے کرایہ پر لگا دیں۔“

غیر عربی زبان میں خطبہ

خطبہ جمعہ کی زبان کے سلسلہ میں سلف صالحین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ مالکیہ، شوافع، اور حنابلہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک خطبہ عربی زبان میں واجب ہے یہی رائے فقہائے احناف میں امام ابو یوسف

وامام محمد رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی ہے۔ ہاں، ایسا شخص جو عربی میں خطبہ دینے پر قادر نہ ہو، عجمی زبان میں بھی صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک خطبہ دے سکتا ہے اور امام ابو حنیفہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک جو شخص عربی میں خطبہ دینے پر قدرت رکھتا ہو وہ بھی غیر عربی زبان میں خطبہ دے سکتا ہے، علامہ شامی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”لم یقید الخطبة بكونها بالعربية اكتفاء بما قدمه في باب صفة الصلوة من انها غير شرط ولومع القدرة على العربية عنده خلافا لهما حيث شرطها الا عند العجز.“^۱

ترجمہ: ”مصنف نے خطبہ کے عربی میں ہونے کی قید نہیں لگائی کیوں کہ باب صفة الصلوة میں گزر چکا ہے کہ امام ابو حنیفہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک گو عربی پر قادر ہو پھر بھی عربی میں خطبہ دینا شرط نہیں، صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کو اس سے اختلاف ہے ان کے نزدیک غیر عربی میں خطبہ جائز ہونے کے لئے عربی زبان سے عاجز ہونے کی شرط ہے۔“

مولانا محمد علی مونگیری رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے امام سرحی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی ”محیط“ سے نقل کیا ہے:

”لو خطب بالفارسية جاز عند أبي حنيفة على كل حال وروی بشر عن أبي يوسف أنه إذا خطب بالفارسية وهو يحسن العربية لا يجزيه إلا أن يكون ذكر الله في ذلك بالعربية في حرف أو أكثر.“^۲

ترجمہ: ”اگر فارسی زبان میں خطبہ دے تو امام ابو حنیفہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک بہر صورت جائز ہے بشر رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے امام ابو یوسف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی سے روایت کیا ہے کہ جو شخص اچھی طرح عربی سے واقف ہو اس کے لئے فارسی زبان کا خطبہ نا کافی ہے سوائے اس کے کہ خطبہ میں اللہ کا ذکر ایک یا اس سے زیادہ حرف میں عربی زبان میں بھی آگیا ہو۔“

زبان کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی اور ان کے صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے درمیان تین امور میں اختلاف ملتا ہے، اول اس میں کہ نماز کا تحریمہ غیر عربی میں ہو سکتا ہے یا نہیں دوسرے اس میں کہ قرآن مجید کی قرأت غیر عربی زبان میں درست ہے یا نہیں؟ تیسرے اس میں کہ خطبہ عربی میں دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟..... قرأت قرآن کے مسئلہ میں امام صاحب نے صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے کی طرف رجوع کیا ہے اور امام طحاوی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کا رجحان ہے کہ خود صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے قرأت کے علاوہ دونوں مسئلوں میں اپنی رائے سے امام صاحب رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے کی طرف رجوع کر لیا تھا چنانچہ علامہ طحاوی، تاتارخانیہ سے

سے نقل کرتے ہیں:

”أن الشروع بالفارسية كالتلبية يجوز إتفاقا أى لغير العاجز فظاهره رجوعهما

إليه لا هو إليهما وهذا عكس القراءة فإنه رجع إليهما.“^۱

ترجمہ: ”فارسی زبان میں نماز شروع کرنا (یعنی تحریمہ کہنا) تلبیہ کی طرح ایسے شخص کے لئے بھی

جائز ہے جو عربی میں کہنے سے عاجز نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ میں خود صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ نے

امام صاحب کی طرف رجوع کیا ہے نہ کہ امام صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ نے صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ

کی طرف۔ اس کے برعکس فارسی میں قراءت قرآن کا مسئلہ ہے کہ اس میں امام صاحب

رحمہما اللہ تعالیٰ نے صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرمایا ہے۔“

جہاں تک خطبہ جمعہ کی بات ہے تو وہاں یہ اختلاف قائم و باقی ہے، اس لئے کہ شرنبلالی رحمہما اللہ تعالیٰ

نے ایک طرف یہ صراحت بھی کی ہے کہ:

”الأصح أن الامام رجع إلى موافقة صاحبيه في عدم جواز الشروع في

الصلوة بالفارسية وغيرها من أى لسان غير عربي لغير العاجز عن العربية.“^۲

ترجمہ: ”صحیح تر قول یہ ہے کہ امام صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لئے جو عربی زبان

سے عاجز نہ ہو فارسی زبان میں تحریمہ کے مسئلہ میں صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کی رائے کی طرف رجوع

کر لیا ہے، نیز اس بات میں بھی کہ نماز اور غیر نماز میں ایسے شخص کے لئے غیر عربی زبان میں قراءت

قرآن جائز نہیں۔“

اور یہی شرنبلالی رحمہما اللہ تعالیٰ ہیں جو خطبہ جمعہ کے مسئلہ میں رجوع کا ذکر کئے بغیر امام صاحب

رحمہما اللہ تعالیٰ کا مذہب نقل کرتے ہیں:

”الرابع الخطبة ولو بالفارسية من قادر على العربية.“^۳

ترجمہ: ”چوتھے۔ خطبہ، گو فارسی زبان میں ہو اور ایسا شخص خطبہ دے رہا ہو جو عربی زبان پر قدرت

بھی رکھتا ہو۔“

اور پھر طحاوی رحمہما اللہ تعالیٰ جیسا فقیہ اور بالغ نظر شارح اس پر سکوت اختیار کرتا ہے اور کچھ کہے بغیر

آگے گزر جاتا ہے، علامہ ہسکفی رحمہما اللہ تعالیٰ نے صراحت کی ہے کہ امام صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ نے صرف

قراءت قرآن ہی کے مسئلہ میں رجوع کیا ہے، دوسرے مسائل میں نہیں۔

”إنما رجوع الامام انما ثبت بالقراءة بالفارسية فقط.“^{۱۷}
 ترجمہ: ”امام صاحب رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی سے فارسی زبان میں صرف قرأت قرآن ہی کے مسئلہ میں
 صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی طرف رجوع کرنا مہمت ہے۔“
 فتاویٰ سراجیہ میں ہے:

”ولو خطب بالفارسية يجوز.“^{۱۸}

ترجمہ: ”فارسی میں خطبہ جائز ہے۔“

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”أفضل آنت کہ خطبہ بزبان عربی باشد و نزد ابوحنیفہ بغیر عربی نیز جائز است بزبانیکہ باشد۔“^{۱۹}
 ترجمہ: ”افضل ہے کہ خطبہ عربی زبان میں ہو، امام ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک غیر عربی
 میں جائز ہے کوئی سی بھی زبان ہو۔“

مولانا عبدالحق فرنگی محل لکھنوی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی بھی غالباً اس کو جائز تصور کرتے ہیں، فرماتے ہیں:
 ”خطبہ خواندن بزبان غیر عربی فارسی باشد یا دیگرے نزد امام اعظم بدون عذر و عجز جائز است ما خلاف
 افضل است و نزد صاحبین درست نیست۔“^{۲۰}

ترجمہ: ”غیر عربی زبان میں خطبہ دینا فارسی ہو یا کوئی اور زبان امام ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے
 نزدیک بلا عذر و مجبوری بھی جائز ہے لیکن خلاف افضل ہے اور صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک
 درست نہیں ہے۔“

جو حضرات عربی زبان میں خطبہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، ان کے پیش نظر یہ ہے کہ ”خطبہ“ ذکر ہے اس
 لئے اس کو اس زبان میں ہونا چاہئے جس زبان میں آپ ﷺ سے منقول ہے اور ظاہر ہے وہ عربی زبان
 ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا کہ فارسی اور عجمی علاقوں میں سلف کے زمانہ میں عربی کے
 بجائے مقامی زبان میں خطبہ دیا گیا ہو..... جو حضرات مخاطب کی زبان میں خطبہ کی اجازت دیتے ہیں، وہ کہتے
 ہیں کہ خطبہ کا مقصد بنیادی طور پر تذکیر و موعظت ہے، خطبہ کا یہ مقصد خود اس کے لفظ سے بھی ظاہر ہے، فقہاء کی
 صراحتوں سے بھی اور ان خطبات کے مضامین سے بھی جو آپ ﷺ سے مروی ہیں اور جن میں آپ
 ﷺ نے مواقع و حالات کی مناسبت سے ہدایات کی ہیں اور یہ مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب خطبہ

^{۱۷} فتاویٰ سراجیہ: ص ۱۷، باب الجمعة

^{۱۸} درالمختار علی هامش الشامی: ۳۲۵/۱

^{۱۹} مجموعة الفتاویٰ علی هامش خلاصة الفتاویٰ: ۱۴۱/۱

^{۲۰} شرم سفر السعادة: ۲۶۷

مخاطب کی زبان میں دیا جائے۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ ایک تو یقین کے ساتھ یہ کہنا ہی مشکل ہے کہ کہیں غیر عربی زبان میں خطبہ نہ دیا گیا ہو یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ عدم ذکر عدم ثبوت کی دلیل نہیں ہوتا، دوسرے اس وقت عربی ایک فاتح قوم کی زبان تھی اور یہ ایک قومی نفسیات ہے کہ مفتوح قومیں فاتح قوم کی زبان کو سیکھنے کی سعی کرتی ہیں، جس کی مثال موجودہ دور میں انگریزی زبان ہے، اب حالات اس سے یکسر مختلف ہیں اور احوال کی تبدیلی سے احکام میں تبدیلی ہوا کرتی ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ عربی زبان میں خطبہ کی رائے رائج اور اکثر سلف صالحین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے مسلک کے مطابق ہے اور موعظت و تذکیر کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے خطبہ سے پہلے مقامی زبان میں وعظ و تقریر کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے، البتہ اردو یا غیر عربی زبان میں خطبہ کو بدعت اور کراہت سے موسوم کرنا اور اس معاملہ میں شدت برتنا مناسب نہیں ہے۔

غیر عربی زبان میں خطبہ کے موضوع پر عرب علماء محققین نے بھی خاصی بحث کی ہے اور اسلامک فقہ اکیڈمی، رابطہ عالم اسلامی جدہ نے اپنے پانچویں، سمینار منعقدہ ۸/ تا ۱۶/ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ میں اس موضوع پر جو بات بہ اتفاق رائے طے کی ہے وہ یہ ہے۔

”معتدل اور قابل قبول رائے یہ ہے کہ جن ممالک کی زبان عربی نہ ہو وہاں عربی زبان ہی میں جمعہ و عیدین کے خطبے دینا شرط نہیں ہے، البتہ بہتر ہے کہ خطبہ کا تمہیدی حصہ اور خطبہ میں آنے والی آیات قرآنی عربی زبان میں ہوں، تاکہ غیر عرب عربی زبان سننے کے عادی ہوں۔ قرآن کا سیکھنا اور اس کی زبان میں اس کی قرأت آسان بھی ہے، پھر خطیب سامعین ہی کی زبان میں ان کو نصیحت کرے اور ان کو دعوت دے۔“

سمندری جہاز میں نماز جمعہ

حجاج کو اکثر اوقات یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ سمندری جہاز میں نماز جمعہ ادا کی جائے یا نہیں؟ امام ابو حنیفہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک چونکہ نماز جمعہ صحیح ہونے کے لئے ”شہر“ (مصر) ہونا بھی شرط ہے، اس لئے نماز جمعہ کی ادائیگی درست نہیں۔ دوسرے فقہاء کے یہاں یہ شرط نہیں ہے، دوسرے فقہاء کے یہاں بھی سمندر میں جمعہ کی نماز حالت سفر میں ہونے کے باعث واجب تو نہ ہوگی لیکن ادا کر لی جائے تو کافی ہو جائے گی۔

دیہات میں جمعہ کی نماز

جمعہ کے صحیح ہونے کے لئے ایک شرط احناف کے نزدیک شہر ہونا ہے لیکن خود احناف کے نزدیک اس

بارے میں خاصا اختلاف ہے کہ شہر (مصر) کا اطلاق کس طرح کی آبادی پر ہوگا؟ اس سلسلہ میں متداول اقوال ذکر کئے جاتے ہیں:

- ۱ قاضی ابو یوسف رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کہتے ہیں کہ وہ جگہ جہاں ہر پیشہ و حرفت کا آدمی موجود ہو، عام انسانی ضروریات کی تمام چیزیں دستیاب ہوں اور قاضی بھی موجود ہو جو اسلامی سزا جاری کرتا ہو۔
- ۲ جس کی مجموعی آبادی دس ہزار ہو۔
- ۳ جہاں دس ہزار ایسے لوگ ہوں جو جنگ کے کام آئیں۔
- ۴ اگر دشمن حملہ آور ہو تو وہ آبادی خود اپنے دفاع کی اہل ہو۔
- ۵ جہاں امیر و قاضی موجود ہوں۔
- ۶ اس آبادی کے لوگ وہاں کی بڑی مسجد میں اکٹھے ہو جائیں تو مسجد ان کے لئے ناکافی ہو۔
- ۷ ایسا مرکز ہو کہ ایک پیشہ کا آدمی دوسرے پیشہ میں لگے بغیر ایک ایک سال تک صرف اپنے پیشہ سے زندگی بسر کر لے۔
- ۸ امام محمد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سے مروی ہے کہ امیر جس کو شہر قرار دے دے، وہ شہر ہے۔
- ۹ امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سے مروی ہے کہ وہ جگہ جہاں مفتی، امیر اور قاضی موجود ہوں، احکام و حدود قائم ہوں یا کم از کم بالقوہ قائم کئے جاسکتے ہوں اور اس کے مکانات منی کے مکانات کے برابر ہوں۔
- ۱۰ حضور ﷺ کے زمانہ میں مکہ و مدینہ کی جو کیفیت تھی، جو جگہ اس کے مطابق ہو وہ شہر ہے۔
- ۱۱ جہاں کی آبادی چار ہزار ہو۔
- ۱۲ جہاں کی آبادی ایک ہزار ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ”مصر“ (شہر) ان اصطلاحات میں سے ہے کہ کتاب و سنت میں اس کی تحدید و تعیین نہیں کی گئی ہے، اس لئے اس کا مدار عرف پر ہے، لوگوں کے عرف میں جس زمانہ میں جو جگہ شہر کہلائے اور حکومت کی طرف سے جس کو شہر کی حیثیت دی جائے، وہی ”شہر“ ہے، تاہم ہندوستان وغیرہ کے موجودہ حالات میں..... کہ بعض علاقوں میں جمعہ ہی مسلمانوں کی شناخت رہ گئی ہے اور اسی کے ذریعہ نماز اور اسلام سے لوگ اپنی وابستگی کا احساس کرتے ہیں..... ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ آراء و خیالات کے ان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر شہر کے مفہوم میں جس قدر توسیع ممکن ہو، پیدا کی جائے کہ جمعہ محض ایک عبادت ہی نہیں، تذکیر و دعوت بھی ہے۔

مسلمانوں کی اجتماعیت کا اظہار بھی ہے اور اسلام کا ایک شعار بھی..... فقہاء نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ جس جگہ کے تمام لوگ اگر وہاں کی بڑی مسجد میں جمع ہو جائیں تو وہ مسجد ناکافی ہو جائے، اس آبادی پر ”شہر“ کا اطلاق ہوگا۔

یہ قول ایسا ہے کہ اس سے مصر کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے، لہذا مناسب ہے کہ اس قول پر فتویٰ دیا جائے۔

جنگ کے دوران نماز

جنگ کے دوران اگر لوگ مامون ہوں، تب تو اسی طرح نماز ادا کرنی چاہئے جو معمول ہے اور اگر ایسے حالات نہ ہوں کہ پرسکون طور پر نماز ادا کی جاسکے بلکہ دشمنوں کا سخت اندیشہ ہو تو اپنی اپنی سواری پر اشارہ سے رکوع و سجود کرتے ہوئے بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے اور اگر قبلہ رخ ہونے میں خطرہ ہو تو جدھر ممکن ہو رخ کر کے نماز پڑھے:

”وإن اشتد الخوف صلوا ركباناً وحداناً يؤمّون بالركوع والسجود إلى أي جهة

شاءوا إذا لم يقدرُوا على التوجه إلى القبلة.“^۱

لیکن اس کی گنجائش نہ ہوگی کہ جہاد کرتے ہوئے درمیان میں نماز کی نیت بھی کر لے بلکہ ایسے مواقع پر بعد میں قضا کر لینی چاہئے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے غزوہ احزاب کے موقع پر چار نمازوں کی قضا فرمائی تھی۔

ٹرین میں نماز

ٹرین میں نماز پڑھنی درست ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی عذر نہ ہو مثلاً آگے کوئی اسٹیشن آنے والا ہو، جہاں اتر کر نماز ادا کی جاسکتی ہو تو بھی نماز ہو جائے گی۔ چنانچہ فقہاء نے ایسی سواری کو جسے جانور کھینچ کر لے جائے اور اس کا کوئی حصہ جانور کے جسم پر رکھا ہو نہ ہو ”سریر“ یعنی تخت کے درجہ میں رکھا ہے اور بلا عذر اس پر نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ اور اگر اس کا ایک حصہ جانور کے اوپر رکھا ہوا ہو جیسے کجاوہ وغیرہ ہوتا ہے۔ اس پر نماز پڑھنا جانور پر نماز پڑھنے کے مترادف ہے جس کی اجازت بدرجہ ضرورت دی جاتی ہے۔

ٹرین میں ڈبے انجن پر نہیں ہوتے بلکہ اس سے ملحق ہوتے ہیں۔ انجن کی قوت ان کو کھینچتی ہے اس لئے وہ بھی سریر کے درجہ میں ہے اور بلا عذر بھی نماز ان پر درست ہے۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

”وأما الصلوة على العجلة إن كان طرف العجلة على الدابة وهي تسير

أولاتسیر فہی صلوة على الدابة تجوز حالة العذر ولا تجوز في غيرها وإن لم

يكن طرف العجلة على الدابة جازوهى بمنزلة الصلوة على السريو۔^۱ ”سواری پر نماز کا مسئلہ یوں ہے کہ اگر گاڑی کا ایک حصہ بہر حال جانور کے اوپر رہتا ہو۔ چاہے وہ چلے یا نہ چلے تب تو اس گاڑی پر نماز کی ادائیگی خود جانور ہی پر نماز کی ادائیگی ہے۔ عذر کی بناء پر درست ہے۔ بلا عذر جائز نہیں اور اگر گاڑی کا ایک حصہ جانور پر نہ ہو تو نماز درست ہے اور وہ تحت پر نماز پڑھنے کے حکم میں ہے۔“

البتہ فقہ کے عام اصول کے مطابق کھڑے ہونے پر قدرت ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھنا درست نہ ہوگا۔

ٹیپ ریکارڈ کی قرأت پر سجدہ تلاوت

ٹیپ ریکارڈ سے تلاوت ہو تو یہاں دو مسئلے ہیں:

ایک یہ کہ کیا اس کے بھی وہی آداب ہوں گے جو براہ راست قاری سے سننے کے ہیں؟ دوسرے اگر اسی طرح آیت سجدہ کی تلاوت ہو تو کیا اس کی وجہ سے سجدہ واجب ہو جائے گا؟

قرآن سننے کے آداب کا تعلق ان تمام صورتوں سے ہے جن میں کسی مسلمان کے کان میں کلام الہی کے الفاظ پہنچ جائیں۔ خواہ وہ خود تلاوت کرنے والے کی زبان سے ہو یا کسی اور ذریعہ سے۔ اس لئے سماعت کے آداب یعنی خاموشی اختیار کرنا اور قرآن مجید کی طرف متوجہ رہنا ٹیپ ریکارڈ سے قرآن سنتے وقت بھی ضروری ہے اور سننے والے کو چونکہ اسی بنیاد پر اجر ملتا ہے۔ اس لئے انشاء اللہ اجر بھی ملے گا۔ جہاں تک سجدہ تلاوت کی بات ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ خود تلاوت کرنے والے (تالی) سے سنے اور اس کی زبان اس کے لئے متحرک ہو۔ ٹیپ ریکارڈ کی تلاوت خود تالی کی تلاوت نہیں ہے بلکہ اس کی زبان سے ہونے والے تموج کو محفوظ رکھنے کے بعد بعض دوسرے ذرائع سے اس کے اندر آواز پیدا کر دی جاتی ہے اس لئے اس سے سجدہ تلاوت واجب نہ ہوگا۔ اور اس کی نظیر فقہاء کی یہ تصریح ہے کہ سکھائے ہوئے پرندوں اور گونج سے پیدا ہونے والی صدائے بازگشت سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔

”ولا تجب اذا سمعها من طير هو المختار... وان سمعها من الصدى لا تجب عليه كذا في الخلاصة۔“^۲

ریڈیو وی پر تلاوت

ریڈیو کے ذریعہ قرآن مجید نشر کئے جانے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ قاری تلاوت کرے اور براہ راست

^۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۱۳۲ فصل فی سجود التلاوة

^۲ قاضی خان علی ہامش الہندیہ: ۱/۱۷۱

اسے نشر کیا جائے، اس صورت میں قرآن مجید اصل تلاوت کرنے والے سے سنا جاتا ہے، اس لئے آیت سجدہ پڑھی جائے تو سجدہ واجب ہوگا، دوسری صورت یہ ہے کہ تلاوت کو ٹیپ کر لیا جائے اور پھر اسے ریڈیو کے ذریعہ نشر کیا جائے، اس صورت میں یہ براہ راست اس کی تلاوت نہیں ہے، بلکہ پہلے سے کی ہوئی تلاوت کا تکرار و اعادہ ہے، اس صورت میں سننے والوں پر سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوگا، یہی حکم نبی وی کا بھی ہے کہ براہ راست ٹیلی کاسٹ کی جائے تو سامعین پر سجدہ واجب ہوگا، اور اگر پہلے تلاوت کی ویڈیو کیسٹ تیار کر لی جائے پھر اس کیسٹ کو نشر کیا جائے تو سامعین پر سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ عام طور پر آج کل ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں براہ راست نشر و ابلاغ نہیں ہوا کرتا، بلکہ پہلے کیسٹ تیار کی جاتی ہے پھر اسے نشر کیا جاتا ہے، تاہم براہ راست نشر و ابلاغ بھی متروک نہیں ہے، لہذا اگر کسی مناسب ذریعہ سے صحیح نوعیت معلوم نہ ہو تو ازراہ احتیاط سجدہ تلاوت کر لینا چاہئے۔

آیت سجدہ کا ٹائپ یا کمپوزنگ

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ تلاوت اصل میں دو ہی صورتوں میں واجب ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ایک تلاوت کرنے والے پر، دوسرے سننے والے پر۔

اس لئے اگر آیت سجدہ کی کتابت کی جائے یا اسے ٹائپ یا کمپوز کیا جائے اور زبان سے آیت کا تکلم نہ کیا جائے یا صرف اس کے ایک ایک حرف تجزی کا تلفظ کیا جائے تو سجدہ تلاوت واجب نہ ہوگا، چنانچہ ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ کا بیان ہے:

”وفی اضافة السجود الى التلاوة اشارة الى انه اذا كتبها أو تهجأ لا يجب عليه سجود.“^۱

ترجمہ: ”سجدہ کی تلاوت کی طرف نسبت کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر آیت سجدہ کو لکھے یا اس کے حروف ہجا کو جے کے ساتھ ادا کرے تو اس پر سجدہ تلاوت واجب نہ ہوگا۔“

لاؤڈ اسپیکر پر اذان

اذان کا مقصود نماز کا اعلان اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کی اطلاع دینا ہے۔ اس مقصد کے لئے فقہاء بسا اوقات ایسی باتوں کی بھی اجازت دیتے ہیں جو اذان کے عام اصول کے خلاف ہے۔ مثلاً اذان کے وقت آدمی کو قبلہ رخ ہونا چاہئے اور ”حی علی الصلوٰۃ“ اور ”حی علی الفلاح“ کے کلمات کے وقت سینہ کے انحراف کے بغیر صرف گردن دائیں بائیں موڑنا چاہئے لیکن اگر مینارہ میں اذان دی جا رہی ہو اور مینارہ کی وسعت کی وجہ سے اپنی

جگہ رہتے ہوئے صرف گردن موڑنے کے بعد دائیں اور بائیں جانب باہر کو آواز پہنچانی مشکل ہو تو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے پورے وجود کو دائیں اور بائیں جانب پھیر دے۔

”وإن استدار في صومعته فحسن ومراده إذا لم يستطع تحول الوجه يمينا وشمالا مع ثبات قدميه مكانهما كما هو السنة بأن كانت الصومعة متسعة فأما من غير حاجة فلا.“^۱

لاؤڈ اسپیکر چونکہ اس مقصد کے لئے بہت مفید اور کارآمد ہے اور کسی شرعی ممانعت کے بغیر آسانی اور سہولت کے ساتھ دور دور تک اس کے ذریعہ آواز پہنچائی جاسکتی ہے۔ اس لئے اس کا استعمال بہتر اور مستحسن ہوگا۔

مساجد کے اندر لاؤڈ اسپیکر میں اذان

مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکروں کے استعمال کی وجہ سے اب اذان خانوں کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے اور اندرون مسجد ہی مانک کی مدد سے اذان دی جاتی ہے۔ اس سے دور تک آواز پہنچانے کا مقصد توبہ خوبی اور بہ آسانی حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس سے ماثور و منقول طریقہ کی پیروی بھی کما حقہ نہیں ہو پاتی جو مسجدوں سے باہر اذان دینے کی تھی، فقہاء نے قرون خیر سے متواتر و منقول عمل کو دیکھتے ہوئے فرمایا تھا:

”ينبغي أن يؤذن على المئذنة أو خارج المسجد ولا يؤذن في المسجد.“^۲
ترجمہ: ”مناسب ہے کہ اذان، اذان خانہ پر یا مسجد کے باہر دی جائے۔ مسجد میں اذان نہ دی جائے۔“

اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ مسجد سے متصل کوئی ایسا کمرہ بنالیا جائے جس میں مانک رکھا جائے اور وہیں سے مؤذن اذان دیا کرے تاکہ اس سنت کی بھی پوری پوری پیروی ہو جائے۔

قراءت قرآن میں موسیقی

قرآن مجید کو بہتر اور عمدہ آواز سے پڑھنا مطلوب اور پسندیدہ ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قرآن کو اپنی آواز سے زینت دو“ لیکن قرآن پڑھنے میں بے جا تکلف، غنائیت اور موسیقیت پیدا کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”اقرأ القرآن بلحون العرب وأصواتها وإياكم ولحون أهل العشق ولحون

^۱ لہ الهدایہ: ۷۲/۱ ^۲ فتاویٰ قاضی خان: ۷۸/۱ ^۳ ابوداؤد عن براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۲۰۷/۱ باب

کیف يستحب الترتیل فی القراءۃ۔ ابن ماجہ عن براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۹۵/۱ باب فی حسن الصوت بالقرآن

أهل الكتابيين سيجيئي بعدى قوم يرجعون بالقرآن ترجيع الغناء والنوح لا
يجاوز حناجرهم مفتونة قلوبهم وقلوب الذين يعجبهم شأنهم: ۱۰
ترجمہ: ”قرآن مجید عربوں کے لحن اور ان کی آواز میں پڑھو۔ اہل عشق اور اہل کتاب کے لحن سے
بچو میرے بعد کچھ لوگ آئیں گے جو قرآن کو نغمگی اور نوحہ کے ساتھ پڑھیں گے، قرآن ان کے
حلق سے نیچے نہ اترے گا، ان کے اور ان کی اس ادا کو چاہنے والوں کے دل فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔“
حافظ جلال الدین سیوطی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۸۳۹-۹۱۱ھ) نے ”جمال القراء“ سے نقل کیا ہے کہ قرآن مجید
کو ترنم ریز آواز (اصوات الغناء) میں پڑھنا بدعت ہے۔ اس طرح نغمگی کے ساتھ پڑھنے کی کئی صورتیں
ہیں اور سب ہی ناپسندیدہ ہیں:

- ۱ ترعید: اپنی آواز میں ایسا لرزہ پیدا کیا جائے بوٹھنڈک وغیرہ کی وجہ سے ہو جایا کرتا ہے۔
- ۲ ترقیص: حرف ساکن پر دیر تک سکون کا تلفظ کیا جائے۔ پھر حرکت کے ساتھ آگے بڑھا جائے۔
- ۳ تطریب: قرآن مجید کو اس طرح ترنم سے پڑھنا کہ جہاں مد نہ ہو وہاں مد آجائے اور جہاں مد ہو وہاں
مناسب مقدار سے زیادہ کھینچ دیا جائے۔
- ۴ تحزین: مصنوعی طور پر ایسی غمگین آواز سے پڑھنا کہ گویا خشوع و خضوع کے باعث بے ساختہ رویا چاہتا
ہے۔

اس کے علاوہ اس طرح پڑھنا کہ کوئی حرف کٹ جائے۔ مثلاً أَفَلَا تَعْقِلُونَ کو فَلَ تَعْقِلُونَ اور قالوا امنا
کو قالُ امنا یہ طریقہ اس قابل ہے کہ اس کو تحریف قرار دیا جائے۔

اگر پوری لاش نہ مل پائے

اگر خدا نخواستہ کسی شخص کی موت ایسی چیز کے ذریعہ ہوئی جس میں لاش بکھر جاتی ہے اور اس کے ٹکڑے
ٹکڑے ہو جاتے ہیں، تو اگر سر کے ساتھ جسم کا نصف حصہ اور سر نہ ہو تو جسم کا اکثر حصہ مل جائے تب تو اسے غسل
دیا جائے گا اور نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اگر نصف سے بھی کم حصہ مل پائے تو نہ اسے غسل دیا جائے گا اور نہ
اس پر نماز پڑھی جائے گی۔

”وما لم یزد علی النصف لا یصلی علیہ فلا یغسل ایضاً۔“ ۱۱

۱۱ بیہقی عن حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۲ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ: الاتقان فی علوم القرآن: ۲۷۵/۱، ۲۷۶ حکم القراءۃ باصوات الغناء

۱۳ بدائع الصنائع: ۳۰۲/۱ نیز دیکھئے: ۱۵۹/۱

سمندر میں تدفین

اگر کسی شخص کا سمندری سفر کے دوران انتقال ہو جائے اور ساحل تک پہنچنے میں لاش کے سڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص پر نماز پڑھنے کے بعد کوئی وزنی چیز باندھ دی جائے اور سمندر میں ڈال دیا جائے۔
 ”من مات فی السفینۃ یغسل ویکفن ویصلی علیہ ویرمی فی البحر۔“^۱

تابوت میں تدفین

آج کل بعض ممالک میں مردوں کی تدفین کے لئے تابوت کا استعمال کیا جاتا ہے، مسنون طریقہ تدفین کا یہ ہے کہ مٹی میں تدفین کی جائے۔ اسی لئے تابوت میں مردہ کی تدفین کو مکروہ قرار دیا گیا ہے خواہ وہ لکڑی کا ہو یا لوہے و پتھر کا، البتہ فقہاء نے حاجت کے موقع پر تابوت میں تدفین کی اجازت دی ہے اور اس صورت میں بھی بہتر طریقہ یہ ہے کہ تابوت کے اندر جس حصہ سے مردہ کا جسم مس کرتا ہے وہاں مٹی بچھا دی جائے یا لیپ دی جائے اور دائیں بائیں کچھ کچی اینٹیں رکھ دی جائیں چنانچہ علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”یرخص ذالک عند الحاجة والا کرہ کما قد مناه النقا قال فی الحلۃ نقل غیر واحد عن الامام ابن الفضل أنه جوزہ فی أراضیہم لرخاوتہا وقال لکن ینبغی أن یفرش فیہ التراب وتطین الطبقة العليا ممایلی ویجعل اللبن الخفیف علی یمین المیت ویسارہ لیصیر بمنزلۃ اللحد۔“^۲

ترجمہ: ”حاجت کے وقت اس کی رخصت ہے ورنہ مکروہ ہے جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ”حلیہ“ میں مذکور ہے کہ متعدد لوگوں نے امام ابن الفضل رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سے نقل کیا کہ انہوں نے اپنے علاقہ کی زمینوں کے نرم ہونے کی وجہ سے تابوت کی اجازت دی اور کہا کہ مناسب یہ ہے کہ اس میں مٹی بچھا دی جائے اور اوپری حصہ میں مٹی کی لیپ لگا دی جائے اور دائیں بائیں کچی اینٹیں رکھ دیں تاکہ ”لحد“ کے درجہ میں ہو جائے۔“

عام طور پر فقہاء نے اپنے زمانہ کے احوال کے لحاظ سے ”حاجت“ سے زمین کا دلدلی اور بہت مرطوب ہونا مراد لیا ہے لہذا ایسے مقامات میں تو تابوت میں تدفین جائز ہوگی ہی، اگر کسی ملک میں قانونی طور پر تابوت میں مردوں کی تدفین ہی کی اجازت ہو تو یہ بھی ایک حاجت متصور ہوگی، البتہ مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ مناسب آئینی وسائل کو اختیار کرتے ہوئے ایسے قوانین میں تبدیلی کی کوشش کریں۔

^۱ رد المحتار: ۵۹۹/۱ نیز دیکھئے البحر الرائق: ۱۹۴/۲

^۲ البحر الرائق: ۱۹۳/۲

روزہ

طویل الاوقات علاقوں میں روزہ

روزہ کے اوقات کے سلسلہ میں اس بات کی قرآن وحدیث میں تصریح ہے کہ طلوع فجر سے اس کا آغاز اور غروب آفتاب پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ اس پر امت کا اجماع ہے۔ اس لئے یہ تو ظاہر ہے کہ روزہ کے اصل اوقات یہی ہیں۔ جغرافیائی اور موسمی حالات کے لحاظ سے ان میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے۔ خود ہمارے ملک ہندستان میں بھی ایسا تفاوت ہوتا رہتا ہے۔

اب اگر کہیں اوقات کا تھوڑا بہت فرق ہو مثلاً دن ۱۲ گھنٹوں کے بجائے ۱۶ یا ۱۷ گھنٹوں کا ہو جائے تب تو ظاہر ہے روزہ کا یہی حکم رہے گا۔ لیکن اگر غیر معمولی فرق ہو جائے۔ مثلاً ۲۰ یا ۲۲ گھنٹوں کا دن ہو جائے اور دو چار گھنٹوں کی رات رہ جائے تو بھی قرآن وحدیث کے عمومی احکام کا تقاضا ہے کہ روزہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ہو اور فتویٰ اسی پر ہے۔

البتہ چونکہ بسا اوقات اس کی وجہ سے غیر معمولی مشقت پیدا ہو جائے گی اور عمر رسیدہ یا کمزور آدمیوں کے لئے روزہ رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ ان کو یہ خصوصی سہولت دی جاسکتی ہے کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ نہ رکھیں اور آئندہ جب موسم ہلکا اور قابل تحمل ہو جائے ان کے اوقات نسبتاً کم ہو جائیں تو قضاء کر لیں، کیوں کہ فقہاء نے بھوک و پیاس کی ہلاکت خیز شدت کو بھی روزہ توڑنے کے لئے عذر قرار دیا ہے۔

”ومنها العطش والجوع كذا لك إذا خيف منهما الهلاك ونقصان العقل كالأمة إذا ضعفت عن العمل وخشيت الهلاك بالصوم وكذا الذى ذهب به موكل السلطان إلى العمارة فى الأيام الحارة إذا خشي الهلاك أو نقصان العقل.“^۱

ترجمہ: ”ان ہی اعذار میں سے بھوک و پیاس ہے جب کہ بھوک یا پیاس کی شدت سے ہلاکت یا دماغی توازن بگڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ مثلاً لونڈی جو کام کی انجام دہی سے عاجز ہو اور روزہ رکھنے کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ رکھتی ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کو شاہی افسر تعمیری اور زراعتی کاموں کے لئے سخت گرم دنوں میں لے جائے اور ہلاکت یا دماغ کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہو۔“

لیکن جہاں ایک طویل عرصہ دن اور پھر اسی طرح رات کا سلسلہ رہتا ہے وہاں جس طرح نماز کے اوقات کا اندازہ سے تعین کیا جائے گا اسی طرح ماہ رمضان کی آمد اور روزہ کے اوقات کا بھی، ایسے مقام کے باشندوں کو ان مقامات کے مطابق عمل کرنا چاہئے جو اس سے قریب ہیں اور وہاں معمول کے مطابق دن و رات کی آمد و رفت کا سلسلہ ہے۔

روزہ میں انجکشن، گلوکوز اور خون چڑھانے کا حکم

انجکشن کے ذریعہ جو چیزیں جسم میں داخل کی جاتی ہیں وہ عموماً رگوں کے واسطے سے قلب و دماغ یا معدہ تک پہنچتی ہیں اور ایک ایسی راہ سے گزرتی ہیں جو اس کی حقیقی راہ اور فقہاء کی زبان میں ”منفذ“ نہیں ہے۔ کتب فقہ کی مختلف نظائر کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہاء ایسی صورتوں کو مفسدِ صوم نہیں قرار دیتے ہیں۔ مثلاً:

① دو قسم کے زخم ہیں جن میں دوا ڈالنے کو فقہاء نے مفسدِ صوم قرار دیا ہے۔ ایک آمہ اور دوسرے جائفہ۔ آمہ سر کے اس گہرے زخم کو کہتے ہیں جو اصل دماغ تک پہنچ گیا ہو۔ اور اس کے ذریعہ دوا بھی وہاں تک پہنچ جاتی ہو۔ جائفہ پیٹ کے اس زخم کو کہتے ہیں جو معدہ تک گہرا ہو۔ اور اس کے ذریعہ دوائیں پیٹ تک پہنچ جاتی ہوں۔ اس طرح گویا یہ زخم معدہ اور دماغ تک پہنچنے کے لئے بلا واسطہ راہ اور منفذ پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے اس میں دوا ڈال دینا مفسدِ صوم ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے زخموں پر دوا ڈالنا مفسدِ صوم نہیں ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی زخم ہو حالاں کہ کوئی بھی زخم جو جسم کے اندرونی حصہ تک پہنچتا ہو اس پر ڈالی گئی دوائیں بالواسطہ معدہ یا دماغ تک پہنچ ہی جاتی ہیں مگر اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

”ولو داوی جائفة أو امّة بدواء فوصل إلى جوفه أو دماغه أفطر عند ابی حنیفة والذی یصل هو الرطب۔“^۱

ترجمہ: ”اگر پیٹ کے یا دماغ کے اندر پہنچے ہوئے زخم کا دوا کے ذریعہ علاج کرے پھر دوا اس کے پیٹ یا دماغ تک پہنچ جائے تو امام ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس طرح مرطوب دوا ہی پہنچ سکتی ہے۔“

امام نووی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”لو أوصل الدواء إلى داخل الساق أو غرز فيه سكيناً أو غيرها فوصلت مخه، لم يفطر بلا خلاف لانه لا يعد عضواً مجوفاً۔“^۲

ترجمہ: ”اگر دوا پنڈلی کے اندرونی حصہ تک پہنچائی، یا چھری یا کوئی دوسری چیز اس میں چھودی اور اس کا اثر گودے تک پہنچ گیا تو بغیر کسی اختلاف کے روزہ نہیں ٹوٹے گا، کیوں کہ وہ عضو ”مجوف“ شمار نہیں کیا جاتا۔“

۲ عورتوں کی شرمگاہ کے اندرونی حصہ میں کوئی چیز رکھی جائے تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ عورتوں کے اندر یہ فطری منفذ موجود ہے جو بطن تک پہنچتا ہے اور اگر مردوں کے عضو تناسل میں کوئی چیز ڈالی جائے تو امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اس لئے کہ معدہ اور اس نالی کے درمیان براہ راست منفذ نہیں ہے بلکہ مثانہ کا واسطہ ہے۔ جہاں سے قطرہ قطرہ پیشاب نیچے آکر جمع ہوتا ہے:

”إذا أقطر في إحليله لا يفسد صومه عند أبي حنيفة ومحمد وفي الإقطار في أقبال النساء يفسد بلا خلاف وهو الصحيح.“^۱

ترجمہ: ”مرد کے پیشاب کی راہ میں قطرہ ڈالے تو امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے یہاں روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ البتہ عورت کی شرمگاہ میں قطرہ ٹپکانے کی صورت میں بلا اختلاف روزہ ٹوٹ جائے گا اور یہی صحیح ہے۔“

۳ کان، ناک اور سرین کے راستہ سے معدہ یا دماغ تک پہنچنے والی چیزوں کو بھی فقہاء نے اس لئے مفسدِ صوم قرار دیا ہے کہ فطری طور پر ایسے راستے موجود ہیں جن سے دوائیں یا غذائیں وہاں تک پہنچائی جاسکیں۔ علامہ کاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”ما وصل الى الجوف او الدماغ من المخارق الاصلية كالأنف والأذن والدبر بان استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه فوصل إلى الجوف أو إلى الدماغ.“
ترجمہ: ”(مفسداتِ صوم میں سے وہ دوائیں ہیں) جو معدہ یا دماغ تک فطری شکاف مثلاً ناک، کان یا سرین کے ذریعہ پہنچیں مثلاً ناک کے ذریعہ چڑھائی جائے یا حقنہ دیا جائے یا کان میں قطرے ڈالے جائیں اور وہ معدہ یا دماغ تک پہنچ جائیں۔“

بعض بزرگوں نے اس کی ایک واضح نظیر کی حیثیت سے اس بات کو پیش کیا ہے کہ سانپ کاٹنے کی وجہ سے کہیں روزہ ٹوٹنے کا ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ اس میں زہر موجود ہے جو پورے جسم میں پھیل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فطری منفذ سے نہیں چڑھتا۔ مگر اس عاجز کے خیال میں یہ استدلال قوی نہیں ہے۔ اس سے روزہ نہ ٹوٹنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ زہر جسم کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ مزید فساد پیدا کرتا ہے۔ فقہی نظائر سے معلوم ہوتا

ہے کہ منہ سے تو جس قسم کی چیز بھی معدہ تک پہنچائی جائے مفسدِ صوم ہوگی، چاہے وہ بدن کی اصلاح کرتی ہو یا یا نہ کرتی ہو لیکن اس کے علاوہ کسی اور راہ سے جسم تک پہنچنے والی وہی چیز مفسدِ صوم ہوگی جس سے بدن کی اصلاح ہوتی ہو۔ چنانچہ صاحبِ ہدایہ نے کان میں ڈالنے والی دوا کو تو روزہ کے لئے مفسد قرار دیا ہے مگر پانی کو نہیں۔ اور وجہ یہی لکھی ہے کہ پہلی صورت میں اصلاح بدن ہوتی ہے، دوسری صورت میں نہیں۔^۱

حاصل یہ ہے کہ انجکشن کے ذریعہ چاہے خون پہنچایا جائے یا دوا، مفسدِ صوم نہ ہوگا چونکہ گلوکوز وغیرہ کی نوعیت بھی یہی ہوتی ہے کہ رگوں کے واسطے سے پہنچایا جاتا ہے، معدہ یا دماغ کے کسی منفذ کے ذریعہ نہیں پہنچایا جاتا اس لئے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ واللہ اعلم

اندرونِ جسم دوا کا استعمال

عورتوں کی شرمگاہ میں کسی بھی قسم کی دوا ڈالنا مفسدِ صوم ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”وفی الإقطار فی أقبال النساء یفسد بلا خلاف وهو الصحيح.“^۲

ترجمہ: ”عورت کی شرمگاہ میں کسی چیز کا قطرہ ٹپکانے سے بالاتفاق روزہ فاسد ہو جائے گا یہی صحیح رائے ہے۔“

یہاں تک کہ:

”ولو أدخل إصبعة فی إسته أو المرأة فی فرجها لا یفسدو هو المختار إلا إذا

كانت مبتلة بالماء أو الدهن فحينئذ یفسد لوصل الماء أو الدهن.“^۳

ترجمہ: ”اگر مرد اپنی سرین میں یا عورت اپنی شرمگاہ میں انگلی داخل کرے تو روزہ فاسد نہ ہوگا یہی

قول مختار ہے، سوائے اس کے کہ انگلی پانی یا تیل میں تر ہو ایسی صورت میں پانی یا تیل پہنچ جانے کی

وجہ سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔“

آنکھوں اور کانوں میں دوا ڈالنا

فقہاء نے لکھا ہے کہ آنکھوں میں چاہے سیال دوا ڈالی جائے یا جامد اور چاہے اس کا مزاحلق میں محسوس ہی کیوں نہ ہو روزہ اس کی وجہ سے نہیں ٹوٹے گا۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ اگر آنکھ میں دوا ٹپکائی جائے تو روزہ فاسد نہ ہوگا گو حلق میں اس کا مزاحسوس ہو۔..... اور خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے کہ سرمہ لگانا روزہ پر اثر انداز

نہیں ہوتا ہے چاہے اس کا مزا ہی کیوں نہ محسوس ہو۔^۱ فقہاء کی اس رائے کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ حدیث سے روزہ کی حالت میں سرمہ لگانے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔^۲ حنابلہ کے یہاں اس مسئلہ میں تفصیل ہے:

”فأما الكحل فما وجد طعمه في حلقه أو علم وصوله إليه فطره وإلا لم يفطره.“^۳

ترجمہ: کسی کو اپنے حلق میں سرمہ کا مزہ محسوس ہوا، یا حلق تک پہنچنے کا علم ہوا تو اس کا روزہ ٹوٹ گیا اور اگر ایسا احساس نہیں ہوا تو روزہ باقی ہے۔

اس کے برخلاف فقہاء کان میں ڈالنے والی دوا کو مفسدِ صوم قرار دیتے ہیں۔^۴ علامہ نووی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی رقم طراز ہیں:

”لو أقطر في أذنه ماء أودهنأ أو غيرهما فوصل إلى الدماغ فوجهان، أصحابهما يفطر.“^۵

ترجمہ: ”اگر کسی نے اپنے کان میں پانی یا تیل، یا ان دو کے علاوہ کوئی اور چیز ٹپکائی اور وہ دماغ تک پہنچ گئی تو اس میں دو قول ہیں۔ صحیح ترین قول روزہ ٹوٹنے کا ہے۔“

یہ تو فقہاء کی رائیں ہیں، لیکن دراصل اس مسئلہ کا تعلق طب اور میڈیکل سائنس سے ہے۔ مختلف ڈاکٹروں سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ کان اور دماغ یا معدہ کے درمیان کوئی منفذ نہیں ہے۔ بلکہ کان کے سرے پر ایک پردہ موجود ہے جو اس راستہ کو بند کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف آنکھ کا حلق کی طرف منفذ موجود ہے۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ کان میں جو دوائیں ڈالی جاتی ہیں آدمی اس کا مزہ محسوس نہیں کرتا اور آنکھ کی دواؤں کا مزہ فوراً حلق میں محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے آنکھ میں سیال دواؤں کا ڈالنا مفسدِ صوم ہونا چاہئے اور کان میں ڈالی جانے والی دواؤں کو بھی از راہ احتیاط ناقضِ صوم مان لیا جائے گا۔ واللہ اعلم

روزہ میں بواسیر کی خارجی دوا استعمال کی جائے

روزہ کی حالت میں اگر بواسیر کے مریض کو پائپ کے ذریعہ دوا اندر تک پہنچائی جائے تب تو اس کی وجہ سے روزہ ٹوٹ ہی جائے گا کہ قوی امکان دوا کے معدہ تک پہنچنے کا ہے، لیکن اگر صرف بواسیری مسوں یا اوپری سطح پر مرہم لگایا جائے تو اس کے بارے میں ڈاکٹروں سے دریافت کر لینا چاہئے کہ یہ دوا معدہ تک پہنچتی ہے یا

^۱ خلاصۃ الفتاویٰ: ۲۵۴/۱ ^۲ ترمذی: ۱۰۵/۳، باب ماجاء فی الکحل للصائم (ط: بیروت)

^۳ المغنی: ۱۶/۳ ^۴ ہدایہ: ۳۴۱، ۴۲/۱ (مع الفتح) ^۵ شرح مہذب: ۳۱۴/۵

نہیں۔ میرا خیال کہ معدہ میں چونکہ ایک حد تک جذب کرنے کی صلاحیت ہے، اور اسی لئے فقہاء نے روزہ کی حالت میں استنجاء کی ضرورت سے پانی استعمال کرتے ہوئے زیادہ کشائش کو پسند نہیں کیا ہے لہذا اس سے احتیاط واجتناب بہتر ہے، تاہم محض شک کی وجہ سے ظاہر ہے کہ روزہ ٹوٹ جانے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی یہ وضاحت قابل لحاظ ہے۔

”وأطلق الدواء فشمّل الرطب واليابس لأن العبرة للوصول لالكونه رطباً ويابساً وإنما شرطه القدوری لأن الرطب هو الذي يصل الى الجوف عادة حتى لو علم أن الرطب لم يصل لم يفسد، ولو علم أن اليابس وصل فسد صومه.“^۱

ترجمہ: ”مصنف نے مطلق دوا کہا ہے، اس میں تر اور خشک دونوں شامل ہیں، کیوں کہ پہنچنے کا اعتبار ہے نہ کہ خشک وتر ہونے کا۔ البتہ قدوری نے تر ہونے کی شرط لگائی ہے، اس لئے کہ تر دوا عام طور پر پیٹ میں پہنچ جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر تر دوا نہ پہنچنے کا علم ہو جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا اور اگر خشک دوا کے پہنچ جانے کا یقین ہو تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔“

معدہ میں نلکی ڈالی جائے

آج کل معدہ کے بعض امراض کی شناخت کے لئے معدہ تک منہ کے ذریعہ نلکی پہنچائی جاتی ہے جو بعض دفعہ گوشت کا ٹکڑا کتر کر اپنے ساتھ لاتی ہے اور اس پر تحقیق ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اس شخص کا روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اصل میں روزہ ٹوٹنے اور نہ ٹوٹنے کا مدار اس بات پر ہے کہ معدہ میں داخل ہونے والی چیز اندر ٹھہر گئی ہے یا واپس آگئی ہے؟ اگر ٹھہر گئی ہے تو روزہ ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں۔ علامہ ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”ولو شد الطعام بخيط وأرسله في حلقه وطرف الخيط في يده لا يفسد الصوم.“^۲

ترجمہ: ”اگر کھانا دھاگہ سے باندھے اور اس کو اپنے حلق میں چھوڑ دے، دھاگہ کا ایک کنارہ خود اس کے ہاتھ میں ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔“

علامہ کاسانی، رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اس سلسلہ میں ایک اصولی بات فرمائی ہے:

”وهذا يدل على أن استقرار الداخل في الجوف شرط لفساد الصوم.“^۱
 تَرْجَمًا: ”یہ اس بات کی دلیل ہے کہ داخل ہونے والی چیز کا معدہ میں ٹھہرنا روزہ فاسد ہونے کے لئے شرط ہے۔“

ناک میں دوا ڈالنا

ناک میں دوا ڈالی جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اس لئے کہ ناک کی طرف سے حلق میں منفذ یعنی راستہ موجود ہے، قاضی خاں میں ہے:

”وكذا السعوط والوجور والقطور في الأذن، أما الحقنة والوجور فلانه وصل الى الجوف مافيه صلاح البدن وفي القطور والسعوط لأنه وصل الى الرأس مافيه صلاح البدن.“^۲

تَرْجَمًا: ”اسی طرح دوا کا ناک میں چڑھانا، منہ میں اور کان میں ٹپکانا روزہ کے لئے مفسد ہے۔ جہاں تک حقنہ (ہر دوا جو مریض کے مقعد سے پیٹ صاف کرنے کے لئے چڑھائی جائے) اور منہ میں ٹپکائی جانے والی دوا کی بات ہے، تو چونکہ اس طرح پیٹ میں ایسی چیز پہنچتی ہے جس میں بدن کی صلاح ہے۔ اور ناک میں چڑھانے اور اسی طرح کان میں ڈالی جانے والی دوا کی بات ہے تو اس لئے کہ سر تک ایسی چیز پہنچتی ہے جس میں بدن کی صلاح ہے۔“

روزہ کی حالت میں بھپاڑہ لینا

بعض یونانی اور آریو ویدک دواؤں میں استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو جوش دیئے ہوئے پانی میں ڈال کر اس کا بھاپ لیا جاتا ہے، جس کا اثر بلاتا خیر حلق بلکہ سینہ تک پہنچتا ہے، اس کو بھپاڑہ لینا کہتے ہیں۔ اس طرح بھپاڑہ لینے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص قصداً حلق میں دھواں داخل کرے تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہی حکم بھپاڑہ کا بھی ہوگا۔ علامہ شرنبلالی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”من أدخل بصنعه دخاناً حلقه بأى صورة كان الإدخال فسد صومه سواء كان دخان عنبر أو عود أو غيرهما.“^۳

^۱ ۲ خانہ علی الہندیہ: ۲۱۰/۱

^۲ بدائع الصنائع: ۹۳/۲

^۳ مراقی الفلاح علی طحطاوی: ۳۶۱ نیز دیکھئے درالمختار علی هامش الرد: ۳۹۵/۲

روزہ کی حالت میں آکسیجن لینے کا حکم

دمہ کے سخت مریض کو دورہ پڑنے کے وقت آکسیجن پہنچائی جاتی ہے۔ روزہ کی حالت میں اس طرح آکسیجن لینے کا کیا حکم ہوگا؟..... یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ فقہی جزئیات کو سامنے رکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ آکسیجن کے ساتھ کوئی دوا نہ ہو تو روزہ فاسد نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ یہ سانس لینا ہے اور سانس کے ذریعہ ہوا لینا نہ مفسد صوم ہے اور نہ اس پر اکل و شرب کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ دوا کے اجزاء بھی ہوں تو پھر روزہ ٹوٹ جائے گا۔

ٹوتھ پاؤڈر اور پیسٹ کے احکام

روزہ کی حالت میں فقہاء احناف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے مسواک کی اجازت دی ہے۔ چاہے وہ خشک لکڑی کی ہو یا سرسبز ہو، جس میں ایک گونہ ذائقہ موجود ہوتا ہے۔ البتہ امام ابو یوسف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے پانی سے بھگو کر مسواک کرنے کو مکروہ کہا ہے:

”لا بأس بالسواك الرطب واليابس بالغداة والعشي عندنا وقال أبو يوسف يكره المبلول بالماء.“^۱

ترجمہ: ”خشک و تر مسواک صبح و شام کرنے میں ہمارے یہاں کوئی مضائقہ نہیں امام ابو یوسف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے ہے کہ پانی سے تر مسواک مکروہ ہے۔“

اور یہ کہ:

”وأما الرطب الأخضر فلا بأس به عند الكل.“^۲

ترجمہ: ”اور رہی سرسبز مرطوب مسواک تو اس میں سبھوں کے نزدیک مضائقہ نہیں۔“

مگر مسواک کی تری یا اس کی لکڑی کا کوئی حصہ حلق سے نیچے چلا گیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔

”لو استاك بسواك رطب فالتعق من رطوبته او خشبه المنشعب شيء وابتلعه أفطر بلا خلاف“^۳

ترجمہ: ”اگر مرطوب مسواک کرے اور اس کی تری یا اس کی ٹوٹی ہوئی لکڑی میں سے کچھ چپک کر رہ جائے، اور اس کو نگل جائے تو بالاتفاق روزہ ٹوٹ جائے گا۔“

لیکن ٹوتھ پاؤڈر اور پیسٹ کا حال اس سے مختلف ہے۔ اس لئے کہ اس میں ذائقہ بہت محسوس ہوتا ہے اور

^۱ شرح مہذب: ۳۱۸/۵

^۲ فتاویٰ عالمگیری: ۱۹۹/۱

^۳ خلاصۃ الفتاویٰ: ۲۶۶/۱

مسواک کا نہ اس پر اطلاق ہوتا ہے اور نہ مسواک کی سنت ادا کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ اس لئے کسی ضرورت شدیدہ کے بغیر روزہ میں اس کا استعمال کراہت سے خالی نہ ہوگا۔ ہاں عذر کی بناء پر کیا جاسکتا ہے جیسا کہ فقہاء کی اس عام عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

”وکرہ ذوق شیء ومضغہ بلا عذر۔“^۱

ترجمہ: ”کسی چیز کا چکھنا اور چبانا بلا عذر مکروہ ہے۔“

یہی حکم تمباکو کے اس سفوف کا بھی ہوگا جو منجن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور جس کو گل کہتے ہیں۔

روزہ میں پان تمباکو وغیرہ کا استعمال

فقہاء نے عام طور پر چبانے کو روزہ کے لئے مفسد نہیں مانا ہے، کھانے کی وجہ سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے لیکن بعض چیزیں اس طرح استعمال کی جاتی ہیں کہ اس کو نگلا نہیں جاتا، صرف چبا کر حلق سے اوپر ہی استعمال کی جاتی ہیں جیسے پان اور کھینی۔ ان چیزوں کے استعمال سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا، ایک تو اس لئے کہ شریعت نے ”اکل“ کا کوئی قطعی معنی متعین نہیں کیا ہے اور جن الفاظ کے مفہوم کی شارع کی طرف سے تحدید و تعین نہ ہوئی ہو ان کا معنی و مصداق عرف سے متعین ہوتا ہے، پس عرف میں جن چیزوں کے چبانے کو کھانا کہا جاتا ہے، سو ان چیزوں کا چبا لینا ہی کھالینے کے حکم میں ہے، اس لئے پان، تمباکو، کھینی کی وجہ سے روزہ ٹوٹ جائے گا کہ عرف میں پان، کھینی ”چبانا“ نہیں کہتے ہیں پان، کھینی کھانا کہتے ہیں۔

دوسرے پان اور تمباکو کے استعمال میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس کے اجزاء لعاب دہن کے ساتھ حلق تک پہنچ جائیں اور شریعت میں جہاں کسی بات کا قوی امکان پایا جاتا ہو اور عملاً اس بات کی تحقیق دشوار ہو کہ وہ بات واقع بھی ہوئی ہے یا نہیں؟ وہاں امکان کو ”واقع“ ہونے کا درجہ دیا جاتا ہے، نیند کو اسی لئے ناقض وضو مانا گیا ہے کہ اس میں خروج ریح کا قوی امکان ہے اور یقینی طور پر اس کی تحقیق دشوار ہے، پھر چونکہ پان اور تمباکو کے خوگر لوگوں کو پان میں لذت ملتی ہے اور وہ تلذذ نفس ہی کے لئے اس کا استعمال کرتے ہیں، لہذا اس کے استعمال پر کفارہ بھی واجب ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

علامہ طحاوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”وعلى هذا الورق الحبشى والحشيشة والقطاط اذا اكله فعلى القول الثانى لا

تجب الكفارة لانه لانفع فيه للبدن وربما يضره وينقص عقله وعلى القول

الاول تجب لان الطبع يميل اليه وتنقضي به شهوة البطن انتهي، قلت وعلى هذا البدعة التي ظهرت الان وهو الدخان اذا شربه في لزوم الكفارة. ۱۷
 ترجمہ: ”اسی اسل پر بعض پتوں (حبشی پتہ، حبشیش اور قطاط) کے کھانے کا حکم ہے کہ دوسرے قول کے مطابق ان کے کھانے کی وجہ سے کفارہ واجب نہیں ہوگا، کیونکہ اس میں جسم انسانی کی کوئی منفعت نہیں ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات ان سے نقصان پہنچتا ہے اور عقل متاثر ہوتی ہے، اور پہلے قول کے مطابق کفارہ واجب ہوگا کیوں کہ طبیعت اس طرف مائل ہوتی ہے اور اس سے پیٹ کی خواہش پوری ہوتی ہے، میں کہتا ہوں کہ یہی حکم کفارہ واجب ہونے میں اس بدعت کا ہے جو سگریٹ اور بیڑی کی صورت میں شروع ہوئی ہے۔“

موذی امراض کی وجہ سے افطار

بیماریوں کی وجہ سے روزہ توڑنے کی اجازت کب ہے؟ اس سلسلہ میں یہ باتیں پیش نظر رکھی جائیں:
 مریض کو جب (روزہ کے باعث) ہلاکت یا کسی عضو کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو بالاتفاق روزہ توڑ دیا جائے، یہی حکم اس وقت بھی ہے جب بیماری بڑھ جانے یا طول پکڑ لینے کا اندیشہ ہو اور روزہ افطار کرنے کی صورت میں بعد میں اس کو قضاء کرنی ہوگی۔ یہ اندیشہ خود مریض کے اندازہ پر مبنی ہوگا بشرطیکہ یہ اندازہ کسی مسلم طبیب کے مشورہ، تجربات یا علامات پر اس طرح مبنی ہو کہ مریض کو ان باتوں کا غالب گمان ہو جائے، محض وہم نہ ہو، صحت مند آدمی کو بھی اگر بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہے تو اس کو بھی افطار کی اجازت ہے۔
 ان اصولوں کی روشنی میں جو مہلک امراض ہوں ان کی وجہ سے روزہ توڑنے کی اجازت ہے۔ محض وہم، تھکن اور کمزوری کے ڈر سے نہیں..... اور اس کی تعیین ماہر طبیب کی رائے سے کی جائے گی، افسوس کہ بد قسمتی سے ماہ مبارک کے آتے ہی کچھ لوگ مصنوعی بیماریوں کی ایک ڈھال لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ خدا ان کی تمام چالوں سے آگاہ ہے۔ واللہ علیم بذات الصدور۔

تراویح پر اجرت

ہمارے زمانے میں ایک عام رواج سا ہو گیا ہے کہ حفاظ صاحبان اپنے قرآن کی قیمت لگاتے پھرتے ہیں۔ باضابطہ ایک رقم طے کرتے ہیں جو ان کو بطور اجرت، نذرانہ کے نام سے ختم تراویح پر دی جائے۔ بسا اوقات اس کے لئے طویل اسفار کرتے ہیں اور اپنے وطن، شہر، قریہ پر ایسی جگہوں کو ترجیح دیتے ہیں جہاں زیادہ

پیسہ ملے۔ یہ انتہائی نامناسب طرز عمل ہے۔

احادیث میں قرآن کو ذریعہ کسب بنانے کی سخت مذمت آئی ہے، اسی لئے فقہاء احناف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کا مسلک ہے کہ کسی بھی کارِ اطاعت پر اجرت وصول نہیں کی جاسکتی، یہ نہ صرف یہ کہ حکم شریعت کا تقاضا ہے بلکہ عقل و قیاس کے بھی مطابق ہے، کوئی شخص جو اطاعت و فرمانبرداری کا کوئی کام انجام دیتا ہے خود اپنے لئے عند اللہ اس کا اجر محفوظ کر لیتا ہے۔ پھر اب دوسروں سے اس کی قیمت وصول کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

لیکن دینی اور شرعی مصلحت کے پیش نظر بعد کے فقہاء نے بعض چیزوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا جن میں دینی تعلیم، امامت، اذان وغیرہ ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر علماء کسبِ معاش کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کر لیں تو ظاہر ہے، ان کے لئے ان کاموں کی انجام دہی ممکن نہ رہ سکے گی۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دینی تعلیم ضائع ہو جائے گی۔ اہل علم امام اور مؤذن دستیاب نہیں ہو سکیں گے۔ ان شرعی مصلحتوں کے پیش نظر ضرورت اس کی اجازت دی گئی۔

مگر جہاں ایسی کوئی ناگزیر شرعی ضرورت نہ ہو، وہاں اجرت لینا درست نہ ہوگا۔ اس کی نظیر ایصالِ ثواب ہے کہ اس پر اجرت لینے کو فقہاء نے نادرست قرار دیا ہے کیونکہ یہ کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے..... شامی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے علامہ عینی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی عبارت اس مسئلہ میں ان الفاظ میں نقل کی ہے:

”الحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء بالأجرة لا يجوز لأن فيه الأمر بالقراءة وإعطاء الثواب للأمر والقراءة لأجل المال فاذا لم يكن للقراري ثواب لعدم النية الصحيحة، فأين يصل الثواب إلى المستاجر ولولا الأجرة ما قرء أحد في هذا الزمان بل جعلوا القرآن العظيم مكسبا ووسيلة إلى جمع الدنيا. إنا لله وإنا إليه راجعون.“^۱

ترجمہ: ”حاصل یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں جو رواج ہو گیا ہے کہ قرآن کے اجزاء کی اجرت لے کر تلاوت کی جاتی ہے، جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں قرأت قرآن کرنے اور اس کا ثواب حکم دینے والے کو پہنچانا مقصود ہے۔ اور تلاوت یہاں محض مال کے لئے ہے تو جب پڑھنے والے ہی کو نیت صحیح نہ ہونے کی وجہ سے اجر نہ ہوگا تو ثواب اجرت ادا کرنے والے کو کیوں کر پہنچے گا؟ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اجرت نہ ملے تو اس زمانے میں کوئی کسی کے لئے تلاوت نہ کرے۔ دراصل ان لوگوں نے قرآن کو ذریعہ معاش اور دنیا کمانے کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ

راجعون۔“

تراویح میں ختم قرآن شرعی ضرورت نہیں ہے۔ یہ محض ایک سنت ہے۔ تراویح کی ادائیگی کے لئے یہی کافی ہے کہ ”الم ترکیف“ تا سورہ ”ناس“ پڑھ کر نماز کی تکمیل کرے۔ اگر لوگوں میں تعب و تھکن اور قرآن کی طرف سے بے توجہی ہو تو فقہاء نے اسی کو بہتر قرار دیا ہے کہ تھوڑا ہی تھوڑا قرآن پڑھا جائے، تکمیل نہ کی جائے، اس لئے کہ قرآن کی تکمیل سے زیادہ اہمیت جماعت کی تکثیر کو حاصل ہے:

”الافضل فی زماننا قدر مالا یثقل علیہم۔“^۱

اب ظاہر ہے کہ ایک ایسی بات کے لئے قرآن فروشی کی کیوں اجازت دی جاسکتی ہے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اس کے لئے اس حیلہ کو درست قرار دیا ہے کہ ان حافظ صاحب کو ایک دو وقت کے لئے امام متعین کر دیا جائے اور اسی امامت کی اجرت کے بطور جو کچھ دینا ہو دیا جائے۔ لیکن مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اس قسم کے حیلہ کو بھی نادرست اور ناکافی قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

”دیانات میں جو کہ معاملہ مابین العبد و بین اللہ ہے حیل مفید جواز واقعی کو نہیں ہوتے، لہذا یہ ناجائز ہوگا۔“^۲

مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۱۲۷۵ھ-۱۳۳۷ھ) مفتی دارالعلوم دیوبند کا بھی یہی رجحان ہے۔

راقم الحروف کی رائے بھی یہی ہے، یہ بات شریعت کی روح سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک سنت کے لئے جس کا ترک کر دینا بھی فقہاء کی تصریحات کے مطابق حالات کے اعتبار سے قبیح نہیں، ایک مکروہ کا مرتکب ہو جائے اور اس کے لئے حیلہ کی راہ دریافت کی جائے۔ وباللہ التوفیق۔

تراویح میں قرآن کی مقدار اور شبینہ

اسلام کا ایک خاص مزاج یہ ہے کہ وہ ہر کام میں یہاں تک کہ خیر و بھلائی کے کاموں میں بھی اعتدال و توازن اور میانہ روی کو پسند کرتا ہے۔ اسی لئے رمضان المبارک کے علاوہ کسی اور ماہ میں مسلسل روزے رکھنے سے منع کیا گیا۔ کل مال صدقہ کر دینے کو کہ اس کی اولاد بالکل محروم ہو جائے، حضور ﷺ نے سخت ناپسند فرمایا۔ عبادات میں ایسی میانہ روی کا حکم دیا گیا کہ دوسرے اہل حق اپنے حق سے محروم نہ ہو جائیں۔ امام کو حکم دیا گیا کہ مستحبات کی رعایت کے بعد اتنی طویل نماز نہ پڑھائے کہ عام لوگوں کے لئے مشکلات اور دشواریوں کا سامنا

۱۔ دیاچہ فتاویٰ رحیمیہ: ۵/۲

۲۔ شامی: ۳۳۹/۱

۳۔ فتاویٰ دارالعلوم جدید: ۲۷۳/۲

۴۔ امداد الفتاویٰ جدید: ۶۸۷/۱

ہو جائے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طویل نماز پر سخت اور شدید تنبیہ فرمائی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نماز باجماعت میں ہم نے حضور ﷺ سے زیادہ ہلکی اور خفیف نماز پڑھاتے ہوئے کسی کو نہ دیکھا کہ ایک دفعہ تو حالت سفر میں فجر کی نماز میں آپ نے صرف معوذتین پڑھی حالانکہ حضور ﷺ ہی جب تنہا نماز پڑھتے تو اتنی طویل کہ پائے مبارک پر ورم آ جاتا۔ فقہاء نے اسی اعتدال کا لحاظ نماز تراویح میں بھی رکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے چونکہ پورے رمضان المبارک جماعت کے ساتھ اس اندیشہ سے تراویح ادا نہ فرمائی کہ کہیں یہ فرض کر دی جائے اور امت کے لئے دشواری کا باعث بن جائے۔ اسی لئے حدیث میں یہ تصریح نہیں ملتی کہ تراویح میں آپ ﷺ کا کس قدر قرآن پورے ماہ میں پڑھنے کا معمول تھا؟

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں بھی تراویح کی جماعت کا سلسلہ نہیں رہا۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس وقت صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا کیا معمول رہا ہوگا؟ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منشاء نبوت کو سمجھتے ہوئے تراویح کی جماعت کی بنیاد رکھی۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس سلسلہ میں کیا معمول تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابو عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ آپ نے رمضان المبارک میں قاریوں کو بلایا جو بہت تیز پڑھتے تھے ان کو تیس آیات۔ جن کی روانی اوسط درجہ تھی ان کو پچیس اور جو سست رفتار تھے ان کو تیس آیات (ہر رکعت میں) پڑھنے کا حکم فرمایا۔ حضرت سیدہ عائشہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے شاگرد اور مشہور تابعی مسروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معمول ایک رکعت میں ”الحمد لله فاطر السموت“ اور اس جیسی سورتیں پڑھنے کا تھا بشرطیکہ کسی کے لئے بھی بارِ خاطر نہ ہو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنے زمانے میں قاریوں کو حکم دے دیا کہ وہ تراویح کی ہر رکعت میں دس آیات پڑھیں۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ جو شخص تراویح کی امامت کرے اسے سہولت اور آسانی کی راہ اختیار کرنی چاہئے جو آہستہ پڑھتا ہو وہ پورے مہینے میں ایک ختم کرے، جس کی رفتار درمیانی ہو وہ ڈیڑھ ختم کرے اور جو تیز رفتار پڑھتا ہو وہ دو مرتبہ۔^۱

”الفقه علی المذاہب الاربعہ“ ائمہ اربعہ کے فقہی مذاہب پر ایک مستند اور محتاط کتاب ہے اور اس میں ہر مسلک کی اس رائے کو نقل کرنے کا ہتمام کیا گیا ہے جو زیادہ صحیح ہو اور جس پر فتویٰ ہو۔ اس کتاب کے مصنف شیخ عبدالرحمن الجزیری رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قرآن مجید کی، تراویح میں اس طرح تکمیل کہ رمضان المبارک کی آخری شب میں قرآن ختم ہو مسنون

ہے۔ ہاں اگر مقتدی کے لئے یہ مشقت کا باعث بن جائے تو ان کے حالات کی رعایت کی جائے گی اور اس کا خیال رکھا جائے گا کہ بہت زیادہ عجلت نہ ہو جائے..... یہ رائے امام ابو حنیفہ، امام شافعی، اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ ختم قرآن مسنون نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کے پورے ماہ میں ایک ہی ختم ہونا چاہئے۔ مشہور حنفی فقیہ شیخ طاہر بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے تھوڑی وسعت دی ہے۔ وہ تراویح میں قرأت قرآن کے ضروری اور مستحب درجات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بعض حضرات نے کہا کہ ”نماز تراویح میں نماز مغرب کی مقدار قرآن پڑھے“..... خلف بن ایوب رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے ایک دفعہ دس آیات اور دوسری بار پانچ آیات پڑھنے کو کہا۔ صدر شہید رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تراویح میں ایک ختم مسنون ہے اور دو ختم افضل ہے۔ ہر رکعت میں دس آیات پڑھنی چاہئیں تاکہ ستائیسویں شب میں قرآن مجید ختم ہو۔
یہاں تو دو ختم قرآن کا ذکر ہے، فتاویٰ عالمگیری میں تین تک اجازت دی گئی ہے۔ ذیل میں عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

تراویح میں ایک ختم قرآن سنت ہے اور یہ ایک ختم، قوم کی سستی کے باعث ترک نہیں کیا جائے گا۔ دو ختم میں فضیلت ہے اور تین ختم افضل ہے..... امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ وہ ہر رکعت میں دس آیتیں اور اس کے برابر پڑھا کرتے تھے اور یہی صحیح رائے ہے۔ نیز قرأت اور ارکان نماز کی ادائیگی میں عجلت مکروہ ہے۔ اور ترتیل کے ساتھ پڑھنا بہتر ہے..... اور ہمارے زمانے میں بہتر یہ ہے کہ اتنا قرآن پڑھے کہ لوگ اپنی سستی کی وجہ سے جماعت سے بھاگنے نہ لگیں۔ اس لئے کہ جماعت کی کثرت لمبی قرأت سے بڑھ کر ہے۔

ان تمام اقوال و آراء کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ تراویح کے لئے کم از کم مغرب کے برابر تلاوت کافی ہے۔ ایک ختم مسنون ہے۔ اس پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا اپنا عمل بھی تھا۔ اگر اندیشہ ہو کہ نمازیوں کے لئے ایک ختم بھی بار ہوگا تو بعد کے فقہاء کے فتویٰ کے مطابق ایک ختم کرنے کی بھی ضرورت نہیں، بلکہ جس قدر لوگ گوارا کریں اتنا ہی پڑھا جائے۔

ایک ختم کے بعد دوسرا اور تیسرا ختم مستحب ہے۔ بشرطیکہ پوری توجہ اور بشارت کے ساتھ لوگ پڑھ سکیں۔

دس دنوں سے کم میں قرآن ختم کرنے کا سلف صالحین کے یہاں نہ معمول تھا اور نہ فقہاء نے کہیں اس کو ذکر کیا ہے۔ چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

رمضان شریف میں قرآن مجید کا ایک مرتبہ ترتیب وار تراویح میں پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔ اگر کسی عذر سے اس کا اندیشہ ہو کہ مقتدی تحمل نہ کر سکیں گے تو پھر الم تر کیف سے اخیر تک دس سورتیں پڑھ دی جائیں دس رکعتیں پوری ہونے پر ان ہی کو دوبارہ پڑھے۔^۱

یہ تو ظاہر ہے کہ جن سلف صالحین اور فقہاء کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ دین کے منشاء اور روح کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے اور ان کے متبعین و اصحاب ہمارے دور کے عوام سے نسبتاً زیادہ بہتر تھے، اس کے باوجود ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا اور ہمارے زمانہ کا حال تو اس سے بہت برا ہے۔ مگر چار چار، پانچ پانچ ختم اور ہر مسجد میں تین تین ختم کا ایک رواج سا ہوتا جا رہا ہے۔

اس سے کئی مضرتیں اور نقصانات ہیں..... سب سے بڑا نقصان تو یہ ہے کہ ایک ختم کے بعد بہت سے لوگ تراویح کی نماز ہی نہیں پڑھتے، حالانکہ وہ پورے ماہ مسنون ہے اور بالخصوص اہل تجارت اور کاروباریوں کے یہاں تو یہ عام بات ہو گئی ہے کہ ایک ختم ایک ہفتہ میں کر لیا اور اس کے بعد تراویح ہی چھوڑ دی۔

دوسرے اس سے قرآن کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ بوڑھوں، کمزوروں اور معذوروں میں سے بہت سے لوگ جماعت میں شریک ہوتے ہیں، وہ مجبوراً شریک رہتے ہیں، حالانکہ تھکن اور تعب و کمزوری کی وجہ سے قرآن مجید سننے سے غافل اور بے توجہ ہو جاتے ہیں چند ہی لوگ ہوتے ہیں جو اس قدر قرآن بشاشت اور توجہ سے سنتے ہوں۔

تیسرے اس سے تلاوت میں ترتیل، الفاظ کی صحیح ادائیگی کی رعایت نہیں ہوتی اور یہ بھی مکروہ ہے..... حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، ترتیل کے ساتھ کم پڑھنا، ترتیل کے بغیر زیادہ اور تیز پڑھنے سے بہتر ہے۔^۲

یہ تو ترتیل کی بات ہے۔ راقم الحروف کا تجربہ ہے کہ اس قسم کے زیادہ پڑھنے والے حفاظ اکثر اس طرح پڑھتے ہیں کہ قرآن مجید کے الفاظ بھی سمجھ میں نہیں آتے۔

چوتھے آج کل یہ ایک طرح کا مظاہرہ ہو گیا ہے کہ ہر حافظ اپنی تیز رفتاری اور حفظ کا مظاہرہ کرتا ہے اور اسے اپنے لئے فخر و مباہات کا ذریعہ بنا لیتا ہے اور ظاہر ہے اس کی کراہت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

^۱ امداد الفتاوی: ۴۸۴/۱ ترتیب جدید

^۲ مسلم عن عبداللہ بن عمرو بن العاص: ۷۵۵/۲ باب فی کم یقرء القرآن

۳۱ واں روزہ

مختلف ممالک کے درمیان اوقات اور مطلع کے فرق کی وجہ سے بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے ملک سے رمضان کے تیس روزے پورے کر کے آتا ہے اور جہاں وہ آتا ہے وہاں رمضان کا ایک دن باقی رہ جاتا ہے، ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ ایک روزہ اسے احترام رمضان کے بطور رکھنا چاہئے، رمضان کا کوئی روزہ اس کے ذمہ نہیں ہے۔ کیوں کہ صریح حدیث کے بموجب رمضان کے زیادہ سے زیادہ تیس ایام ہی ہو سکتے ہیں، البتہ اگر یہ روزہ نہ رکھا جائے تو احترام رمضان کے منافی عمل ہونے کی وجہ سے گنہگار تو ہوگا مگر قضا یا کفارہ واجب نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

زکوٰۃ

سونے چاندی کا نصاب

سونے اور چاندی کے سلسلہ میں ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو نصاب متعین فرمایا ہے وہ قدیم عربی اوزان کے لحاظ سے ہے۔ چنانچہ دوسو درہم چاندی اور بیس مثقال سونے کو وہ کم سے کم مقدار قرار دیا گیا ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اب خود عرب میں بھی سونے چاندی کے سکے باقی نہ رہے چہ جائیکہ ہندوستان۔ اس لئے ضرورت پڑی کہ ہندوستانی پیمانے کے لحاظ سے اس کی مقدار متعین کی جائے۔ علماء کی تحقیق اس سلسلہ میں مختلف ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی ایک مستقل کتاب اوزان شرعیہ ہی کے موضوع پر ہے۔ ان کی تحقیق ہے کہ چاندی کا نصاب ہندوستانی اوزان کے حساب سے چھتیس تولہ ساڑھے پانچ ماشہ اور سونے کا پانچ تولہ اڑھائی ماشہ ہے۔ مولانا عبدالصمد رحمانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اپنی فاضلانہ تصنیف ”کتاب العشر والزکوٰۃ“ میں اور مولانا عبدالشکور فاروقی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ”علم فقہ“ میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ بعض دوسرے علماء نے اس سے اتفاق کیا ہے اور سابق ریاست حیدرآباد میں بھی اسی پر عمل تھا۔

دوسری طرف مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے ہے کہ چاندی کا نصاب باون تولہ چھ ماشہ ہے اور سونے کا سات تولہ چھ ماشہ، مولانا مفتی محمد شفیع رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی

صاحب نے کافی تحقیق و جستجو، تجربہ اور فقہی ذخائر سے استفادہ کے بعد اسی رائے کو حق بجانب قرار دیا ہے اور اس موضوع پر ایک بڑا گراں قدر رسالہ بھی تصنیف فرمایا ہے۔

ان دونوں میں پہلی رائے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے اور اس میں فقراء اور محتاجوں کی زیادہ رعایت بھی ہے اور دوسری میں امت کے لئے زیادہ سہولت ہے اور ہمارے زمانے میں زیادہ تر لوگوں کا اسی طرف رجحان بھی ہے۔ اس لئے فتویٰ تو اسی پر ہونا چاہئے کہ ۵۲ تولہ ۶ ماشہ اور ۷ تولہ ۶ ماشہ نصاب ہو۔ البتہ احتیاط کا تقاضہ اور تقویٰ یہ ہے کہ ۳۶ تولہ ساڑھے ۵ ماشہ اور ۵ تولہ ڈھائی ماشہ ہی پر زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔

موجودہ اوزان کے لحاظ سے ایک تولہ ۶۶۴/۱۱ کے برابر ہے اس طرح ۵۲-۲/۱ تولہ کا وزن ۶۱۲ گرام اور ۳۶۰ ملی گرام کے مساوی ہے۔ آج کل ۱۲ ماشہ (برابر ۶۶۴/۱۱ گرام) کی بجائے ۱۰ گرام کا تولہ مروج ہے اس لئے اس اصطلاح کے اعتبار سے ۶۱ تولہ ۲ گرام ۳۶۰ ملی گرام چاندی زکوٰۃ کا نصاب ہوگی۔ اسی طرح سونے کا نصاب اس حساب سے ۸۷۷ گرام ہوتا ہے جو ۱۰ گرام کے تولہ کے لحاظ سے ۸ تولہ ۷ گرام اور ۴۸۰ ملی گرام ہوا۔

گوٹے لچکے کی زکوٰۃ

کپڑوں میں بعض اوقات سونے چاندی وغیرہ کے تار لگے رہتے ہیں پہلے زمانے میں اس کا رواج اور استعمال کچھ زیادہ ہی تھا۔ سوال یہ ہے کہ ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ جو حکم اس کا ہوگا وہی گھڑی میں لگے ہوئے سونے چاندی کی زنجیر یا کسی بھی جزو کا ہوگا۔

جہاں تک سونے یا چاندی کے چڑھائے ہوئے ایسے پانی کی بات ہے جو الگ نہیں کیا جاسکتا تو اس پر بہر حال زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ وہ تو محض ایک رنگ (COLOUR) ہے، سونا اور چاندی ہے ہی نہیں۔ رہ گئے سونے اور چاندی کے وہ اجزاء جو باقی رہتے ہوئے، کسی چیز کے ساتھ لگائے جاتے ہیں ان کو الگ کرنا بھی بہ آسانی ممکن نہیں ہوتا تو احناف کے اصول اور فقہی جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سونے اور چاندی پر مطلقاً زکوٰۃ واجب قرار دیتے ہیں، چاہے اس کو خواتین آرائش ہی کے لئے کیوں نہ استعمال کریں۔ چنانچہ علامہ مسعود کا سانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (م ۵۸۷ھ) فرماتے ہیں:

”لا يعتبر في هذا النصاب صفة زائدة على كونه فضة فتجب الزكاة فيها سواء

كانت دراهم مضروبة أو نقرة أو تبر الوحليا مصنوعا أو حلية سيف أو منطقة أو

لجام أو سرج أو الكواكب في المصاحف والأواني وغيرها إذا كانت تخلص

عند الإذابة إذا بلغت مائة درهم وسواء كان يمسكها للتجارة أو للنفقة أو

للتجمل أولم ينوشينا۔^{۱۷}

ترجمہ: ”اس نصاب میں چاندی سونے کے علاوہ مزید کسی اور صفت کا اعتبار نہیں لہذا اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، چاہے ڈھلے ہوئے درہموں کے سکے ہوں یا اس کے ڈلے اور ٹکڑے ہوں یا خام صورت میں ہوں یا اس کے بنے ہوئے زیور ہوں یا تلوار، کمر بند، لگام یا زین میں ازراہ زینت لگے ہوئے ہوں یا قرآن اور برتن وغیرہ میں اس کے بنے ہوئے ایسے ستارے ہوں جن کو پگھلانے کے بعد الگ کیا جاسکتا ہو۔ بشرطیکہ وہ دوسو درہم کی مقدار کو پہنچ جائیں عام ازیں کہ اسے تجارت کے لئے رکھا ہو یا خرچ کے لئے یا زینت مقصود ہو یا کچھ بھی نیت نہ ہو۔“

اس اصول اور علامہ کا سانی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ احناف کے یہاں کپڑوں میں لگے ہوئے سونے چاندی کے اجزاء پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر نصاب صرف اسی سونے چاندی سے پورا ہو جائے تب تو یہی کافی ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں سونے اور چاندی کی جو مقدار موجود ہے اسی میں اس کو بھی ضم کر دیا جائے گا۔ اکثر علماء کی یہی رائے ہے، مولانا تھانوی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔^{۱۸} لیکن مولانا عبدالحی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی لکھنوی کی رائے اس سے مختلف ہے۔ وہ اس سوال کے جواب میں کہ کیا مستورات کے کپڑوں میں لگے ہوئے گوٹے ٹپے وغیرہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ لکھتے ہیں:

”این اشیاء از قبیل عروض اندودر عروض مادم کہ نیت تجارت نباشد زکوٰۃ نیست کذا فی البحر الرائق۔“^{۱۹}

ترجمہ: ”یہ چیزیں سامان کے درجے میں ہیں اور سامان میں جب تک تجارت کی نیت نہ ہو زکوٰۃ نہیں ہے۔“ (البحر الرائق میں ایسا ہی لکھا ہے۔)

علامہ لکھنوی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے پیش نظر غالباً یہ ہے کہ کپڑے میں لگے ہوئے گوٹے وغیرہ کی حیثیت مستقل نہیں ہوتی، بلکہ تابع کی ہوتی ہے اور جو چیز تابع ہو اور ضمنی حیثیت کی حامل ہو، قاعدہ ہے کہ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔ اس عبد عاجز کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ فقہاء احناف کے یہاں ”تابع“ کا اعتبار نہ کرنے میں اس قدر توسع ہے کہ حرمت وحلت کے مسائل میں بھی اس کو برتا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر مدت رضاعت کے دوران بچے کو غذا میں کسی عورت کا دودھ ملا کر دیا جائے تو احناف کے یہاں حرمت ثابت نہ ہوگی، چاہے وہ دودھ اس قدر بھی کیوں نہ ہو کہ لقمہ سے دودھ کے قطرات ٹپکتے رہتے

^{۱۷} امداد الفتاویٰ: ۱۱/۲، ص ۲۱، ۲۰

^{۱۸} بدائع الصنائع: ۱۶/۱

^{۱۹} مجموعة الفتاویٰ علی هامش خلاصة الفتاویٰ، کتاب الزکوٰۃ، ”زکوٰۃ در لباس زنان“

تاہم احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی بھی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کرایہ کے سامان اور مکان میں زکوٰۃ

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اسلام کا معاشی نظام نہایت معتدل، متوازن اور منصفانہ ہے۔ اس لئے شریعت نے ہر قسم کے اور تھوڑے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں کی ہے۔ مال کی چند قسموں اور اس میں بھی ایک خاص مقدار پر زکوٰۃ واجب قرار دی گئی ہے۔ وہ مال کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں حافظ ابن رشد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (۵۲۰-۵۹۵) لکھتے ہیں:

- | | | |
|-----------------|----------------|---------|
| معدنی اشیاء میں | ① سونا | ② چاندی |
| جانوروں میں | ① اونٹ | ② گائے |
| غلوں میں | ① گیہوں اور جو | ③ بکری |
| پھلوں میں | ① کھجور | ② کشمش |

امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے مسلک کے مطابق اس میں اس قدر اضافہ کیا جائے کہ ہمارے یہاں زمین سے پیدا ہونے والی ہر قسم کی پیداوار پر زکوٰۃ یعنی عشر واجب ہوگا اور جانوروں میں گھوڑوں پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ان کے علاوہ جو سامان ہیں ان پر زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوتی ہے۔ جب ان کی تجارت کی جائے یا ان کو تجارت کے لئے رکھا جائے۔ حافظ ابن رشد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے الفاظ میں:

”والنصاب فی العروض علی مذهب القائلین بذالك انما هو فی ما اتخذ منها للبيع خاصة.“^۱

یعنی دوسرے سامانوں میں جو لوگ زکوٰۃ واجب ہونے کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی ان ہی سامانوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی جس کو تجارت کے لئے مختص کر دیا گیا ہو۔ اسی طرح ”الجوہرۃ النیرۃ“ میں ہے ”فان كانت للتجارة فیہا زکوٰۃ التجارة بالاتفاق“^۲

تجارت اور اجارہ میں بڑا جوہری فرق ہے۔ تجارت میں ایک چیز کو کھوکرا اس کا نفع حاصل کیا جاتا ہے اور اجارہ میں اس چیز پر اپنی ملکیت باقی رکھتے ہوئے اس سے نفع حاصل کیا جاتا ہے..... لہذا اگر کسی کے پاس ایک سے زیادہ مکانات ہوں سائیکلیں اور گاڑیاں ہوں، سپلائنگ کمپنی کی نوعیت کے برتن، کپڑے، فرنیچر یا کتابیں

۱۔ بدایۃ المجتہد: ۳۵/۱ ۲۔ بدایۃ المجتہد: ۲۶۹/۱ ۳۔ حوالہ سابق ۴۔ الجوہرۃ النیرۃ: ۱۲۹/۱

ہوں جن کے مطالعہ کی فیس وصول کی جاتی ہو، ان تمام چیزوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ یہ اموال ”اجارہ“ (کرایہ) ہیں اور زکوٰۃ اموال تجارت پر ہے نہ کہ اموال اجارہ پر۔ اس سلسلہ میں کتب فقہ میں صریح جزیئہ موجود ہیں:

”رجل اشتری أعيانا منقولة يو اجرها مياومة ومشاهرة ومسانهة ويحصل له من المنقولات مال عظيم لا يجب فيها الزكوة لانها ليست بمال التجارة.“^۱ ترجمہ: ”ایک شخص نے کچھ اموال منقولہ (وہ مال جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جاسکتے ہوں) روزانہ، ماہانہ یا سالانہ کرایہ پر لگانے کے لئے خریدے اور اسے ان مالوں سے کافی فائدہ ہوا تو بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اس لئے کہ ان اموال کا اصل مقصد تجارت نہیں ہے۔“ اور یہ کہ:

”لو اشتری الرجل دارا أو عبدًا للتجارة ثم آجره يخرج من أن يكون للتجارة لانه لما آجره، فقد قصد المنفعة ولو اشتری قدورا من صفر يمسكها أو يواجرها لا تجب فيها الزكوة.“^۲ ترجمہ: ”کسی آدمی نے کسی شخص سے مکان یا غلام تجارت کی نیت سے لیا پھر اسے کرایہ پر لگا دیا تو اب وہ مال تجارت باقی نہیں رہے گا اور اگر تانبے کی کچھ ہانڈیاں اور دیگیں خرید کیں۔ ان کو رکھا اور کرایہ پر لگا تا رہا تو ان سامانوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔“ ہاں اس سے حاصل ہونے والی آمدنی اگر نصاب زکوٰۃ کے برابر ہو جائے تو اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ

شریعت نے اصولی طور پر معدنیات میں سوائے سونے اور چاندی کے کسی اور چیز میں زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی ہے۔ اس اصول کے مطابق ہیرے جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے سوائے اس کے کہ اسے تجارتی مقصد کے لئے خریدا گیا ہو، چنانچہ امام نووی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

”ولا تجب فيما سواهما من الجواهر كالياقوت الفيروز واللؤلؤ والمرجان.“^۳ ترجمہ: ”سونے چاندی کے علاوہ دوسرے جواہرات جیسے یاقوت، فیروز اور مرجان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔“

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”واما اليواقیت واللالی والجواهر فلا زکوۃ فیہا وان کانت حلیا الا ان تكون للتجارة.“^۱

ترجمہ: ”یا قوت، موتی اور جواہر میں زکوۃ نہیں گو وہ زیورات کی شکل میں ہوں سوائے اس کے کہ تجارت کے لئے ہو۔“

لیکن موجودہ دور میں اکثر اوقات لوگ اپنی دولت کی حفاظت اور ٹیکس سے بچاؤ کے لئے نقد رقم کو ہیرے جواہرات کی شکل میں تبدیل کر لیتے ہیں، چوں کہ اس صورت میں اصل مقصود ہیرے جواہرات کا حصول نہیں ہے بلکہ اپنی دولت کی حفاظت ہے اس لئے ہمارے دور کے متعدد بالغ نظر فقہاء کی رائے ہے کہ اس مقصد کے تحت خریدے گئے ہیرے اور جواہرات میں زکوۃ واجب ہوگی۔ لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ زکوۃ عبادات میں سے ہے اور مال زکوۃ اور مقدار زکوۃ کی تعیین خود نصوص نے کی ہے، اس لئے اس میں قیاس واجتہاد کو دخل نہیں، لہذا اگر ہیرے اور جواہرات تجارت کے ارادہ سے نہ لئے گئے ہوں تو ان میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اکثر علماء اور ارباب افتاء کی رائے یہی ہے، تاہم احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اور اختلاف سے بچتے ہوئے ان اموال کی بھی زکوۃ ادا کر دی جائے تو مزید باعث اجر ہے۔

سونے چاندی کے مصنوعی اعضاء پر زکوۃ

بعض حالات میں اور بعض خاص مصلحت کے پیش نظر سونے چاندی کے مصنوعی اعضاء کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے ناک، دانت، کھوکھلے دانتوں کا سونے چاندی سے بھرنا، سونے کے تاروں سے دانت کو باندھنا وغیرہ۔ ان میں سے بعض کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کو آسانی سے نکالا جاسکتا ہے اور ان کو رکھا ہی اس طرح جاتا ہے کہ ان کو لگایا اور نکالا جاتا رہے۔ جب کہ بعض اعضاء میں یہ دھاتیں اس طرح فٹ کی جاتی ہیں کہ ان کو آسانی سے نکالا نہیں جاسکتا۔ بلکہ وہ مستقل طور پر لگادی جاتی ہیں۔ جو اعضاء نکالے جاسکتے ہیں جیسے کہ ناک وغیرہ ان میں تو زکوۃ واجب ہوگی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے زیورات میں زکوۃ واجب قرار دی ہے ہاں جو فقہاء زیورات میں زکوۃ کے عدم وجوب کے قائل ہیں، ان کے نزدیک ان مصنوعی اعضاء میں بھی زکوۃ واجب نہ ہوگی اور جو اس طرح نہ ہوں، ان میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ زکوۃ واجب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مال نامی ہو یعنی اس میں نشوونما اور بڑھوتری کی گنجائش ہو اور موجودہ صورت میں ظاہر ہے کہ اس کا کوئی امکان

نہیں۔ دوسرے جب وہ انسان کے جسم کا ایک ایسا عضو بن جائے جس کو الگ کیا جانا ممکن نہ ہو تو اب وہ انسان کی بنیادی ضروریات (حاجات اصلیہ) میں داخل ہو گیا اور ایسی چیزوں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

صنعتی اوزاروں، مشینوں اور اشیاء کا حکم

صنعتی اوزار اور سامان دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کو کسی کام کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور ان کا اثر اس شے میں باقی نہیں رہتا۔ دوسری وہ جو بعینہ اس میں لگادی جاتی ہیں۔ مثلاً موٹر کی درستگی کے بعض اوزار ایسے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ اس سے چیزیں ٹھیک کر دی جائیں، کاریگر ان سے اسی قدر کام لیتا ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں جو مشینیں ہیں وہ اسی نوعیت کی ہیں اور بعض سامان خاص اسی مقصد کے لئے ہوتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر ان کو موٹر میں فٹ کر دیا جائے۔

ان دونوں میں سے پہلی قسم کی چیزوں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ ان میں مشینیں، گھڑی ساز، بڑھئی، لوہار، موٹر سائیکل درست کرنے والوں اور کاشتکاروں وغیرہ کے صنعتی اوزار داخل ہیں۔ دوسری قسم کی چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اس میں گھڑی، ریڈیو اور موٹر سائیکل وغیرہ کے قابل فروخت اجزاء شامل ہیں، کیوں کہ یہ مال تجارت کا درجہ رکھتے ہیں چنانچہ فقہاء پہلی قسم کی چیزوں کو ”بنیادی ضرورت“ (حاجت اصلیہ) اور دوسری قسم کی چیزوں کو قابل زکوٰۃ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”و کذا کتب العلم إن کان من اہله وآلات المحترفين هذا فی الآلات التي ینتفع بنفسها ولا یرقی أثرها فی المعمول وأما إذا کان یرقی أثرها فی المعمول کمالو اشتری الصباغ عصفرا لیصبغ ثياب الناس بأجرو حال علیہ الحول کان علیہ الزکوٰۃ.... و إن لم یبق لذلک العین اثر فی المعمول کالصابون والحرص لا زکوٰۃ فیہ.“

ترجمہ: ”ایسے ہی جن اشیاء میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ان میں اہل علم کے لئے علمی کتابیں اور صنعت کاروں کے لئے آلاتِ صنعت و حرفت ہیں۔ مگر یہ احکام ان آلات کی بابت ہیں جن سے اس صنعت میں فائدہ تو اٹھایا جاتا ہے لیکن مصنوعات میں اس کا اثر باقی نہیں رہتا۔ اس کے برخلاف وہ اشیاء جن کے اثرات مصنوعات میں باقی رہتے ہیں مثلاً رنگریز نے اجرت لے کر لوگوں کے کپڑے رنگنے کے لئے زعفران یا کوئی اور رنگ خریدا اور ان اشیاء پر سال گزر گیا تو اب اگر اس کی مالیت نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جاتی ہو تو ان سامانوں کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ یہ حکم ایسی تمام اشیاء کے

لئے ہے جن کو کام کے لئے خریدا جائے اور ان کا اثر مصنوعات میں باقی رہتا ہو مثلاً تیل چڑے کی دباغت کے لئے کہ اگر اس پر ایک سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر مصنوعات میں اس کا اثر باقی نہ رہے جیسے صابن اور ”حرض“ نامی شے جس سے کپڑا دھویا جاتا ہے تو اس میں زکوٰۃ نہ ہوگی۔

باؤنڈز کی زکوٰۃ

باؤنڈز اصل میں قرض کی سند اور اس کی دستاویز ہے، گو آج کل باؤنڈز کی بھی خرید و فروخت ہونے لگی ہے، مگر شرعاً یہ ناجائز اور حرام ہے، فقہ کی اصطلاح میں باؤنڈز کی حیثیت ”دین قوی“ کی ہے، اس لئے قرض کی وصولی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی، سود کی شکل میں جو رقم حاصل ہو وہ تو حرام ہونے کی وجہ سے کل کی کل واجب التصدق ہے، لیکن اگر اس شخص نے صدقہ نہ کیا ہو تو پھر اس کا حکم بھی زکوٰۃ کے باب میں دوسرے اموال حرام کا سا ہوگا، مال حلال کے ساتھ اس طرح مل جائے کہ سودی رقم کا حساب بھی محفوظ نہ رہے تو امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے کے مطابق دوسرے اموال کے ساتھ ملا کر اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

شیرز کی زکوٰۃ

شیرز کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں عام طور پر یہ بحث کی جاتی تھی کہ شیرز کی نوعیت صنعتی ہے یا تجارتی؟ اگر اس کی نوعیت صنعتی ہو یعنی اس کے ذریعہ مشنریز اور آلات خرید کئے جاتے ہوں اور پھر ان سے مال تیار کیا جاتا ہو، تو اصولی طور پر مشنریز کی صورت میں جو سرمایہ محفوظ ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کل حصص بجائے خود ایک تجارت بن گئے ہیں اور بڑے پیمانے پر اس کی خرید و فروخت عمل میں آتی ہے، اسی لئے عصر حاضر کے محقق علماء نے شیرز کو مطلق ایک تجارت تسلیم کیا ہے اور یہی موجودہ ماہرین اقتصادیات کی رائے ہے۔

لہذا شیرز بجائے خود سامان تجارت ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہے، جن لوگوں نے اس نیت سے حصص خریدے ہوں کہ حصص کو باقی رکھتے ہوئے کمپنی جو نفع دے اس سے استفادہ کرما ہے، ان کو تو زکوٰۃ حصص کی اصل قیمت کے لحاظ سے ادا کرنی ہوگی، جو خود کمپنی کو تسلیم ہو۔ جن لوگوں نے حصص اس مقصد کے لئے خرید کیا ہو کہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کر دیں گے ان لوگوں کو موجودہ مارکیٹ قیمت کے لحاظ سے حصص کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے، مثلاً کمپنی کے نزدیک اس کی قیمت پچیس روپے ہے اور بازار میں اس وقت یہ حصص ڈھائی سو روپے کے حساب سے فروخت کئے جا رہے ہیں تو پہلی صورت میں پچیس روپے کے حساب سے اور دوسری صورت میں ڈھائی سو روپے کے حساب سے قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

قرض پر لگائی ہوئی رقم

شریعت میں جو رقم یا چیز کسی کے ذمہ باقی ہو اسے ”دین“ کہتے ہیں۔ زکوٰۃ کے احکام کے لحاظ سے یہ دین چار قسم کے ہیں:

۱۔ وہ قرض جو کسی شخص کو دیا گیا ہو یا تاجر نے وہ سامان جو تجارت ہی کے لئے تھا بیچا ہو اور اس کی قیمت باقی ہو، اگر یہ رقم کل کی کل ایک ساتھ مل جائے تو سبھوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اور اگر کئی سالوں کے بعد ملی تو تمام سالوں کی بیک وقت ادا کی جائے گی۔ اگر یہ رقم تھوڑی تھوڑی وصول ہو تو جتنا روپیہ وصول ہوا اتنے کی زکوٰۃ ادا کرتا جائے..... اس کو فقہ کی اصطلاح میں ”دین قوی“ کہتے ہیں۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سامان کی قیمت تو باقی ہو لیکن وہ سامان اصلاً تجارت کے لئے نہیں تھا، اس مال پر بھی اسی وقت زکوٰۃ واجب ہوگی جب وصول ہو جائے اور وصولی کے بعد اس پوری مدت کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی جب سے اس نے وہ سامان بیچا تھا۔ البتہ اس رقم پر اسی وقت زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی جب یہ تمام رقم اکٹھی وصول ہو جائے اور زکوٰۃ کے نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے۔ اگر تھوڑی تھوڑی رقم وصول ہوتی رہے، کبھی سو کبھی دو سو، کبھی چار سو تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ ایسی باقی رقم کو ”دین وسط“ کہتے ہیں۔

۳۔ ایسی رقمیں جو کسی مال کے بدلے میں باقی نہ ہوں جیسے مہر کی رقم کہ وہ کسی مال کے عوض میں نہیں ہے بلکہ عورت کی عصمت کا معاوضہ ہے اس پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب مال پر قبضہ ہو جائے اور قبضہ کے بعد ایک سال گزر جائے..... فقہ کی اصطلاح میں اس کو ”دین ضعیف“ کہتے ہیں۔

۴۔ ایسا قرضہ جس کی وصولی یا ایسا مال جس کو حاصل کرنا دشوار ہو اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، ہاں اگر غیر متوقع طور پر کبھی وہ مال وصول ہو گیا تو اب اس پوری مدت کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی..... فقہ کی اصطلاح میں اس کو ”مال ضار“ کہا جاتا ہے۔

یہ فقہی احکام گواہی اپنی نوعیت کے لحاظ سے جدید نہیں ہیں۔ مگر آج کل بقایا جات اور دین کی جو مختلف صورتیں نئے معاشی نظام اور طریق انتظام کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں ان اصولی احکام کے ذریعہ ان کو بہ آسانی حل کیا جاسکتا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

طویل مدتی دیون کی زکوٰۃ

سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی طرف سے آج کل ترقیاتی اور صنعتی قرضے فراہم کئے جاتے ہیں، طویل

مدت میں ان کی ادائیگی مطلوب ہوتی ہے ان قرضوں کی مقدار تو بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن ہر سال ادا طلب قسط بہت معمولی ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے قرضے پورے کے پورے منہا کر کے زکوٰۃ واجب ہوگی یا ہر سال کی مطلوبہ قسط ہی منہا کی جائے گی اور باقی پورے مال کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟

فقہاء احناف کے عام اصول کا تقاضا تو یہی ہے کہ ایسی صورت میں پورے قرض کو منہا کیا جائے اس کے بعد جو رقم بچ جائے اس میں زکوٰۃ واجب ہو..... لیکن ایسے طویل مدتی دیون کو مستثنیٰ کرنے میں فقراء کو اپنے حق سے محروم ہونا پڑتا ہے اور صاحب مال کو ایک ایسے مال کی زکوٰۃ سے چھوٹ مل جاتی ہے جو اس کے تصرف میں ہے اور جس کی ادائیگی میں اسے بہت مہلت حاصل ہے، اس لئے ان حالات میں سب سے متوازن، شریعت کی روح و مقصد سے ہم آہنگ اور معتدل رائے یہ ہے کہ ہر سال قرض کی جو قسط ادا کی جانی ہے صرف وہی مقدار زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگی بقیہ پورے مال میں زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

اس سلسلہ میں فقہاء کے یہاں ایک نظیر بھی موجود ہے کہ دیر سے ادا کیا جانے والا مہر (مہر مؤجل) منہا کئے بغیر پورے مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ چنانچہ علامہ کا سانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نقل کرتے ہیں:

”وقال بعض مشائخنا إن المؤجل لا يمنع لانه غير مطالب عادة.“^۱

ترجمہ: ”ہمارے بعض مشائخ کہتے ہیں کہ ادھار مہر زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے مانع نہیں کیوں کہ عام طور سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جاتا ہے۔“

خود امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سے بھی اس طرح کے اقوال منقول ہیں کہ دین مؤجل یعنی دیر سے قابل ادائیگی قرضے زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع نہیں ہیں اور علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے نقل کیا ہے کہ یہی قول صحیح ہے۔^۲

پراویڈنٹ فنڈ میں زکوٰۃ

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا وہ حصہ جو تنخواہ سے کاٹ لیا جاتا ہے، اجرت ہے اور اس پر جو اضافی رقم ملازمت کے اختتام پر دی جاتی ہے وہ انعام ہو یا اجرت، ملازم ابھی اس کا مالک نہیں، اس لئے اس پر گزرے ہوئے دنوں کی زکوٰۃ واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قابل بحث صرف فنڈ کا وہ حصہ ہے جو ملازمت کے درمیان تنخواہ سے کٹ کر جمع ہو۔

فقہاء کے یہاں اس میں اختلاف ہے کہ اجرت کا شمار کس قسم کے دین میں ہے؟..... سرخسی

رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے امام ابو حنیفہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی سے تینوں طرح کے اقوال نقل کئے ہیں۔ دین قوی، دین وسط اور دین ضعیف۔ تاہم ظاہر روایت یہی ہے کہ اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

”اما الا جرة ففى ظاهر الرواية عن أبى حنيفة هو نصاب قبل القبض لكن لا يلزمه الأداء ما لم يقبض منه مائى درهم.“^۱

ترجمہ: ”امام ابو حنیفہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی سے ظاہر روایت کے مطابق اجرت قبضہ سے پہلے ہی نصاب زکوٰۃ متصور ہوگی، لیکن جب تک پورے نصاب (۲۰۰ درہم) پر قبضہ نہ کر لے زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہ ہوگی۔“

تاہم دین قوی و اوسط کی تعریف پر نظر کی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کی ان عبارتوں میں اجرت سے ”غلام“ ہی کی اجرت مراد ہے۔ اس لئے کہ دین کی ان دونوں قسموں میں دین کے لئے مال کا عوض ہونا بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ غلام ہی کی خدمت حنیفہ کے یہاں مال کے درجہ میں ہے۔ اس طرح آزاد کی اجرت دین ضعیف قرار پاتی ہے، جس پر ملازمین کو ملکیت تو حاصل ہے، ”ید“ و قبضہ حاصل نہیں ہے، لہذا اس رقم پر گزرے ہوئے دنوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے، علماء ہند میں مفتی محمد شفیع صاحب اور مفتی جمیل احمد صاحب رَحِمَهُما اللہُ تَعَالٰی نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے کہ اس رقم میں گزشتہ ایام کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

بینک میں جمع شدہ مال پر زکوٰۃ

بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھی جائے یا فلکسڈ ڈپازٹ کی جائے ہر دو صورت میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے ملکیت اور قبضہ ضروری ہوتا ہے۔ بینک میں جمع رقم پر ملکیت تو جمع کرنے والے کی ظاہر ہی ہے، قبضہ بہ ظاہر اس کا نہیں ہے مگر چوں کہ اس نے اپنے ارادہ و اختیار سے بینک میں رقم جمع کی ہے، لہذا بینک قبضہ میں اصل مالک کا نائب ہے اس طرح بالواسطہ جمع کنندہ کا قبضہ بھی ثابت و متحقق ہے، اس لئے فقہاء نے ازراہ امانت رکھے گئے مال میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے کیوں کہ امین کا قبضہ اصل مالک کا قبضہ ہے لہذا ہر ایسی جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی جس کو مالک نے اپنے اختیار و مرضی سے جمع کیا ہو۔

حلال و حرام مخلوط مال پر زکوٰۃ

اگر کسی شخص کے حلال و جائز مال کے ساتھ حرام مال کی بھی آمیزش ہوگئی ہو، جیسے رشوت یا بینک انٹرسٹ یا انٹرنس کے ذریعہ حاصل ہونے والی اضافی رقم، تو اگر مال حرام علاحدہ و ممتاز ہو یا اس کا حساب اس طرح محفوظ

ہو کہ اس کی علاحدگی ممکن ہو تو اگر مال حرام کا مالک شخص متعین ہو اور اس کو پہنچانا ممکن ہو تو اس کو واپس کر دے ورنہ بلا نیت صدقہ فقراء پر یا رفاہی کاموں میں خرچ کر دے۔ اور اگر مال حرام نہ علاحدہ ہو نہ اس کا حساب ممکن ہو تو پورے مال کی زکوٰۃ ادا کر دے۔ کیوں کہ امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک مال حرام کے مالِ حلال کے ساتھ مخلوط ہو جانے کی وجہ سے اس پر ملکیت ثابت ہو جاتی ہے اور چوں کہ احکام شرعیہ کی تعیین میں اس قول کے مطابق زیادہ آسانی اور زکوٰۃ کے مسئلہ میں فقراء کے لئے نفع ہے، اس لئے فقہاء نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

ہکفی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”ولو خلط السلطان المال المغصوب بما له ملكه فتجب الزكاة فيه ويورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم يمكن تميزه عند ابى حنيفة وقوله ارفق اذ قلما يخلو مال عن غصب.“^۱

ترجمہ: ”اگر بادشاہ چھینے ہوئے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا دے تو وہ اس کی ملکیت میں آ جاتا ہے، اس میں زکوٰۃ واجب ہے، اس میں وراثت جاری ہوگی، اس لئے کہ اپنے مال سے اس طرح ملا دینا کہ علاحدگی ممکن نہ ہو، امام ابو حنیفہ کے نزدیک ”استهلاك“ ہے۔ امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا یہ قول زیادہ مناسب ہے کیوں کہ بہت کم ایسے مال ہیں جس میں غصب کی آمیزش نہ ہو۔“

پیشگی کرایہ اور ڈپازٹ کی زکوٰۃ

ان دنوں شہروں میں کرایہ داروں سے پیشگی اور ڈپازٹ لینے کا عام رواج ہے، سوال یہ ہے کہ اس طرح کی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر واجب ہوگی یا کرایہ دار پر؟..... یہ بھی ان مسائل میں سے ہے جس میں فی زمانہ عام ابتلاء پایا جاتا ہے۔

جہاں تک پیشگی رقم کی بات ہے تو یہ تو واضح ہے کہ یہ رقم مالک مکان کی ملکیت میں آ جاتی ہے اس لئے مالک مکان ہی کو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، چاہے جتنے دنوں کا کرایہ اس نے پیشگی وصول کر لیا ہے خواہ کرایہ دار ابھی اتنے دنوں مکان میں نہ رہا ہو، چنانچہ ابن ہمام رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”واما زكاة الأجرة المعجلة عن سنين في الاجارة الطويلة التي يفعلها بعض الناس عقودا ويشترطون الخيار ثلاثة أيام في رأس كل شهر فتجب على الآجر لأنه ملكها بالقبض.“^۲

^۱ فتح القدیر: ۷/۲

^۲ الدر المختار علی هامش الرد: ۲۵/۲

تَرْجَمًا: ”طویل اجارہ جس کا معاملہ بعض لوگ کرتے ہیں اور ہر ماہ کے شروع میں تین دنوں کے لئے اختیار شرط لیتے ہیں، میں چند سال کی اجرت پیشگی ادا کر دی جائے تو اس کی زکوٰۃ مالک پر واجب ہوگی، اس لئے کہ قبضہ کر کے وہ اس کا مالک ہو گیا ہے۔“

پس پیشگی دیئے گئے کرایہ کی زکوٰۃ مالک مکان پر واجب ہوگی۔ البتہ ڈپازٹ اور ضمانت کے طور پر دی گئی رقم کا مسئلہ قابل غور ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہ ہونی چاہئے، نہ مالک مکان پر نہ کرایہ دار پر، اس لئے کہ یہ ایک طرح کا رہن ہے اور رہن کی زکوٰۃ دونوں میں سے کسی پر واجب نہیں ہوتی ہے..... لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت رہن سے مختلف ہے، رہن کے طور پر جو سامان رکھا جاتا ہے وہ خود اس مال سے استفادہ نہیں کر سکتا، لیکن زیر بحث صورت میں مالک مکان اس رقم سے معاشی نفع اٹھاتا ہے، اب اگر فقراء کو ان کے حق سے محروم رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ قرین انصاف نہ ہوگا اس لئے مالک مکان پر اس کی زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے، اس سلسلہ میں فقہاء کے یہاں ایک نظیر بھی ملتی ہے کہ ”بیع وفا“ کو رہن کے حکم میں مانا گیا ہے اور جو قیمت بیچنے والے کے ہاتھ آتی ہے اکثر مشائخ کے یہاں اسی پر اس کی زکوٰۃ بھی واجب ہوتی ہے۔ جب کہ بعض مشائخ نے خریدار پر زکوٰۃ واجب قرار دی ہے..... پس بیع وفا کو باوجود رہن تسلیم کرنے کے فقہاء نے زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں کیا ہے کیوں کہ اس میں ادا کی جانے والی قیمت سے استفادہ کیا جاتا ہے اور صاحب معاملہ کو اس سے نفع پہنچتا ہے یہی حکم اس صورت میں بھی ہوگا۔ واللہ اعلم۔

جس سودے پر قبضہ نہیں کیا، اس کی زکوٰۃ

کسی شخص نے تجارتی سامان خرید کیا لیکن ابھی قبضہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ وقت آ گیا جب اسے زکوٰۃ ادا کرنی ہوتی ہے، تو کیا ایسے شخص کو اس سامان کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی جو ابھی اس کے قبضہ میں نہیں آئی ہے؟..... اس مسئلہ سے عام طور پر وہ لوگ دو چار ہوتے ہیں جو بیرون ملک یا خود اندرون ملک دور دراز شہروں سے تجارت کیا کرتے ہیں۔

فقہاء حنفیہ کے یہاں اس سلسلہ میں صراحت ملتی ہے کہ اس طرح کے تجارتی مال پر جب تک قبضہ حاصل نہ ہو جائے، زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، علامہ ابن نجیم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی مصری کا بیان ہے:

”لا تجب الزکوٰۃ علی المشتري فیما اشتراه للتجارة قبل القبض لعدم الید.“

تَرْجَمًا: ”تجارت کے لئے خرید کردہ مال پر خریدار کے ذمہ زکوٰۃ نہیں تا آنکہ اس پر قبضہ کر لے،

کیوں کہ مال ابھی اس کے ہاتھ میں آیا ہی نہیں۔“

زکوٰۃ میں کس قیمت کا اعتبار ہوگا؟

ایسے سامان تجارت جن کی فروختگی دیر سے عمل میں آئے، ان کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اشیاء کی زکوٰۃ نکالنے میں اس کی قیمت خرید معتبر ہوگی یا یا موجودہ قیمت؟ اس میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک جس وقت مال پر سال گزرا اور زکوٰۃ واجب ہوئی اس وقت کی قیمت معتبر ہوگی۔ قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک جس وقت زکوٰۃ ادا کر رہا ہے اس وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔

”وإن أدى من قيمته يعتبر يوم الوجوب وهو تمام الحول عند الامام وقالوا يوم الاداء لمصرفها.“^۱

ترجمہ: ”اگر قیمت کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کرے تو امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک یوم وجوب یعنی اختتام سال کا اعتبار ہوگا، صاحبین رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دن کی قیمت کا جس دن مصرف زکوٰۃ میں اس کو ادا کرے۔“

ان دونوں رایوں میں صاحبین رحمہم اللہ تعالیٰ کی رائے زیادہ قرین صواب ہے اس لئے کہ شریعت میں اصلاً تو خود وہ شے واجب ہوتی ہے جس کی زکوٰۃ ادا کر رہا ہے قیمت تو محض اس کا بدل اور عوض ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ادائیگی کے وقت اتنی رقم ادا کرے جس میں اس سامان کا بدل بننے کی صلاحیت موجود ہو۔ خاص طور پر جو لوگ اراضی کا کاروبار کرتے ہوں ان کو اسے ملحوظ رکھنا چاہئے کہ زکوٰۃ موجود قیمت کے لحاظ سے ادا کرنی چاہئے۔

ہول سیل یا پھٹکر کی قیمت؟

اگر ہول سیل تجارت ہو تو زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے ہول سیلی قیمت معتبر ہوگی اور اگر پھٹکر اور ریشیل سیل کا کاروبار ہے تو اسی لحاظ سے سامان تجارت کی قیمت لگائی جائے گی اور پھر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اگر دونوں طرح سامان فروخت کیا کرتا ہو تو پھٹکر قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرے کہ اس میں فقراء کا فائدہ ہے اور اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ میں ہمیشہ اس پہلو کو ترجیح دی جائے گی جس میں فقراء کا فائدہ ہو، چنانچہ امام سرخسی رحمہم اللہ تعالیٰ کا بیان ہے:

”لابد فی اعتبار منفعة الفقراء عند التقويم لاداء الزکوٰۃ فيقومها بأففع

^۱ مراقی الفلاح: ہندیہ: ۱۸۰/۱

النقدین۔“^۱

تَرْجَمًا: ”زکوٰۃ کی ادائیگی قیمت سے کرنے کی صورت میں فقراء کی منفعت کا خیال رکھنا ضروری ہے، لہذا قیمت لگانے میں نقدین (سونا و چاندی) میں سے اس کا اعتبار کیا جائے گا جس میں فقراء کا زیادہ نفع ہو۔“

بیوی کا مہر، زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع نہیں

مقدار نصاب کا مالک ہونے کے بعد زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوتی ہے جب آدمی پر اتنا زیادہ قرض نہ ہو کہ اس کے ادا کرنے میں نصاب زکوٰۃ باقی نہ رہ سکے۔ اس قرض سے حقوق اللہ مستثنیٰ ہیں یعنی بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو قرض ہیں مثلاً کفارہ، صدقہ فطر، سفر حج وغیرہ، ان کے اخراجات منہا کرنے کے بعد اگر مال اتنا نہ رہتا ہو کہ زکوٰۃ واجب ہو سکے تو بھی زکوٰۃ واجب ہوگی اور یہ حقوق اللہ زکوٰۃ واجب ہونے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔^۲

البتہ بندوں کے جو حقوق ہوں ان کی ادائیگی کے بعد اگر نصاب باقی نہ رہتا ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس کا تقاضا ہے کہ بیوی کے مہر کی رقم وضع کرنے کے بعد اگر نصاب باقی نہ رہ پاتا ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہو۔ مگر عملاً چوں کہ ہمارے زمانے میں لوگ مہر سے بہت غافل ہو چکے ہیں اور بیویاں عموماً اسے معاف کر دیتی ہیں اس لئے اس قرض کی وجہ سے زکوٰۃ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور زکوٰۃ واجب ہوگی۔۔۔۔۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”قال مشائخنا فی رجل علیہ مہر مؤجل لا مرأً تہ وهو لا یرید أدائہ لا یجعل مانعا من الزکوۃ۔“^۳

تَرْجَمًا: اگر مرد کے ذمہ مہر مؤجل ہو اور وہ اس کی ادائیگی کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو یہ قرض وجوب زکوٰۃ کے لئے رکاوٹ نہیں ہوگا۔

زکوٰۃ اور ٹیکس

ٹیکس کی ادائیگی کو زکوٰۃ کے لئے کافی سمجھ لینا یا زکوٰۃ کی کچھ رقم کا بطور ٹیکس ادا کر دینا نہ درست ہے اور نہ کافی۔ زکوٰۃ اور ٹیکس کے درمیان بڑا بنیادی اور جوہری فرق ہے۔ زکوٰۃ ایک عبادت ہے۔ اسی لئے اس میں نیت اور ارادہ ضروری ہے۔ اخلاص و خدا ترسی مطلوب ہے۔ اس کے لئے متعین مصارف ہیں، ان ہی پر ان کو خرچ کیا جاسکتا ہے۔ غیر مسلموں اور عام رفاہی کاموں میں اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔ اس کی ایک مقدار اور تناسب متعین ہے، واجب ہونے کے لئے دولت کی ایک حد مقرر ہے۔ پھر اس کی ادائیگی کے لئے ایک سال کی مدت

ہے۔ بعض خصوصی اموال ہی ہیں جن میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، ہر مال پر واجب نہیں ہوتی۔ یہ سارے احکام کتاب و سنت سے ثابت ہیں۔ اس میں ادنی تبدیلی اور تغیر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے برخلاف ٹیکس عبادت نہیں ہے بلکہ حکومت کی اعانت یا اس سے پہنچنے والے فائدہ کا معاوضہ ہے، نہ اس کے لئے کوئی متعین تناسب اور مقدار ہے نہ کسی مال کی تعیین ہے، نہ اس کے لئے نیت و ارادہ کا کوئی سوال ہے، نہ اس کے مصارف وہ ہیں جو زکوٰۃ کے ہیں اور نہ اس کے لئے وہ مناسب حدیں ہیں جو شریعت زکوٰۃ کے لئے متعین کرتی ہے بلکہ بسا اوقات یہ ظلم کی سطح تک پہنچ جاتا ہے۔

مساجد اور پلوں وغیرہ کی تعمیر میں زکوٰۃ خرچ کرنا

زکوٰۃ کے کچھ مخصوص مصرف ہیں جس کی خود قرآن مجید میں صراحت موجود ہے۔ صرف ان ہی امور پر یہ رقم خرچ کی جاسکتی ہے (التوبہ۔ ۶۰) احناف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں ان تمام صورتوں میں ضروری ہے کہ زکوٰۃ جن کو ادا کی جائے وہ مالک بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ مسجد یا پلوں کی تعمیر وغیرہ میں یہ رقم خرچ کی جاتی ہے تو صرف یہ رقم خرچ ہو جاتی ہے کوئی خاص آدمی اس کا مالک نہیں بنتا، اس لئے ان دوسرے کاموں کو کرنا تو چاہیے مگر زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عطیات سے، زکوٰۃ ان چیزوں میں نہیں خرچ کی جاسکتی۔

”ولا يجوز ان يبني بالزكاة المسجد و كذا القناطير والسقايات واصلاح

الطرقات و كرى الانهار والحج والجهاد و كل ما لا تملك فيه.“^۱

ترجمہ: ”زکوٰۃ مسجد، پل اور سرائے کی تعمیر، سڑکوں کی مرمت، نہروں کی کھدائی، حج، جہاد اور ایسی کسی چیز میں بھی خرچ نہیں کی جاسکتی جس میں مالک بنانے کی بات نہ پائی جاتی ہو۔“

نوٹوں سے زکوٰۃ کی ادائیگی

نوٹ یعنی رائج الوقت سکہ اگر اتنی مقدار میں ہو کہ اس سے نصاب زکوٰۃ کے برابر سونا یا چاندی خرید کیا جاسکے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر اتنی رقم نہ ہو، کچھ پیسے اور کچھ سونا و چاندی ہو اور دونوں مل کر چاندی یا سونے کسی کا نصاب مکمل کر دیتے ہوں تو ان پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اس پر تو سب کا اتفاق ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کاغذی نوٹوں کی حیثیت بجائے خود ”نمن“ کی ہے یا یہ محض مال کے لئے وثیقہ اور سند ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی اور بہت سے علماء کی رائے ہے کہ ان کی حیثیت محض وثیقہ اور قرض کے سند کی ہے اور یہ گویا اس بات کا ایک کاغذی ثبوت ہے کہ روپیہ والے کا اتنا مال

حکومت کے ذمہ قرض ہے۔ اس کے برخلاف مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے بعض فتاویٰ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو قیمت اور مستقل مال کی حیثیت دیتے ہیں۔^۱

پہلی رائے کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے صرف نوٹوں کا دینا کافی نہ ہوگا بلکہ اس سے مال خرید کر کے دینا ہوگا۔ مثلاً اگر کسی کو بطور زکوٰۃ نوٹ دے دیئے اور یہ روپے اس سے گم ہو گئے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوئی..... اسی طرح اگر نوٹ بطور زکوٰۃ دے دیئے اور ایک مدت کے بعد وہ رقم استعمال میں لائی گئی جیسا کہ عموماً دینی مدارس میں ہوا کرتا ہے اور اس وقت تک روپیہ کی قیمت کم ہو گئی تھی تو زکوٰۃ کی ادائیگی میں نقص باقی رہ گیا..... جب کہ دوسری رائے کے مطابق نوٹ کی حیثیت بجائے خود مال کی ہوگی اس کا ادا کر دینا زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے کافی ہوگا اور آدمی اپنی ذمہ داری سے بری ہو جائے گا۔

آج کل کاغذی نوٹوں کا استعمال جس قدر بڑھ گیا ہے اس کے پیش نظر راقم الحروف کی رائے وہی ہے جو علامہ لکھنوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی ہے اور میرے خیال میں اس کی حیثیت فلوس نافقہ اور مستقل مال کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

دینی مدارس کو زکوٰۃ کی ادائیگی

دینی مدارس کی حیثیت دراصل دین کے مضبوط قلعوں اور الحاد و دھرت کے سمندر میں محفوظ جزیروں کی ہے۔ مسلمانوں کے سیاسی زوال اور اس کے بعد سے اسلام کو مٹانے کی پیہم کوششوں کے باوجود ہمارے ملک میں اسلام کا محفوظ رہنا بلکہ یہاں کی مذہبی حالت کا عالم اسلام سے بھی بہتر ہونا بڑی حد تک ان ہی مدارس کا فیض ہے۔ اللہ تعالیٰ اس نظام کو جاری و ساری رکھے۔

اسلام نے زکوٰۃ کے جو مصارف بتائے ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا مقصد صرف غرباء اور مستحقین کی مدد ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کا تحفظ بھی ہے۔ چنانچہ ”فی سبیل اللہ“^۲ سے اکثر فقہاء کے نزدیک مجاہدین کی مدد مراد ہے جو اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں اور ”مولفۃ القلوب“ سے نو مسلموں یا ان غیر مسلموں کا تعاون مراد ہے جن سے شرک اندیشہ ہو۔ ظاہر ہے زکوٰۃ کے یہ دونوں مصارف ”اسلام کی حفاظت“ ہی کا ایک حصہ ہیں۔

تعلیمی اداروں کی اور اہل علم کی مدد بھی دراصل دین ہی کی مدد کا ایک حصہ ہے۔ اسی لئے فقہاء نے ”عالم ضرورت مند“ کو صدقہ دینے کو فضیلت دی ہے۔

^۱ ملاحظہ ہو مجموعۃ الفتاویٰ علی ہامش خلاصتہ الفتاویٰ، کتاب البیوع نرخ در بیع سلم، سلم در فلوس رائجہ

^۲ التوبہ: ۶۰

”التصدق على العالم الفقير افضل من التصديق على الجاهل.“^۱

ترجمہ: ”جاہل کو صدقہ دینے سے ضرورت مند عالم کو صدقہ دینا بہتر ہے۔“

امام غزالی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور عبد اللہ بن مبارک رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ بھی اہل علم پر خرچ کرنے کو فوقیت دیتے تھے تاکہ علم دین کی خدمت کے لئے وہ فارغ اور بے فکر ہو سکیں..... اس لئے دینی مدارس میں زکوٰۃ کی رقم نہ صرف یہ کہ دینا درست ہے بلکہ بہتر اور دوہرے اجر کا باعث ہے۔

البتہ دینی مدارس جو زکوٰۃ کی رقم وصول کریں ان کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ یہ رقم یا تو ایسے بالغ بچوں کی ضروریات پر صرف کی جائے جو خود نصاب زکوٰۃ کے مالک نہ ہوں یا ایسے نابالغ بچوں پر جن کے والد اتنے مال کے مالک نہ ہوں کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہو۔ ایسے نابالغ بچوں پر اس رقم کا خرچ کرنا درست نہیں جن کے والد پر زکوٰۃ واجب ہو جائے اور نہ اس کو اساتذہ وغیرہ کو بطور اجرت دیا جاسکتا ہے۔

”لا يجوز الدفع إلى صغير والده غني وإن كان الابن كبيراً جازاً.“^۲

ترجمہ: ”ایسے نابالغ بچہ کو زکوٰۃ دینی درست نہیں ہے جس کے والد مال دار ہوں اور اگر بچہ بالغ ہو تو اس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔“

وصولی زکوٰۃ میں نظم و مدارس کی حیثیت

اللہ کا شکر ہے کہ ہندو پاک میں دینی مدارس کا ایک غیر معمولی نظام قائم ہے اور اس خطہ میں اسلام کی بقاء اور مسلمانوں کا دینی و ملی وجود اسی نظام کا رہن منت ہے۔ یہ نظم کسی مستقل سرکاری یا غیر سرکاری امداد پر مبنی نہیں ہے، بلکہ عام مسلمانوں کی اعانتوں اور نصرتوں سے ان اخراجات کی تکمیل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان اعانتوں کا بڑا حصہ زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی رقم ہے، مدارس کے نظماء و سفراء زکوٰۃ وصول کرتے ہیں، پھر مدرسہ ان کو طلبہ کے اخراجات پر خرچ کرتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ذمہ داران مدرسہ کی حیثیت کیا ہے؟ اگر یہ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کی طرف سے وکیل ہیں تو جب تک مصارف زکوٰۃ میں خرچ نہ کر دیں زکوٰۃ ادا نہ ہو۔ اگر ان سے یہ رقم ضائع ہو جائے تو زکوٰۃ دینے والوں پر دوبارہ زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہو جائے اور اگر ان کو حاجت مند طلبہ کی طرف سے نائب مانا جائے اور ان کا وکیل تصور کیا جائے تو رقم وصول کرتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، کیوں کہ وکیل کا قبضہ اصل کا قبضہ متصور ہوتا ہے اور فقراء کے وکیل کی حیثیت سے متنوع مصارف میں خرچ کرنے کی اجازت بھی

^۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۱۸۷، الباب السابع فی المصارف ^۲ احیاء علوم الدین: ج ۱، کتاب الزکوٰۃ: ص ۲۲۱

^۳ خلاصتہ الفتاویٰ: ۱/۲۴۲

حاصل ہو جائے گی۔

صورت حال یہ ہے کہ جب طلبہ نے مدرسہ میں داخلہ لیا اور اپنی امداد منظور کرائی تو گویا انہوں نے ناظم مدرسہ کو اپنے لئے زکوٰۃ وصول کرنے کا وکیل بنایا۔ اس حیثیت سے وہ طلبہ کا وکیل ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والوں نے زکوٰۃ حوالہ کی کہ اسے غرباء اور مصارف زکوٰۃ میں خرچ کر دیں، اس پہلو سے وہ زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ نظاماء مدارس کو طلبہ اور زکوٰۃ دہندگان دونوں کا وکیل تصور کیا جائے۔ طلبہ کا وکیل ہونے کی وجہ سے اس کے زکوٰۃ وصول کرتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور زکوٰۃ دہندگان کے وکیل ہونے کی حیثیت سے ان پر یہ پابندی ہوگی کہ اس رقم کو مصارف زکوٰۃ ہی میں صرف کریں۔ آج کل دینی درس گاہوں میں پر شکوہ تعمیرات اور دوسری زوائد و تحسنیات پر کثیر صرفہ کا جو رجحان پیدا ہو گیا ہے ان میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہ کی جائے کہ ان مدات میں تو خود زکوٰۃ دہندگان بھی اپنی رقم خرچ نہیں کر سکتے۔

علماء ہند میں بعضوں نے نظاماء کو طلبہ کا، بعضوں نے زکوٰۃ ادا کرنے والوں کا اور بعضوں نے دونوں کا وکیل تسلیم کیا ہے، اس عاجز کا خیال ہے کہ یہی تیسری رائے زیادہ صحیح، قرین صواب اور مبنی براحتیاط ہے، واللہ اعلم

فدیہ و صدقہ فطر کی مقدار

صدقۃ الفطر اگر گیہوں سے ادا کیا جائے تو امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی مقدار نصف صاع ہے، نصف صاع کو ہندو پاک کے علماء نے عام طور پر ۱۳۵ تولہ مانا ہے اور ایک تولہ ۶۶۳/۱۱ کے برابر ہے۔ اس طرح نصف صاع کا وزن ۶۶۳/۱۱ × ۵۰۰ = ۱۵۰۰ (ڈیڑھ کلو، چوتھرا گرام اور چھ سو چالیس ملی گرام) ہوتا ہے۔ اتنی مقدار گیہوں یا اس کی قیمت سے صدقہ ادا کرنا چاہئے۔ اگر گیہوں کے بجائے کسی اور غذا کے ذریعہ صدقۃ الفطر نکالنا چاہے تو اس کی دوہری مقدار میں نکالے۔ گو فقہاء نے لکھا ہے کہ کھجور، کشمش اور جو (جن کے ایک صاع بہ طور صدقۃ الفطر نکالنے کی صراحت ہے) کے علاوہ دوسری غذائی اشیاء کے ذریعہ صدقہ نکالنے کی صورت میں گیہوں کی قیمت معتبر ہوگی۔ نصف صاع گیہوں کی قیمت میں جتنا غلہ آجائے اتنا نکالے، یہ کافی ہے۔ لیکن حدیث کے الفاظ سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ گیہوں کے علاوہ کھانے کی جو بھی چیز ہو، اس میں صدقۃ الفطر ایک صاع نکالا جائے چنانچہ ارشاد ہے:

”ألا أن صدقة الفطر واجبة على كل مسلم، ذكر أو انثى حر أو عبد، صغير أو كبير مدان من قمح أو سواہ، صاع من طعام۔“^۱

^۱ ترمذی، باب ماجاء فی صدقة الفطر: ۶۰/۳، ط: بیروت

^۲ دیکھئے در مختار اور رد المحتار: ۷۶/۲

ترجمہ: ”آگاہ رہو کہ صدقۃ الفطر ہر مسلمان مرد و عورت، آزاد و غلام، چھوٹے بڑے پر واجب ہے۔ نصف صاع گیہوں اور اس کے ماسوا کھانے کی چیزوں میں ایک صاع۔“
اس لئے بہتر ہے کہ یا تو گیہوں یا روپیہ کی صورت میں صدقہ ادا کرے اور اگر کسی دوسری خوردنی چیز کے ذریعہ صدقہ نکالے تو بہ مقابلہ گیہوں کے دوہری مقدار میں۔ واللہ اعلم

زکوٰۃ و صدقات میں حیلہ تملیک

حیلہ کا مقصد اگر خواہ مخواہ بلا ضرورت شریعت کے ایک حکم کو بے معنی بنادینا اور اپنی خواہشات کی تکمیل اور نفع کی تحصیل ہو تو ظاہر ہے یہ ناجائز اور نادرست ہوگا اور عند اللہ اس کی باز پرس ہوگی۔ لیکن اگر کسی واقعی دینی مصلحت کے پیش نظر ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے تو اجازت ہے۔ مثلاً مدرسہ میں اساتذہ کی تنخواہ کے لئے کوئی دوسری رقم موجود نہ ہو یا مسجد کی ضروریات پر خرچ کرنا پڑے اور کوئی دوسرا ذریعہ نہ ہو جس سے ضرورت کی تکمیل ہو سکے تو ایسی صورت میں آخری درجہ مجبوری کے وقت یہ حیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کسی مستحق شخص کو دے دی جائے۔ پھر وہ شخص کچھ لے کر یا پوری رقم مدرسہ و مسجد کے انتظامی ذمہ داروں کو بطور عطیہ دے دے اور اس طرح یہ رقم مذکورہ مدات میں خرچ کی جائے۔
چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

”إذا أراد أن يكفن ميتا عن زکوٰۃ ماله لا يجوز (والحيلة فيه أن يتصدق بها على فقير من اهل الميت) ثم هو يكفن به الميت فيكون له ثواب الصدقة ولأهل الميت ثواب التكفين وكذلك في جميع أبواب البرالتی لا يقع بها التملیک كعمارة المسجد وبناء القناطر والرباطات۔“^۱

ترجمہ: ”اپنے مال کی زکوٰۃ میں سے کسی میت کی تکفین درست نہیں ہے اور اس کا جواز پیدا کرنے کے لئے حیلہ یہ ہے کہ میت کے اہل و عیال میں سے کسی محتاج پر صدقہ کر دیا جائے، وہ اس سے مردہ کو کفنا دے۔ لہذا اس شخص کو صدقہ کا اور میت کے اس فرد خاندان کو تکفین کا اجر حاصل ہوگا۔ یہی حکم کار خیر کے تمام ایسے مدات میں ہے جس میں تملیک نہیں ہو پاتی۔ مثلاً مسجدوں، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر۔“

سادات اور بنو ہاشم کو زکوٰۃ

سادات کو زکوٰۃ دینی درست نہیں ہے۔ سادات سے مراد بنو ہاشم یعنی حضرت علی، حضرت عباس، حضرت

^۱ لہ الفتاویٰ الہندیہ: ۶/۳۹۲ کتاب الحیل

جعفر، حضرت عقیل رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ اور حضرت حارث رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کی اولاد ہیں البتہ ان کو عطیہ اور صدقاتِ نافلہ دے سکتے ہیں۔ سادات کے لئے مالِ زکوٰۃ کی حرمت خود حدیث نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔ البتہ اسلامی حکومت میں اموالِ غنیمت اور معدنیات کے خمس (۱/۵) جو بیت المال میں جمع ہوا کرتے تھے ان میں سے بنو ہاشم کا خصوصی تعاون کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں یہ بات باقی نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف خاندانِ نبوت کو اس ہتک سے بچاتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ کا مال لیں۔ دوسری طرف عملاً اس بات کو گوارہ کرتے ہیں کہ وہ دریوزہ گری کریں۔ یا اپنی ناداری کی وجہ سے تعلیم سے بھی محروم رہیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ ایک ایسی راہِ اعتدال نکالی جائے کہ حدیث پر بھی عمل ہو جائے اور بنو ہاشم کی مدد کا موقع بھی نکل آئے۔ اس کی صورت وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ کسی غیر ہاشمی مستحق کو زکوٰۃ کی رقم دی جائے۔ وہ یا تو خود دینے والے کو ہبہ کر دے اور پھر یہ ”ہاشمی ضرورت مندوں“ کو یا خود وہ غیر ہاشمی دوسرے ہاشمی کو اس کا مالک بنادے۔

کیا ہندوستان کی زمینیں عشری ہیں؟

زمینیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ عشری اور خراجی۔ وہ زمینیں عشری کہلاتی ہیں جن پر مسلمان فوج نے قبضہ کیا ہو اور پھر مسلمانوں میں تقسیم کر دی ہوں یا اس جگہ کے تمام باشندے از خود مسلمان ہو گئے ہوں، جیسے کہ مدینہ منورہ یا جس غیر مزرعہ زمین کو مسلمانوں ہی نے پہلے پہل آباد کیا ہو۔ یہ سب زمینیں عشری ہوں گی اور ان میں عشر واجب ہوگا۔ اس کے برخلاف وہ زمینیں جن کو مسلمانوں نے بذریعہ جنگ فتح کیا ہو، وہاں کے مقامی باشندے ایمان نہ لائے ہوں اور ان ہی کے قبضہ میں یہ زمین رہنے دی گئی ہو تو اس میں خراج واجب ہوگا۔ اسی طرح وہ زمین بھی خراجی ہوگی جہاں کے غیر مسلم باشندوں نے از خود صلح کر لی ہو اور جزیہ دینا قبول کر لیا ہو اور وہ غیر آباد زمین بھی جو پہلے پہل غیر مسلموں نے مسلمان امیر کی اجازت سے آباد کی ہو خراجی ہو جائے گی۔ پھر احناف رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں جو زمین ایک دفعہ خراجی ہو گئی وہ ہمیشہ کے لئے خراجی رہے گی۔ یعنی آئندہ اگر کوئی مسلمان بھی اس زمین کو خرید لے تو خراج ہی ادا کرنا ہوگا۔ عشر واجب نہ ہوگا۔ اسی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عشری اور خراجی زمین جو وراثت میں منتقل ہو وہ عشری اور خراجی ہی برقرار رہے گی۔

اسی بناء پر عام علماء ہند کا فتویٰ ہے کہ ہندوستان میں جو زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں ہیں اور وراثتہ مسلمانوں ہی کے قبضے میں آرہی ہیں؛ ان میں عشر واجب ہوگا..... مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی

۱۔ الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۱۸۸ ۲۔ ملخص و استفاداز: فتاویٰ عالمگیری: ۲/۲۳۷ الباب السابع فی العشر و

الخراج و ردالمحتار کتاب السیر باب العشر و الخراج

رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی نے بہت تحقیق و جستجو کے بعد دس صورتیں ذکر کی ہیں اور وہ یہ ہیں:

- ۱ بادشاہوں کے وقت سے موروثی ہیں۔
- ۲ باشاہان اسلام کے وقت سے موقوفہ ہیں۔
- ۳ موروثی زمینیں ہیں مگر شاہی وقت سے نہیں۔ لیکن یہ بھی نہیں معلوم کہ کس طرح قبضہ میں آگئی ہیں۔
- ۴ جوزمین مسلمانوں نے خریدی ہیں یا بطریق ہبہ یا بذریعہ وصیت ان کو ملی ہیں اور جس نے فروخت کیا یا ہبہ کیا یا وصیت کی اس نے بھی کسی مسلمان ہی سے حاصل کی تھی، اسی طرح برابر سلسلہ جاری ہے۔
- ۵ جوزمین مسلمانوں کے قبضے میں مسلمانوں سے خرید و فروخت کے ذریعہ سے آئی ہیں اور اوپر جا کر یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ اسلام نے دی تھی۔
- ۶ مسلمانوں کے قبضے میں ورثہ یا خرید و فروخت کے ذریعہ سے ہے لیکن اوپر کا حال معلوم نہیں کہ پہلے لوگوں نے کس طرح حاصل کی تھی۔
- ۷ انگریزی حکومت نے بطور معافی اس زمین کو دیا جو پہلے سے مسلمانوں کی ملکیت تھی۔
- ۸ انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو بطریق معافی زمین دی مگر یہ نہیں معلوم کہ وہ زمین پہلے کس کی تھی۔
- ۹ مسلمانوں نے غیر مزرعہ زمین جو کسی کے قبضے میں نہ تھی آباد کی ہے اور وہ عشری زمین کے قریب ہے، یا آسمانی یا دریائی پانی یا اپنے کنویں سے سیراب ہوتی ہے۔
- ۱۰ مسلمانوں نے اپنے سکونت مکانات کو مزرعہ بنایا۔

لیز اور پٹے کی زمین پر عشر و خراج کا حکم

ہندوستان میں مسلمان جو زمین حکومت سے پٹہ اور لیز پر ایک مخصوص مدت کے لئے حاصل کریں۔ سوال یہ ہے کہ اس میں عشر واجب ہوگا یا نہیں؟ اس سوال کے جواب کو سمجھنے کے لئے دو اصولی باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

اول یہ کہ امام ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کے یہاں ایسی زمینوں میں پیداوار کا عشر یا خراج ان لوگوں پر واجب ہوگا جو زمین کرایہ پر حاصل کر کے کھیتی کریں، اصل زمین والے پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ دوسرے فقہاء کی رائے اس کے خلاف ہے دوسرے یہ کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کو مکمل طور پر ”حکومت کافرہ“ بھی نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ ارکان منظمہ کی وساطت سے خود عوام حکومت کرتے ہیں اور عوام میں کافروں کے ساتھ مسلمان بھی ہیں، بلکہ کہیں کہیں ان کی اکثریت بھی ہے اور اس کو ظاہر ہے مسلمانوں کی حکومت بھی نہیں کہہ سکتے۔

۱۷ کتاب العشر والزکوٰۃ: ص ۱۴۷، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: راقم الحروف کی تالیف ”اسلام کا نظام عشر و زکوٰۃ“ و مقالہ مجلہ فقہ اسلامی:

اگر اس حکومت کو اہل کفر کی حکومت کہا جاسکتا تو خراج واجب ہوتا، اس لئے کہ اہل کفر کی ملکیت میں خراج ہی واجب ہوگا اور اگر اہل اسلام کی حکومت ہوتی تو عشر واجب ہوتا اس لئے کہ مسلم حکومت کی طرف سے جو زمین مسلمانوں کو دی جائے، وہ عشری ہوتی ہے۔ لہذا اصولی طور پر اس زمین کو خراجی بھی کہنا مشکل ہے اور عشری بھی۔ لیکن مسلمانوں کے حق میں چوں کہ اصل ”عشر“ ہے، اس لئے ایسی زمینوں کو عشری ہی سمجھنا چاہئے اور عشر ادا کرنا چاہئے۔

کیا زراعتی اخراجات عشر سے مستثنیٰ ہوں گے؟

موجودہ دور میں کاشت کے اخراجات کافی بڑھ جاتے ہیں، اس پس منظر میں یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ کیا زمینی پیداوار کی زکوٰۃ یعنی عشر میں سے کاشت کے اخراجات منہا کئے جاسکتے ہیں اور اگر ایسا نہیں کیا جاسکتا تو کیا شریعت نے جس طرح آسمانی پانی سے سیراب ہونے والی زمین اور اخراجات برداشت کر کے کسی اور ذریعہ سے سیراب کی جانے والی زمین کی پیداوار میں شرح زکوٰۃ الگ الگ متعین فرمائی ہے، پہلی صورت میں دس فیصد اور دوسری صورت میں پانچ فیصد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، تو کیا اسی طرح کھاد وغیرہ میں زرخیز خرچ ہونے کی وجہ سے حاصل ہونے والی پیداوار میں پانچ فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب قرار دی جاسکتی ہے؟

شریعت کے اصول اور فقہاء کی آراء کو ملحوظ رکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی رعایت کی گنجائش نہیں..... رسول اللہ ﷺ نے قدرتی پانی سے سیرابی کے لئے ۱۰٪ فی صد اور دوسری صورت میں ۵٪ فی صد کی شرح مقرر کر دی ہے، اگر اخراجات کا استثناء مقصود ہوتا تو اس فرق کی ضرورت نہیں تھی، بہر صورت ۱۰٪ فی صد واجب ہوتا اور اخراجات کی منہائی کا حکم دے دیا جاتا، مگر دو ہی شرحوں کی تحدید اس بات کو بتلاتی ہے کہ عشر کے حکم میں شریعت نے بہ مقابلہ دوسرے اموال زکوٰۃ کے ایک گونہ تنگی رکھی ہے اور اخراجات کی منہائی ملحوظ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ کی اس صورت میں نہ مال پر سال گزرنے کی شرط ہے، نہ دیون و مطالبات سے فارغ ہونے کی اور نہ حاجات اصلیہ کا استثناء ہے۔

جہاں تک کھاد وغیرہ کے اخراجات کی بات ہے اس کو پانی کے مسئلہ پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، پانی سے زمین کی قوت کاشت نہیں بڑھتی ہے، کاشت تقریباً اتنی ہی ہوتی ہے، جتنی بارش کے پانی سے ہوتی ہے بخلاف کھاد وغیرہ کے کہ اس سے زمین کی پیداواری صلاحیت بھی بڑھ جاتی ہے، اس لئے یہ پیداواری اضافہ بذات خود زائد اخراجات کا بدل ہے۔

فقہاء کی تصریحات بھی اس جانب اشارہ کرتی ہیں، چنانچہ علامہ کاسانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”ولا يحتسب لصاحب الارض ما أنفق على الغلة من سقى أو عمارة أو أجر الحافظ أو أجر العمال أو نفقة البقرة.“^۱

ترجمہ: ”صاحب زمین کے لئے کاشت کے اخراجات، یعنی آبیاری، آباد کاری، محافظ اور کام کرنے والوں کی اجرت یا بیل کے اخراجات کا حساب نہیں کیا جائے گا، یعنی اخراجات کا استثناء نہیں ہوگا۔“

پس عام اصول کے مطابق کثیر اخراجات کے ذریعہ حاصل شدہ پیداوار میں بھی عشر واجب ہوگا اور اخراجات نہ منہا کئے جائیں گے اور نہ اس کی وجہ سے شرح زکوٰۃ میں کوئی تخفیف ہوگی۔

ایندھن کی لکڑی وغیرہ میں عشر

قدیم فقہاء جلاوطن کی لکڑی اور گھاس بانس وغیرہ میں عشر واجب قرار نہیں دیتے تھے، کیوں کہ اس زمانہ میں ان چیزوں کی باضابطہ کاشت نہیں کی جاتی تھی، موجودہ زمانہ میں ان چیزوں کی باضابطہ کاشت کی جاتی ہے، اسی لئے ان تمام لکڑیوں میں عشر واجب ہوگا چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

”اما الحطب والقصب الحشیش لا تنبت فی الجنان عادة، بل تنقى عنها حتى لو اتخذها مقصبة او مشجرة او منبتا للحشیش يجب فيها العشر.“^۲

ترجمہ: ”ایندھن کی لکڑی، بانس اور گھاس کی باغات میں کاشت نہیں کی جاتی، بلکہ ان سے صفائی کی جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص بانس کی کوٹھی بنائے، یا درختوں اور گھاس کی کاشت کرے تو اس میں عشر واجب ہوگا۔“

مکھانے اور سنگھارے میں زکوٰۃ

مکھانا اور سنگھارا بنیادی طور پر پودا ہے، گوان پودوں کی نشوونما کے لئے پانی کی کافی مقدار ضروری ہے، مگر اس کی جڑیں زمین ہی میں پیوست ہوتی ہیں، اس لئے حنفیہ کے مسلک پر اس میں بھی عشر واجب ہوگا، اس وقت اس کی کھیتی سے خاصی منفعت متعلق ہوگئی ہے، اس کا بھی تقاضا ہے کہ غرباء کو ان کے حق سے محروم نہ رکھا جائے۔

بٹائی کی صورت میں عشر کس پر واجب ہوگا؟

بٹائی کی صورت میں عشر کس پر واجب ہوگا؟ اس سلسلہ میں یہ اصول یاد رکھنا چاہئے کہ عشر واجب ہونے کا

^۱ ہدایہ: ۱۸۱/۱ باب زکوٰۃ الزروع و الثمار

^۲ بدائع الصنائع: ۶۲/۲

تعلق زمین کی ملکیت سے نہیں ہے بلکہ پیداوار کی ملکیت سے ہے، بقول علامہ کا سانی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی: ”ملك الارض ليس بشرط لو جوب العشر، وانما الشرط ملك الخارج.“^۱ تَرْجَمًا: ”زمین کا مالک ہونا عشر واجب ہونے کے لئے شرط نہیں، بلکہ پیداوار کا مالک ہونا شرط ہے۔“

لہذا مالک زمین اور بٹائی دار دونوں اپنے اپنے حصہ پیداوار میں عشر ادا کریں گے: ”ولو دفعها مزارعة فاما على مذهبهما فالمزارعة جائزة والعشر يجب في الخارج بينهما فيجب العشر عليهما.“^۲ تَرْجَمًا: ”اگر بٹائی پر زمین دی تو صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے مذہب پر بٹائی داری جائز ہے اور پیداوار میں عشر واجب ہے، پیداوار دونوں میں تقسیم ہوگی اور دونوں پر عشر واجب ہوگا۔“

ریشم میں زکوٰۃ

آج کل شہتوت کے ذریعہ ریشم کے کیڑوں کی پرورش کی جاتی ہے اور اس سے ریشم حاصل کیا جاتا ہے، اب گوریشم کی پیدائش زمین سے نہیں ہوتی، شہتوت سے ہوتی ہے مگر چوں کہ خود شہتوت حنفیہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں عشری اموال کی فہرست میں داخل ہے۔ اس کے ذریعہ جن کیڑوں کی پرورش ہو اور ان سے ریشم حاصل ہو، ان میں بھی عشر واجب ہوگا اس کی نظیر شہد ہے۔

حنفیہ کا مسلک ہے کہ:

”العشر واجب في العسل ان كان في ارض العشر.“^۳

تَرْجَمًا: ”شہد اگر عشری زمین میں ہو تو اس پر عشر واجب ہے۔“

شہد بھی زمین سے براہ راست پیدا نہیں ہوتا، بلکہ زمینی نباتات سے کیڑے غذا حاصل کرتے ہیں اور اسی سے شہد نکلتا ہے۔ ریشم کی نوعیت بھی بالکل یہی ہے کہ ریشم کے کیڑے زمینی پودوں سے غذا حاصل کرتے ہیں اور بالواسطہ طور پر ان کے ذریعہ ریشم تیار ہوتا ہے۔

ج

اہل ہند کے لئے میقات

مکہ معظمہ سے تھوڑے فاصلہ پر پانچ مقامات ہیں جہاں پہنچ کر زائرِ حرم کو احرام باندھنا ہوتا ہے۔ احرام باندھے بغیر ان مقامات سے آگے بڑھنا جائز نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ حکم ان تمام لوگوں کے لئے ہے جو کسی بھی مقصد کے تحت مکہ معظمہ کو جانا چاہتے ہوں..... ان مقامات کو ”میقات“ کہتے ہیں اور ان کے باہر جو لوگ ہوں ان کو ”آفاقی“ کہتے ہیں۔

ان میں ایک ذوالحلیفہ نامی جگہ ہے جو مدینہ اور اس طرف سے آنے والے لوگوں کا میقات ہے، آج کل یہ جگہ ”بئر علی“ سے موسوم ہے اور اس مقام پر نہایت عظیم الشان مسجد تعمیر کر دی گئی ہے، اہل شام کے لئے جھہ نامی گاؤں، نجد و یمن والوں کے لئے ”قرن المنازل“ نامی پہاڑ، اہل عراق کے لئے ”ذات عرق“ نامی گاؤں اور اہل تہامہ کے لئے ”کوہ یلملم“ میقات ہے۔ چوں کہ ہندو پاک اور انڈونیشیا کے حجاج بھی یلملم ہی کے سامنے سے گزرتے ہیں اس لئے ان کے لئے بھی یہی میقات ہے۔

یہاں یہ تو ظاہر ہے کہ جو لوگ خاص میقات سے نہ گزرتے ہوں ان کو اس جگہ سے احرام باندھنا چاہئے جو میقات کے مقابل میں پڑتا ہو یعنی حاجی جب وہاں پر پہنچے تو ٹھیک اس کے دائیں یا بائیں میقات پڑے۔ میقات سے آگے حدودِ حرم میں بلا احرام کے بڑھنا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر حدودِ حرم سے باہر ہی دوسری سمت میں بلا احرام کے سفر کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

ہندوستان کے موجودہ حجاج کے ساتھ صورتِ حال یہ ہے کہ سمندری سفر میں ان کا رخ یلملم کے بعد حرم کی بجائے جدہ کی طرف ہوتا ہے جو حدودِ حرم میں داخل نہیں ہے۔ لہذا اس فقہی اصول کا تقاضا یہ ٹھہرا کہ یلملم کے بعد بھی وہ بلا احرام گزر سکتے ہیں۔ آگے پھر جہاں وہ میقات کے مقابل اور برابر میں آجائیں وہاں سے احرام باندھ لیں۔ سمندر کے حدود سے گزر کر جب وہ جدہ پہنچیں گے تو پھر وہ یلملم کے مقابلہ میں آجائیں گے۔ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے اور مکہ سے جدہ اور یلملم کی مسافت قریب قریب یکساں قرار دی گئی ہے۔ لیکن اس مسئلہ پر علماء کا اتفاق نہیں، مثلاً شیخ عبداللہ بن باز رحمہ اللہ اور مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی اس سے

اختلاف ہے۔ وہ یلملم سے احرام باندھ کر گزرنے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہ کرے تو کہتے ہیں کہ دم واجب ہو گا..... اس لئے احتیاط کا تقاضا ہے کہ یلملم ہی سے احرام باندھا جائے جیسا کہ آج کل معمول بھی ہے۔

ہوائی جہاز سے حج کرنے والے کا احرام

حدودِ میقات کے باہر سے جو شخص بھی براہ راست مکہ مکرمہ کا سفر کرے، اس کے لئے میقات سے احرام باندھ کر آگے بڑھنا ضروری ہے، اب چوں کہ ہوائی جہاز ہی کا سفر ہوتا ہے اور غالباً جہاز ”قرن منازل“ اور ”یلملم“ دونوں مقامات سے گزرتا ہے، اور یہ دونوں ہی میقات ہیں، جہاز کس وقت میقات کے مقابل آیا، اس کا صحیح اندازہ دشوار ہے، لہذا ہندو پاک اور مشرق کے حجاج کو چاہئے کہ آغاز سفر میں ہی احرام باندھ لیں۔ البتہ جو حجاج پہلے مدینہ جانا چاہیں، وہ احرام نہ باندھیں، کیوں کہ میقات سے ان کا سفر حرم کی طرف نہ ہوگا اور احرام ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو میقات سے حرم کی طرف جارہے ہوں، اسی طرح اگر بمبئی وغیرہ سے حالتِ احرام میں رہنا دشوار ہو، تو ایسا کیا جاسکتا ہے کہ ابتداء سفر میں جدہ کا قصد کیا جائے اور جدہ پہنچ کر احرام باندھ لیا جائے فقہاء نے ایسے حیلہ کی اجازت دی ہے، جس سے ضرورت کے مواقع پر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے..... لیکن ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اجر و ثواب بھی کم ہوگا۔

جدہ سے احرام

مختلف ممالک سے جو لوگ حجاز مقدس جاتے ہیں، یا خود حج و عمرہ کی نیت سے حجاز کا سفر کرتے ہیں، ان کو بعض دفع کئی کئی گھنٹہ ائر پورٹ پر ٹھہرنا ہوتا ہے، بعض لوگ جن کے اعزہ جدہ وغیرہ میں مقیم ہوتے ہیں وہ تو ایک دو دن اپنے عزیزوں کے یہاں قیام کر کے پھر مکہ جانا چاہتے ہیں، حالتِ احرام میں اتنا طویل وقت گزارنا بالخصوص ٹھنڈک کے موسم میں بوڑھے اور کمزور لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

ایسی صورت میں بمبئی وغیرہ سے احرام باندھنے کے بجائے ایسا کیا جاسکتا ہے کہ یہاں سے جاتے ہوئے جدہ کی نیت کی جائے اور جدہ اتر کر احرام باندھ کر مکہ مکرمہ جایا جائے، چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے:

”الحيلة لمن أراد من الأفاقي دخوله بغير إحرام أن يقصد بستان بنی عامر أو غيره من الحل، فلا يجب الإحرام.“^۱

^۱ مولانا مفتی محمد شفیع: البیواقیت فی احکام المواقیت: ص ۲۴

^۲ عنایہ علی الہدایہ لبابرتی: ۲/۲۹۶

^۳ البحر الرائق: ۲/۳۱۸

آفاقی کے بلا احرام مکہ میں داخل ہونے کا حیلہ یہ ہے کہ ”بستان بنی عامر“ یا حل کے کسی اور مقام کا ارادہ کرے کہ اب احرام واجب نہ ہوگا۔

ہوائی جہاز سے محرم کے بغیر سفر

شریعت میں عورتوں کے لئے اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ تین دنوں کی مسافت کا سفر شوہر یا محرم رشتہ داروں کے بغیر کریں۔ چنانچہ حج ان پر واجب ہی اس وقت ہوتا ہے جب یہ سہولت بھی فراہم ہو۔ لیکن آج کل ہوائی سفر کی سہولت کی وجہ سے ایسی صورت حال پیش آتی ہے کہ مثلاً ایک شخص اپنی ماں کو بمبئی ہوائی جہاز پر چڑھائے اور جدہ میں ان خاتون کا دوسرا بیٹا استقبال کو موجود رہے۔ اس طرح ہوائی جہاز پر صرف چند گھنٹے ایسے گزرتے ہیں جن میں کوئی محرم ساتھ نہیں ہوتا۔ آیا یہ صورت جائز ہوگی؟

اس سلسلہ میں اصولی طور پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ فقہاء کے نزدیک سفر شرعی کے لئے تین دنوں کی مدت مطلوب نہیں ہے بلکہ اتنی مسافت مطلوب ہے جس کو انسان پیادہ رفتار میں تین دنوں میں طے کر سکے۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ہوائی جہاز کا یہ سفر گو کہ چند گھنٹوں کا ہے مگر وہ ہوگا سفر شرعی۔ یہی وجہ ہے کہ اس مختصر وقت میں بھی نمازوں میں قصر کیا جائے گا اور رمضان المبارک میں روزہ افطار کرنا جائز ہوگا۔ اس قلیل عرصہ میں بھی خواتین کے لئے شوہر یا محرم کے بغیر سفر درست نہیں۔ فقہاء نے مسافت ہی پر حکم کی بنیاد رکھی ہے:

”ومعتبر فی حق المرأة ان يكون لها محرم يحج بها أو زوج ولا يجوز لها أن

تحج بغیرهما اذا كان بينهما وبين مكة مسيرة ثلاثة ايام فصاعدا۔“^۱

ترجمہ: ”اور عورت کے حق میں یہ شرط بھی معتبر ہے کہ اس کے ساتھ کوئی محرم یا شوہر ہو جو شریک

حج ہو، ان دونوں کے بغیر اس کے لئے سفر حج درست نہیں۔ اگر اس کے اور مکہ کے درمیان تین دن یا

اس سے زیادہ کی مسافت ہو۔“

حاجیوں کی خرید و فروخت اور تجارت

آج کل جو حجاج حج کو جاتے ہیں وہ عموماً اشیاء کی خرید و فروخت بہت زیادہ کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا حج کے درمیان تجارت کی جاسکتی ہے؟ قرآن مجید کا اس بارے میں ارشاد ہے:

﴿ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلا من ربكم فإذا أفضم من عرفات

فاذكروا الله عند المشعر الحرام۔﴾^۲

تَرْجَمًا: ”تمہارے لئے اپنے رب کا رزق تلاش کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ پھر جب تم عرفات سے چلو تو مشعر حرام (مزدلفہ) میں اللہ کا ذکر کرو۔“

اس آیت کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جاہلیت میں لوگوں نے حج میں تجارت کو مستقل مقصود بنا لیا تھا۔ منیٰ میں بازار اور نمائش قائم ہوتی تھی اور مارکنگ کا سلسلہ چلتا تھا۔ اسلام نے جب حج میں آمیزش کی ہوئی جاہلانہ رسموں کو مٹایا تو صحابہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ نے سوچا کہ شاید یہ چیز بھی کلیتہً ممنوع ہوگی۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں لیس علیکم جناح سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ بہتر یہی ہے کہ اس سے بچا جائے۔ مگر اگر مقصد بنائے بغیر ضمنی طور پر یہ بھی کر لیا تو اجازت ہے۔

غرض اس کا مدار نیت پر ہے۔ تجارت اور خرید و فروخت کو مقصود بنا لینا، یا اس میں اس قدر مصروف ہو جانا کہ حرم شریف کی عبادتوں اور وہاں کی برکتوں سے فائدہ اٹھانے میں خلل پیدا ہو جائے مناسب نہیں، نہ یہ درست ہے کہ وہاں سے غیر قانونی طور پر سامان لائے جائیں یا کسٹم میں دھوکا دیا جائے۔ اس طرح حج اور حاجیوں کی حرمت متاثر ہوتی ہے اور بذات خود بھی یہ عمل درست نہیں۔ البتہ ان چیزوں کے بغیر کچھ خرید و فروخت کر لے تو کر سکتا ہے۔

حرام روپیہ سے حج

حرام روپیہ (جس میں بینک کا سود، انشورنس کا سود اور ان محکموں کی بعض خاص ملازمتوں کی تنخواہ سب ہی داخل ہیں) کا کسی عبادت میں خالصۃً استعمال درست نہیں۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ ایسی رقمیں بلا نیت صدقہ کسی ضرورت مند کو دے دینی چاہئیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس صرف ایسی رقمیں ہوں تو اس پر حج واجب نہ ہوگا کہ یہ مال حرام ہے اور مال حرام سے عبادت درست نہیں اور نہ آدمی شرعی نقطہ نظر سے اس مال کا مالک ہوتا ہے۔ البتہ اگر اس کے ساتھ کچھ مال حلال بھی ہو تو قاعدہ یہ ہے کہ مال حرام کو جب مال حلال کے ساتھ ملا دیا جائے اور وہ مخلوط ہو جائے تو اب وہ آدمی کی ملکیت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کا حکم عام مالوں کی طرح ہوتا ہے اور ان میں زکوٰۃ بھی واجب ہوتی ہے اور حج بھی۔ لہذا ایسی صورت میں اس پر حج بھی واجب ہوگا اور اس رقم سے حج کی ادائیگی بھی درست ہوگی۔

مسک حیض ادویہ

حج کے ایام میں تمام افعال حج کو معمول اور اپنے مقررہ اوقات پر انجام دینے کے لئے اگر خواتین ایسی ادویہ

استعمال کریں جو وقتی طور پر حیض کے خون کو روک دیں تو کوئی قباحت نہیں تاکہ افعال حج کو مقررہ وقت کے اندر ادا کر سکیں۔

مضافات حرم میں مقیم غیر ملکی آفاقی ہیں یا میقاتی؟

حج کے بعض احکام میں مکہ کا باشندہ اور بیرونی باشندوں کے درمیان فرق کیا گیا ہے، چنانچہ اہل مکہ اور ان لوگوں کے لئے جو حدود میقات کے اندر رہنے والے ہوں حج افراد کا حکم ہے، ان کے لئے تمتع اور قرآن مکروہ ہے، اسی طرح بیرونی حجاج کے لئے طواف وداع واجب ہے، اہل مکہ کے لئے واجب نہیں۔ پس سوال یہ ہے کہ جو لوگ مکہ اور اس کے اطراف میں طویل عرصہ سے قیام پذیر ہیں اور ان کا ارادہ وہیں رہنے کا ہے، ان کا شمار باشندگان حرم میں ہوگا یا نہیں؟ اور ان کے لئے حج تمتع جائز اور طواف وداع واجب سمجھا جائے گا یا نہیں؟ اس وقت جدہ اور طائف وغیرہ میں جو لوگ طویل مدت سے مقیم ہیں وہ اس مسئلہ سے دوچار ہیں۔

”وفی اللباب انه لا یسقط بنية الإقامة ولو سنین ویسقط بنية الاستيطان بمكة او بما حولها.“^۱

ترجمہ: ”لباب میں ہے کہ طواف وداع اقامت کی نیت سے ساقط نہیں ہوگا گوئی سال کی اقامت ہو۔ ہاں مکہ اور اس کے مضافات میں تو وطن کی نیت سے طواف وداع ساقط ہو جائے گا۔“

لیکن فی زمانہ قانونی طور پر کسی بھی ملک میں محض کسی آدمی کا ارادہ سکونت شہریت کے لئے کافی نہیں مانا جاتا ہے اور وہ کسی بھی وقت وہاں سے شہر بدر کیا جاسکتا ہے، اس لئے جب تک حکومت وقت کسی شخص کو شہریت نہ دے دے اس وقت تک وہ بیرونی باشندہ سمجھا جائے گا اور وہ اہل مکہ کے حکم میں نہ ہوگا، لہذا اس کے لئے حج تمتع اور حج قرآن درست ہوگا اور طواف وداع اس پر واجب ہوگا..... شہریت کے لئے قانون ملکی کی اجازت مشروط ہونے پر فقہاء کے اس جزئیہ سے استدلال کیا جاسکتا ہے جس میں فوجیوں کے لئے سپہ سالار لشکر کی نیت کے بغیر اقامت کی نیت کو غیر مؤثر سمجھا گیا ہے اور ان کو مسافر ہی کے حکم میں مانا گیا ہے..... واللہ اعلم

خوشبودار مشروبات اور خوردنی اشیاء کا حکم

آج کل بہت سی ایسی مشروبات ایجاد ہو چکی ہیں جو خوشبودار ہوتی ہیں، اسی طرح غذاؤں میں ایسی چیزیں بھی استعمال کی جاتی ہیں جن میں خوشبو ہوتی ہے جیسے زعفران، گلاب وغیرہ۔ ان چیزوں کے کھانے پینے کا کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلہ میں فقہاء کی درج ذیل تفصیلات کو سامنے رکھنا چاہئے۔

۱ جو چیزیں ہوں ہی خوشبو کے لئے، اگر ان کو اپنی اصل حالت میں بغیر پکائے اور خالص طور پر استعمال کیا جائے تو یہ ناجائز ہے اور اس کی وجہ سے کفارہ واجب ہوگا، چاہے اس کا استعمال دوا کے طور پر ہو یا غذا کے طور پر۔

”نوع هو طيب محض معدللتطيب كا لمسك والكافور، والعنبر وغير ذلك وتجب به الكفارة على أى وجه أستعمل حتى قالوا لوداوى عينه بطيب تجب عليه الكفارة.“^۱

ترجمہ: ”ایک قسم خالص خوشبو کی ہے جو خوشبو ہی کے لئے تیار کی گئی ہے۔ جیسے مشک، کافور، عنبر وغیرہ اس کو جس طرح بھی استعمال کیا جائے اس کی وجہ سے کفارہ واجب ہوگا، یہاں تک کہ فقہاء نے کہا ہے کہ آنکھ میں خوشبودار دوا ڈالے تو اس سے بھی کفارہ واجب ہو جائے گا۔“

۲ اگر خالص خوشبودار چیز کو بھی پکا لیا جائے تو اب وہ خوشبودار کے حکم میں نہیں رہتا اور محرم اسے کھاپی سکتا ہے، علامہ ابن الہمام رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”فإن جعله في طعام قد طبخ كالزعفران والفواكه من الزنجبيل والدار صيني يجعل في الطعام فلا شيء عليه فعن ابن عمر رضى الله تعالى عنه أنه كان يأكل السكباغ الا صفر وهو محرم.“^۲

ترجمہ: ”اگر کھانے میں خوشبودار کھ کر اس کو پکا دیا جائے جیسے زعفران اور زنجبیل (سونٹھ) و دارچینی کھانے میں رکھی جائے تو اس پر کچھ واجب نہ ہوگا حضرت عبداللہ ابن عمر رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے مروی ہے کہ وہ حالت احرام میں ایسا سالن جو سرکہ گوشت اور خوشبودار مصالحہ سے تیار کیا جاتا تھا، تناول فرماتے تھے۔“

۳ اگر ایسی خالص خوشبودار چیز کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط کر کے کھائی جائے تو غلبہ کا اعتبار ہوگا، اگر خوشبودار اجزاء مقدار میں غالب ہوں تو ان کا کھانا جائز نہیں، اور غیر خوشبودار اجزاء غالب ہوں لیکن خوشبو موجود ہو تو کراہت کے ساتھ کھانا جائز ہے اور خوشبو بھی ختم ہوگئی ہو تو بلا کراہت کھانا جائز ہے۔

”وإن لم يطبخ بل خلطه بما يوكل بلا طبخ كالملح وغيره فإن كانت رائحته موجودة كره ولا شيء عليه إذا كان مغلوباً فإنه كالمستهلك أما إذا كان غالباً فهو كالزعفران الخالص.“^۳

ترجمہ: ”اگر خوشبو پکائی نہ جائے بلکہ اس کو ایسی چیز کے ساتھ ملایا جائے جو بلا پکائے کھائی جاتی

ہے جیسے نمک وغیرہ تو اگر اس کی بوموجود ہو تو مکروہ ہے اور اس پر کچھ واجب نہیں، بشرطیکہ خوشبو مغلوب ہو گیا وہ اپنے وجود کو کھو چکا ہے اور اگر خوشبو غالب ہو تو وہ خالص زعفران کے حکم میں ہے۔“

۴ اگر مشروب میں خالص خوشبودار چیز ڈالی گئی تو وہ گو مقدار و اجزاء کے اعتبار سے مغلوب ہو پھر بھی بار بار پینے میں دم واجب ہو جاتا ہے:

”ولو خلطه بمشروب وهو غالب فعليه دم وان كان مغلوبا فصدقة الا ان يشرب مرارا فدم۔“^۱

ترجمہ: ”اگر خوشبو کو مشروب میں ملا دے اور خوشبو غالب ہو تو اس میں دم واجب ہے اور اگر مغلوب ہو تو صدقہ واجب ہے، سوائے اس کے کہ بار بار پئے کہ اس صورت میں دم واجب ہے۔“

۵ جو چیز اصل میں خوشبو کے لئے نہ ہو بلکہ غذا یا کسی اور مقصد کے لئے ہو مگر اس میں خوشبو بھی ہو اور کبھی اس کا استعمال خوشبو کے لئے ہوتا ہو کبھی غذا کے لئے جیسے تل وغیرہ، ایسی چیزوں کے استعمال میں طریق استعمال معتبر ہوگا، اگر جسم میں مالش کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس کا حکم خوشبودار چیز کا ہے اور غذا میں استعمال کیا گیا یا دوا کے طور پر استعمال ہو تو خوشبو کا حکم نہیں لگے گا، چنانچہ علامہ کا سانی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کہتے ہیں:

”ونوع ليس بطيب بنفسه لكنه أصل الطيب يستعمل على وجه الطيب ويستعمل على وجه الادام كالزيت والشيرج فيعتبر فيه الإستعمال فإن استعمل الادهان في البدن يعطى له حكم الطيب وإن استعمل فى مأكول أو شقاق رجل لا يعطى له حكم الطيب كالشحم۔“^۲

ترجمہ: ”ایک قسم ایسی خوشبو کی ہے جو خود خوشبو نہیں ہے لیکن خوشبو کی اصل ہے جو خوشبو کے طور پر بھی استعمال کی جاتی ہے اور سالن کے طور پر بھی، جیسے زیتون اور تل کا تیل، تو ایسی چیزوں میں استعمال معتبر ہوگا اگر جسم میں مالش کے طور پر استعمال کیا جائے تو خوشبو کے حکم میں ہے اور اگر کھائی جانے والی شئی میں یا پاؤں کے پھٹن میں استعمال ہو تو چربی کی طرح وہ خوشبو کے حکم میں نہیں ہوگا۔“

ان تفصیلات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ:

۱ آم، سنترہ، سیب وغیرہ چوں کہ اصل میں غذائی اشیاء ہیں اس لئے حالت احرام میں ان کا رس پینا جائز اور درست ہے۔

۲ اگر پکوان میں خوشبودار چیز کا استعمال کیا گیا ہو جیسے زعفران وغیرہ اور اسے پکا دیا جائے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں۔

۳ ایسی دوائیں جن میں خوشبودار اشیاء ملا دی گئی ہوں خوشبودار شئی کے حکم میں نہیں ہیں اور حالتِ احرام میں ان کا استعمال درست ہے۔

محرم کے لئے حجر اسود کے بوسہ کا مسئلہ

عام طور پر حجر اسود پر کثرت سے عطر لگا دیا جاتا ہے اور یہ ضروری بھی ہے کیوں کہ بوسہ لینے والوں کے تھوک کی وجہ سے خاصی بو پیدا ہو جاتی ہے اور حجر اسود کے بوسہ لینے یا استلام کرنے کی صورت ہاتھ اور لب پر خوشبو لگنی یقینی ہے، سوال یہ ہے کہ حالتِ احرام میں حجر اسود کے بوسہ لینے کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلہ میں شریعت کے عام اصول و قواعد اور فقہی صراحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ احرام میں ایسی صورت میں حجر اسود کے بوسہ سے اجتناب کرنا چاہئے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حالتِ احرام میں خوشبو کے استعمال سے منع فرمایا ہے فقہاء کا اصول ہے کہ اگر کسی مستحب پر عمل کرنے کی وجہ سے کسی ممنوع بات کا ارتکاب لازم آتا ہو تو ایسے مستحب کو ترک کر دیا جائے کہ درء المفسد اولیٰ من جلب المصلح۔ چنانچہ علامہ کا سانی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”وقالوا فيمن استلم الحجر فأصاب يده من طيبه أن عليه الكفارة لأنه استعمل الطيب وإن لم يتصد به التطيب ووجوب الكفارة لا يقف على القصد.“

ترجمہ: ”فقہاء نے کہا ہے کہ جو شخص حجر اسود کا استلام کرے اور اس کے ہاتھ میں خوشبو لگ جائے تو اس پر کفارہ واجب ہے، اس لئے کہ اس نے خوشبو استعمال کی ہے گویا غیر ارادی طور پر ہوا ہے لیکن کفارہ کا واجب ہونا قصد و ارادہ پر موقوف نہیں۔“

سلے ہوئے بیگ اور سلی ہوئی چادر وغیرہ کا استعمال

سونے کے لئے جو تکیہ استعمال کیا جاتا ہے اس کے غلاف سلے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح سلی ہوئی چادر اوڑھی جاتی ہے بیگ ساتھ ہوتا ہے وہ سلا ہوا ہوتا ہے، بیلٹ (Belt) سلا ہوا کمر میں باندھا جاتا ہے اور حالتِ احرام میں سلے ہوئے کپڑوں کے استعمال سے منع فرمایا گیا ہے، حجاج کو یہ شبہ پیش آتا ہے کہ ان کے لئے ان

اشیاء کا استعمال جائز ہوگا یا نہیں؟

فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں ہے، اصل میں ممانعت پہننے کی ہے، ایسی تمام صورتیں جن پر پہننے کا اطلاق نہ ہو بلکہ وہ باندھنا یا اوڑھنا کہلاتا ہو اور اس کو لباس نہ سمجھا جاتا ہو تو یہ جائز ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”ولو ارتدى بالقميص أو اتشح به أو تزر بالسراويل فلا بأس به لانه لم يبلسه لبس المخيط.“^۱

ترجمہ: ”اگر قمیص کو بہ طور چادر استعمال کیا یا اس کو لپیٹ لیا یا پانجامہ کا تہ بند بنا لیا تو کوئی مضائقہ نہیں۔“

مکہ اور حدود میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے میقات سے باہر جا کر واپسی میں احرام کا حکم

جو لوگ ہندوستان یا حدود میقات سے باہر ہوں اور ملازمت کے سلسلہ میں مکہ میں مقیم ہوں۔ اگر وہ میقات سے باہر کا سفر کریں تو ان پر مکہ آتے ہوئے امام اعظم ابو حنیفہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک احرام باندھ کر آنا ضروری ہوگا اور مکہ آکر عمرہ کرنا ہوگا۔ فقہاء نے خود اس شخص کیلئے بھی یہی حکم بیان کیا ہے جو مکہ کا متوطن ہو، چنانچہ علامہ ابن نجیم رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”المكي إذا خرج من الحرم لحاجة له أن يدخل مكة بغير احرام بشرط أن لا يكون جاوز الميقات كالأفاقي، فان جاوزه فليس له أن يدخل مكة من غير إحرام لأنه صار آفاقيا.“^۲

ترجمہ: ”مکی کسی حاجت کے تحت حرم سے نکلے تو وہ بلا احرام مکہ میں داخل ہو سکتا ہے بشرطیکہ میقات سے تجاوز نہ کرے جیسا کہ آفاقی کا حکم ہے، اگر حدود میقات سے آگے بڑھ جائے تو بلا احرام مکہ میں داخل نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اب وہ آفاقی ہو گیا۔“

البتہ فقہاء نے ایسے شخص کے لئے یہ حیلہ بتایا ہے کہ وہ میقات کے بجائے مکہ مکرمہ کے حدود میقات کے اندر کسی اور جگہ کا ارادہ کر لے اور وہاں پہنچ کر پھر وہاں سے مکہ آجائے ایسی صورت میں اس پر احرام باندھنا ضروری نہ ہوگا، چنانچہ علامہ بابر تقي رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

^۱ ہدایہ مع الفتوح: ۳/۳۰ ^۲ البحر الرائق: ۲/۲۱۹

”الحيلة لمن أراد من الافاقى دخوله بغير إحرام أن يقصد بستان بنى عامر أو غيره من الحل فلا يجب الاحرام“^۱

ترجمہ: ”جو آفاقی بلا احرام مکہ میں داخل ہونا چاہے اس کے لیے یہ حیلہ ہے کہ بستان بنی عامر یا حل کی کسی اور جگہ کا ارادہ کر لے تاکہ احرام واجب نہ ہو۔“

یہ تفصیل حنفیہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے مسلک پر ہے۔ مالکیہ رحمہما اللہ تعالیٰ، شوافع اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک احرام اسی شخص پر واجب ہوتا ہے جو عبادت کی نیت سے آئے، اگر حج یا عمرہ کا ارادہ نہ ہو تو احرام باندھنے کی ضرورت نہیں۔

”و إذا دخل العسكر أرض الحرب فنوا الإقامة بها قصروا وكذا إذا حاصروا فيها مدينة أو حصنان الداخل بين أن يهزم فيفروا و بين أن لا يهزم فيفروا، فلم تكن دار إقامة“^۲

ترجمہ: ”اور جب فوج سرزمین دار الحرب میں داخل ہو، اور وہاں اقامت کی نیت کرے، تو بھی پوری فوج قصر کرے گی، یہی حکم اس وقت ہے جب کہ کسی شہر یا قلعہ کا محاصرہ کرے، کیوں کہ اس کا احتمال موجود ہے کہ شکست کھا جائے اور راہ فرار اختیار کرنی پڑے، یا کامیابی حاصل ہو اور ٹھہر جائے، لہذا فوج مقیم نہیں ہو سکے گی، اس لئے قصر کرے گی۔“

لہذا:

۱ جو لوگ حدودِ میقات کے اندر ملازمت یا کسی اور غرض سے رکے ہوئے ہوں اور وہیں طویل قیام یا ہمیشہ کے لئے قیام پذیر ہو جانے کا ارادہ ہو، تب بھی وہ آفاقی ہی متصور ہوں گے۔

۲ ان حضرات پر طواف و داع واجب ہوگا، علامہ شامی نے صراحت لکھا ہے:

”وفى الباب أنه لا يسقط بنية الإقامة ولو سنین ويسقط بنية الاستيطان بمكة أو بما حولها قبل حل النفر“^۳

ترجمہ: ”طواف و داع اقامت کی نیت سے ساقط نہیں ہوگا گو کئی سال تک اقامت اختیار کئے رہے، ہاں اگر مکہ سے نکلنے سے پہلے پہلے مکہ یا اس کے گرد و پیش کو وطن بنانے کی نیت کر لے تو طواف و داع واجب ہوگا۔“

۳ وہ حج افراد بھی کر سکتا ہے اور حج تمتع و قرآن بھی۔

۴ اگر ایسا شخص حدود میقات سے باہر جائے اور پھر میقات پر واپس آئے اور مکہ جانے کا ارادہ ہو تو اس پر احرام باندھنا ضروری ہے، سوائے اس کے کہ وہ مکہ کے بجائے حدود میقات کے اندر کسی اور جگہ جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔

مکہ آنے کے بعد حج سے روک دیا جائے

بعض دفعہ ہندو پاک اور دوسرے ممالک کے لوگ ملازمت کے سلسلہ میں مکہ یا اس کے مضافات میں مقیم ہوتے ہیں لیکن حج کے ایام میں کام بڑھ جاتا ہے اور ان کو حج کے لئے کمپنی کی طرف سے چھٹی نہیں ملتی، ان حالات میں کیا یہ بات جائز ہوگی کہ وہ اس سال حج سے رک جائے اور آئندہ سال حج کر لیں؟ بہت سے ملازمت پیشہ لوگ ہیں جو مکہ میں ان حالات سے دوچار ہیں۔

اس سلسلہ میں چند باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت کے لئے ”من استطاع الیہ سبیلاً“ؓ کی شرط لگائی ہے، یہ نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں ہر طرح کی جانی، مالی اور قانونی استطاعت داخل ہے، ایک شخص جو ملازمت پر اس شرط کے ساتھ گیا ہے کہ وہ اتنی مدت تک چھٹی نہ لے گا اور زمانہ حج میں بھی کام کرے گا وہ مکہ میں قیام کرنے کے باوجود حج کی قانونی استطاعت سے محروم ہوگا، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ خود مکہ میں رہتے ہوئے بھی احصار کا تحقق ہو سکتا ہے۔

”ومن أحصر بمكة وهو ممنوع عن الطواف والوقوف فهو محصر لانه تعذر عليه الاتمام فصار كما إذا أحصر في الحل“ؓ

ترجمہ: ”جس شخص کو مکہ میں احصار پیش آ جائے اور وہ طواف اور وقوف عرفہ سے روک دیا گیا ہو وہ ”محصر“ ہے، اس لئے کہ اس کے لئے حج کی تکمیل دشوار ہے تو اس کی کیفیت اس شخص کی جیسی ہوگی جس کو حل میں احصار پیش آیا ہو۔“

اور علامہ ابن ہمام رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے لکھا ہے کہ مکہ میں احصار کی کیفیت ضروری نہیں ہے کہ دشمن ہی کی وجہ سے ہو، بیماری کی بھی صورت ہو سکتی ہے لہذا اس صورت میں ایسے ملازمین کو اول تو اپنی کمپنی سے پوری پوری کوشش کرنی چاہئے کہ حج کی اجازت مل جائے خواہ رخصت بلا تنخواہ کے ذریعہ ہو، لیکن ایسی صورت نہ بن پائے اور بظاہر حال آئندہ سال تک قیام کا قوی امکان اور غالب گمان ہو تو پہلے سال حج ترک کر دینا جائز اور درست ہے۔

مکہ کے چیک پوسٹ سے واپس کر دیئے جانے کا خطرہ ہو تو کیا کیا جائے؟

حکومت سعودیہ عربیہ نے سعودیہ میں مقیم بیرونی حضرات کے لئے یہ قانون بنایا ہے کہ ایک حج کے بعد پانچ سال تک دوسرا حج نہ کرے، گو بہت سے لوگ اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حج کرتے ہیں اور یہ اندیشہ بھی لگا رہتا ہے کہ حدودِ حرم کے پاس سے ان کو واپس کر دیا جائے بلکہ بعض دفعہ ایسے واقعات پیش بھی آتے ہیں، اس سلسلہ میں چند باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

۱۔ حکومت سعودیہ کا یہ قانون اپنی روح کے اعتبار سے درست اور جائز ہے، حج میں ہجوم و ازدحام بڑھتا جاتا ہے باہر سے لوگ تو آتے ہی ہیں، ایک بہت بڑی تعداد مقامی حجاج کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے نظم و نسق بے قابو ہو جاتا ہے اور حجاج کو بڑی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں، شریعت میں حدودِ میقات کے اندر رہنے والے حجاج کو تمتع و قرآن یعنی زمانہ حج میں عمرہ سے روکا گیا ہے، اس کی حکمت یہی ہے، اس لئے بنیادی طور پر یہ قانون شریعت کی روح کے مطابق ہے اور لوگوں کو اس کی پابندی کرنی چاہئے۔

۲۔ تاہم اس کے باوجود حج کے لئے نکل ہی جائیں تو چاہئے کہ غسل کر کے احرام کا کپڑا پہن لیں، تفتیش کی چوکی کا انتظار کریں، اگر وہاں سے جانے کی اجازت مل جائے تو پھر تلبیہ پڑھیں اور حج کی نیت کر لیں، اس طرح وہیں سے ان کا احرام شمار کیا جائے گا اور واپس کر دیا گیا تو دم واجب نہ ہوگا۔

۳۔ اگر اپنے مقام ہی سے حج کی نیت کر لی تو اب روک دیئے جانے کی صورت میں اس پر دم واجب ہوگا اور ضروری ہوگا کہ کسی حاجی کو پیسے دے دے اور وقت اور تاریخ متعین کر دے تاکہ مقررہ وقت و تاریخ پر اس کی طرف سے قربانی کر دی جائے اس کے بعد ہی وہ حلال ہو سکے گا، اور آئندہ سال اس کو اس حج کی قضا کرنی پڑے گی، نیز ضروری ہے کہ اس جانور کی قربانی حدودِ حرم کے اندر ہو۔

۴۔ یہ تفصیل حنفیہ رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی کے مسلک پر ہے، امام شافعی اور امام مالک رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک حج نفل میں احصار کی صورت پیش آ جائے تو قضاء واجب نہ ہوگی، چنانچہ رحمۃ الامۃ میں ہے:

”ولا قضاء علی من کان نسکھ تطوعاً عند مالک والشافعی وقال ابو حنیفہ بو

جوب القضاء بکل حال فرضاً کان او تطوعاً وعن احمد روايتان کالمذہبین۔“

ترجمہ: ”جس کا حج بہ طور نفل ہو امام مالک و شافعی رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک اس پر اس کی قضاء

واجب نہیں، امام ابو حنیفہ رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک قضاء ہر حال میں واجب ہوگی، فرض ہو یا

نفل۔ امام احمد رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی سے دونوں طرح کی رائیں منقول ہیں۔“
تاہم امام احمد رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک اگر کوئی شخص احرام باندھنے کے وقت یہ شرط لگا دے کہ جہاں کوئی رکاوٹ پیش آجائے وہیں احرام کھول لوں گا تو ایسی صورت میں اس کے لئے احرام کھول لینا جائز ہوگا اور دم بھی واجب نہ ہوگا۔

”یستحب لمن أحرَمَ بنفسك أن يشترط عندا حرامه فيقول إن حبسني حابس فمحلى حيث حبستني، ويفيد هذا الشرط شيئين أحدهما أنه إذا عاقه عائق من عدو أو مرض أو ذهاب نفقة ونحوه أن له التحلل والثاني، أنه متى حل بذلك فلا دم عليه ولا صوم.“^۱

تَرْجَمًا: ”حج کا احرام باندھنے والے کے لئے مستحب ہے کہ احرام کے وقت شرط لگالے اور کہے کہ اگر مجھے کوئی رکاوٹ پیش آجائے تو جہاں آپ نے روکا وہیں میرے حلال ہونے کی جگہ ہوگی، اس شرط سے دو فائدے ہوں گے، ایک یہ کہ اگر اس کو کوئی رکاوٹ پیش آجائے جیسے دشمن، بیماری یا نفقہ کا ختم ہو جانا وغیرہ تو اس کے لئے حلال ہو جانے کی گنجائش ہے، دوسرے یہ کہ اس صورت میں جب بھی وہ حلال ہوگا اس پر نہ دم واجب ہوگا نہ روزہ۔“

حنا بلہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے پیش نظر سیدنا عائشہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ضباعہ بنت زبیر رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا کے پاس تشریف لائے، حضرت ضباعہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا نے عرض کیا کہ حج کا ارادہ ہے اور بیمار ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا حج کرو اور شرط لگا دو کہ جہاں آپ روک لیں وہیں میرے احرام کھولنے کی جگہ ہے ”حجی واشترطی أن محلی حيث حبستني.“^۲

کیا اشہرج میں مکہ پہنچ جائے تو حج فرض ہو جائے گا؟

بعض اوقات لوگ شوال، ذوقعدہ میں مکہ مکرمہ آجاتے ہیں حج ان پر فرض ہوتا ہے، لیکن ان کا ویزا زمانہ حج تک کا نہیں ہوتا ہے اور قانونی اعتبار سے وہ حج تک نہیں رک سکتے، ایسی صورت میں اگر ان پر حج فرض باقی ہو تب تو ان کو پوری پوری کوشش کرنی چاہئے کہ کسی طرح وہ حج کر لیں، کیوں کہ مکہ پہنچنے کے بعد اخراجات سفر کی شرط ختم ہو جاتی ہے اور حج واجب ہو جاتا ہے۔

”ولیس من شرط الوجوب علی أهل مكة ومن حولهم الراحلة لأنه

لَا تَلْحَقُهُمْ مَشَقَّةٌ زَائِدَةٌ فِي الْإِدَاءِ فَأَشْبَهَ السَّعْيَ إِلَى الْجُمُعَةِ. ۱۷

ترجمہ: ”مکہ اور مکہ کے گرد و پیش والوں پر حج فرض ہونے کے لئے سواری شرط نہیں ہے، اس لئے کہ وہ حج کی ادائیگی میں کچھ زیادہ مشقت سے دوچار نہیں ہیں تو یہ جمعہ کے لئے سعی کے مشابہ ہو گیا۔“

لیکن اگر قانونی مجبوری کے تحت حج تک اس کا قیام ممکن نہ ہو تو پھر حج اس پر فرض نہیں ہوگا، اس لئے کہ ”استطاعت سبیل“ جس کو قرآن نے حج فرض ہونے کے لئے شرط قرار دیا ہے اس کے حق میں مفقود ہے۔ نیز بعض حضرات کی غلط فہمی کے پیش نظر عرض ہے کہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو لوگ حج فرض ادا کر چکے ہیں ان پر حج کے زمانہ میں عمرہ کرنے کی وجہ سے دوبارہ حج فرض نہیں ہو جاتا۔

طواف وداع کا تعلق حج سے ہے

جو حضرات مکہ یا جدہ میں ملازمت یا کسی اور کام سے مقیم ہوں، وہ اپنے وطن واپس جانا چاہیں تو ان پر طواف وداع واجب نہیں، طواف وداع کا تعلق اصل میں حج سے ہے اور یہ انہیں لوگوں پر واجب ہے جو حج کی غرض سے مکہ مکرمہ آئے ہوں اسی لئے طواف وداع کو واجبات حج میں شمار کیا گیا ہے، چنانچہ علامہ کاسانی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کہتے ہیں:

”وأما واجبات الحج فخمسة السعي بين الصفا والمروة، والوقوف بمزدلفة ورمي الجمار والحلق أو التقصير وطواف الصدر.“ ۱۸

ترجمہ: ”واجبات حج پانچ ہیں، صفا و مروه کے درمیان سعی، مزدلفہ میں وقوف رمی جمار، بال مونڈ و انایا ترشوانا اور طواف صدر۔“

مضافات مکہ کے لوگ براہ راست منیٰ آ جائیں تو طواف قدوم

وطواف وداع کا حکم

جدہ اور حرم شریف کے اطراف سے جو لوگ حج کے لئے جاتے ہیں وہ عام طور پر سات ذی الحجہ کی شب میں بجائے مکہ کے سیدھے منیٰ چلے جاتے ہیں اور بارہ تاریخ کو حجاج کی واپسی کے موقع پر بھی جدہ سے جانے والی موٹر بس مکہ جانے کے بجائے منیٰ سے براہ راست جدہ آ جاتی ہیں، اس طرح نہ طواف قدوم ہو پاتا ہے اور نہ

طواف وداع۔

جہاں تک طواف قدوم کی بات ہے تو ایک تو وہ سنت ہے اور دوسرے انہیں لوگوں کے لئے ہے جو مکہ میں داخل ہوں جو مکہ میں داخل ہی نہ ہوں ان کے لئے طواف قدوم نہیں ہے، ہدایہ میں ہے:

”فان لم يدخل المحرم مكة وتوجه الى عرفات ووقف به اسقط عنها طواف القدوم ولا شيء عليه بتركه لانه سنة.“^۱

ترجمہ: ”اگر محرم مکہ میں داخل نہ ہو، سیدھے عرفات جائے اور وہاں وقوف کر لے تو اس سے طواف قدوم ساقط ہو جائے گا اور اس کے ترک کرنے کی وجہ سے کچھ واجب بھی نہ ہوگا، کیوں کہ یہ محض سنت ہے۔“

جہاں تک طواف وداع کی بات ہے تو ان لوگوں پر جو حدود میقات کے اندر سکونت پذیر ہوں اور سعودی شہریت کے حامل ہوں واجب نہیں، لیکن جو لوگ حدود میقات سے باہر کے ہوں اور کسی ضرورت سے میقات کے اندر مقیم ہوں، ان پر طواف وداع واجب ہے، اس لئے کہ جب تک میقات کے اندر توطن نہ ہو جائے، چاہے وہ کتنے دن ہی میقات میں رہے آفاقی ہی کے حکم میں ہے، چنانچہ علامہ شامی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی طواف وداع کے بارے میں لکھتے ہیں:

”وفى اللباب أنه لا يسقط بنية الإقامة ولو سنين.“^۲

ترجمہ: ”لباب“ میں ہے کہ طواف وداع عارضی اقامت کی وجہ سے ساقط نہیں ہوگا، گو اس طرح کئی سال کیوں نہ گزر جائیں۔“

ہاں یہ صورت اس کے لئے درست ہے کہ ”بارہ“ تاریخ کی شام سے پہلے ہی طواف زیارت کے بعد طواف وداع کر لے، اس لئے کہ طواف وداع کا کوئی وقت متعین نہیں ہے۔ طواف زیارت کے بعد کبھی بھی کر سکتا ہے، ”شرط صحته أن يكون بعد طواف الزيارة“ اس طرح اس نے بارہ کی صبح تک طواف کر لیا ہے تو بارہ کو رمی جمار کے بعد براہ راست اپنے مکان آ سکتا ہے۔

طواف وداع کے بغیر ہی جائے رہائش کو لوٹ آیا تو اگر یہ میقات کے اندر ہے تو اس کے لئے احرام کی بھی ضرورت نہیں ہے، اگر حدود میقات کو عبور کر چکا ہو تو دو صورتیں ہیں یا نودم دے، یا نیا احرام باندھ کر مکہ آئے اور طواف کر کے واپس ہو۔^۳

^۱ ہدایہ مع الفتح: ۵۰۸/۲ ^۲ رد المحتار: ۱۸۶/۲ ^۳ الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۱۴۲/۲ ^۴ فتح القدیر: ۵۰۴/۲

قربانی کا ٹکٹ خرید کر وکالتِ قربانی کا نظم

آج کل قربانی کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے ایسا نظم کیا گیا ہے کہ لوگ ٹکٹ خرید لیتے ہیں اور ان کی طرف سے قربانی کر دی جاتی ہے یہ قربانی دس سے تیرہ ذی الحجہ تک ہوتی رہتی ہے، کیوں کہ اکثر فقہاء کے یہاں تیرہ ذی الحجہ تک قربانی کی گنجائش ہے اور ان کے نزدیک رمی، قربانی اور بال مونڈانے کے درمیان ترتیب واجب نہیں ہے، محض مستحب ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ میں نے قربانی سے پہلے بال مونڈا لیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا ”اذبح ولا حرج“۔^۱

اس لئے ان حضرات کے نزدیک رمی کے بعد بال مونڈا یا جاسکتا ہے، چاہے قربانی بعد میں ہو۔ حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک تو ترتیب واجب ہے، اگر بال پہلے مونڈا لیا قربانی بعد میں کی تو دم واجب ہوتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک ”لاحرج“ سے مراد یہ ہے کہ ناواقفیت کی وجہ سے خلاف ترتیب عمل کر لیا جائے گا تو گناہ نہ ہوگا، گودم واجب ہوگا۔ دوسرے قربانی بارہ ذی الحجہ تک ہو جانی چاہئے۔

لیکن اس سے بڑھ کر ایک دوسری دقت یہ ہے کہ تحقیق پر معلوم ہوا کہ قربانی کی مذکورہ صورت میں قربانی کے وقت ان لوگوں کا نام نہیں لیا جاتا ہے جن کی طرف سے قربانی کی جاتی ہے، اس طرح جانور نامزد نہیں ہوتا ہے کہ کس جانور کی قربانی کس کی جانب سے کی جا رہی ہے؟ اور کیف ماتفق اگر پانچ ہزار آدمیوں نے ٹکٹ لیا ہے تو پانچ ہزار جانور ذبح کر دیئے جاتے ہیں، یہ صورت کسی کے یہاں بھی جائز نہیں، اگر قربانی کرنے والے ادارے یہ اہتمام کر لیں کہ جیسے جانور ذبح کرنے کے لئے آدمی رکھے جاتے ہیں، کچھ لوگ اسی لئے رکھے جائیں کہ ان کے پاس قربانی کرنے والوں کے ناموں کی فہرست ہو اور وہ نام پڑھتے جائیں اور ان کی طرف سے نیت کرتے ہوئے جانور ذبح کرتے چلے جائیں تو یہ مسئلہ بآسانی حل ہو سکتا ہے، ورنہ بحالت موجودہ اس کی صحت اور درستگی کافی مشکوک ہے۔

تاہم ادارہ کی طرف سے یہ انتظام ہے کہ اگر قربانی کرنے والے کم سے کم دس آدمیوں کا ایک گروپ بنالیں تو ان کی طرف سے ایک وکیل مسلخ پہنچ کر خود قربانی کر سکتا ہے۔ حجاج کرام کو چاہئے کہ وہ اس سہولت سے فائدہ اٹھائیں اور جب تک قربانی کے نظام میں مذکورہ تبدیلی عمل میں نہ آجائے، خود جانور خرید کر قربانی کیا کریں۔ واللہ اعلم۔

۱۔ بخاری عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۲۳۲/۱

حج کی گاڑی ۱۲ ذوالحجہ کو غروب آفتاب تک منیٰ سے نہ نکل پائے

عام طور پر قریبی علاقہ کے حجاج بارہ تاریخ کو منیٰ سے نکل جاتے ہیں، لیکن بارہ کو ٹریفک کا اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ گاڑی نکلتے نکلتے منیٰ ہی میں غروب آفتاب ہو جاتا ہے، چنانچہ لوگ اسی حالت میں منیٰ سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسی صورت میں تیرہویں تاریخ کا قیام اور رمی واجب ہو جاتا ہے..... امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک غروب آفتاب کے بعد نکل سکتے ہیں، البتہ غروب آفتاب کے بعد نکلنا مکروہ ہے، ہاں اگر تیرہ کی صبح منیٰ میں طلوع ہو گئی تو اب تیرہ تاریخ کی رمی بھی واجب ہو جائے گی اور رمی کئے بغیر نکل جائے تو دم واجب ہوگا:

”قوله وله النفر قبل طلوع فجر الرابع) ولكن ينفر قبل غروب الشمس اى شمس الثالث فان لم ينفر حتى غربت الشمس يكره له ان ينفر حتى يرمى فى الرابع، ولو نفر من الليل قبل فجر الرابع لا شىء عليه وقد أساء وقيل ليس له أن ينفر بعد الغروب فان نفر لزمه دم ولو نفر بعد طلوع الفجر قبل الرمي لزمه الدم اتفاقا ”لباب“ ولا فرق فى ذلك بين المكي والا فاقى كما فى البحر“۔^۱

ترجمہ: ”لیکن تیسرے دن (یعنی ۱۲ ذوالحجہ) کے غروب آفتاب سے پہلے ہی اسے نکل جانا چاہئے، اگر آفتاب غروب ہو گیا تو چوتھے دن (یعنی ۱۳ ذوالحجہ) کی رمی سے پہلے نکلنا مکروہ ہے، اگر چوتھے دن کی صبح سے پہلے پہلے شب میں منیٰ سے نکلا تو اس پر کچھ واجب تو نہ ہوا مگر اس نے بہتر نہیں کیا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ غروب آفتاب کے بعد نکلنا درست نہیں اور نکل گیا تو دم واجب ہوگا، اگر چوتھے دن طلوع صبح کے بعد اور رمی سے پہلے منیٰ سے نکل گیا تو بالاتفاق دم واجب ہوگا، اس مسئلہ میں مکی اور آفاقی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔“

جگہ کی تنگی کے باعث وادی محسر میں قیام

آج کل حجاج کثرت کی وجہ سے منیٰ کا میدان اپنی وسعت کے باوجود نا کافی ہو جاتا ہے اور بہت سے خیمے وادی محسر میں نصب کر دیئے جاتے ہیں، حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وادی میں ٹھہرنے کو پسند نہیں فرمایا، معمول مبارک تھا کہ چلتے ہوئے یہاں سے تیز تیز گزر جاتے۔^۲

۱۔ رحمة الامة: ۱۴۵ ۲۔ رد المحتار: ۱۸۵/۲ نعمانیہ ۳۔ ترمذی: ۱۷۷/۱ باب ماجاء ان العرفة كلها موقف

اس لئے وادی محسر میں قیام کرنا مناسب نہیں، ایسا کیا جاسکتا ہے کہ مزدلفہ میں قیام کر لیں اور چوں کہ منیٰ میں شب گزارنا مسنون ہے اس لئے رات کے وقت منیٰ آ جایا کریں۔

رمی میں نیابت کا شرعی حکم

حج میں سب سے مشکل مرحلہ ”رمی جمار“ کا ہوتا ہے، ہجوم اور ازدحام کی وجہ سے قریب قریب ہر سال اچھے خاصے لوگ کچلے بھی جاتے ہیں اور بعض دفعہ بے پردگی کی سی کیفیت ہو جاتی ہے، ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ رمی کے اوقات کی بابت تفصیلات اچھی طرح سمجھ لی جائیں اور وہ یہ ہیں:

① دس ذی الحجہ

وقت مستحب: طلوع آفتاب تا زوال آفتاب

بلا کراہت جائز: زوال آفتاب تا غروب آفتاب

کراہت تنزیہی کے ساتھ جائز: طلوع فجر تا طلوع آفتاب

غروب آفتاب تا طلوع صبح ۱۱/ ذی الحجہ

مگر یہ کراہت تنزیہی بھی اس وقت ہے جب کہ عذر کی وجہ سے رمی میں تاخیر نہ کی گئی ہو..... موجودہ حالات میں ہجوم کی کثرت اور جان کا خوف بجائے خود رمی میں تاخیر کے لئے ایک معقول عذر کا درجہ رکھتا ہے۔

② گیارہ اور بارہ ذی الحجہ

وقت مسنون: زوال آفتاب تا غروب آفتاب

وقت جواز: غروب آفتاب تا طلوع صبح

امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے ایک قول کے مطابق گیارہ اور ۱۲ ذی الحجہ کو زوال آفتاب سے پہلے بھی رمی کرنی جائز ہے۔

امام شافعی اور امام احمد رَحِمَہُمَا اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک رمی میں عذر کی بناء پر دوسروں کو نائب بھی بنایا جاسکتا ہے چنانچہ ابن اقدامہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”إذا كان الرجل مريضاً أو محبوساً أو له عذر جاز أن يستنيب من يرمى عنه.“

ترجمہ: ”جو شخص بیمار ہو یا قید میں ہو یا معذور ہو تو کسی اور کو رمی کے لئے نائب بنا سکتا ہے۔“

پس ان تفصیلات کی روشنی میں خواتین، بوڑھے اور کمزور لوگوں کو وقت کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

رات کے وقت رمی کر ادینی چاہئے، اور اگر کوئی حج کرنے والا اتنا معذور اور کمزور ہو کہ رات کے وقت بھی رمی کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہو تو پھر فقہاء کے اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جمہور کی رائے پر عمل کیا جاسکتا ہے اور رمی کے لئے کسی اور شخص کو اپنا نائب بنایا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ رمی میں نیابت جمہور فقہاء رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک تو جائز ہی ہے، بعض فقہاء احناف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں صراحت ملتی ہے کہ عجز و مجبوری کے وقت نیابت رمی کی گنجائش خود احناف کے یہاں بھی ہے، چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”سواء رمی بنفسه أو بغيره عند عجزه عن الرمي بنفسه كالمريض الذي لا يستطيع الرمي فوضع الحصى في كفه، فرمى بها أو رمى عنه غيره، لان افعال الحج تجري فيها النيابة كالطواف والوقوف بعرفة والمزدلفة، واللّٰه اعلم.“^۱
 ترجمہ: ”چاہے خود رمی کرے یا خود رمی سے عاجز ہو تو دوسرے سے رمی کرائے، جیسے ایسا مریض جو رمی کی قوت نہ رکھتا ہو تو اس کی ہتھیلی میں کنکری رکھی جائے گی اور اس کو رمی کرائی جائے گی یا اس کی طرف سے کوئی اور رمی کر لے، اس لئے کہ حج کے افعال میں نیابت جاری ہوتی ہے، جیسے طواف، وقوف عرفہ اور وقوف مزدلفہ۔ واللّٰه اعلم“

آج کل حرم شریف کے مضافات میں رہنے والے بعض لوگ حج کے معاملہ میں بڑی تن آسانی سے کام لیتے ہیں، دس تاریخ کو آجاتے ہیں اسی دن رمی کر کے چلے جاتے ہیں اور گیارہ بارہ کی کنکری کسی اور کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ وہ ان کی طرف سے رمی کر دے، یہ صورت بالکل درست نہیں اور ایسی صورت میں نیابت کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ ان لوگوں پر دم واجب ہوگا۔

”ومن ترك الرمي بغير عذر فعليه دم.“^۲

احرام کی حالت میں تولیہ سے منہ پوچھنے اور خیموں کے کپڑے لگنے کا حکم

احرام کی حالت میں خیموں میں جاتے اور آتے ہوئے چہروں سے کپڑے لگ جاتے ہیں، بعض لوگ چہرہ پوچھتے ہیں یا کپڑا تر کر کے چہرہ پر پھیرتے ہیں، ان تمام باتوں سے بچنا چاہئے، حالت احرام میں چہرہ اور سر سے کپڑا لگنا مکروہ ہے، البتہ اس کی وجہ سے دم یا صدقہ واجب نہیں ہے، علامہ ابن نجیم مصری رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”لو دخل المحرم ستر الكعبة فإن كان يصيب وجهه ورأسه فهو مكروه لا شيء عليه.“^۱

ترجمہ: ”محرم غلاف کعبہ میں داخل ہو تو اگر اس کے چہرہ و سر کو لگے تو مکروہ ہے، مگر اس کی وجہ سے کچھ واجب نہیں۔“

نیز علامہ کا سانی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”فان دخل تحت ستر الكعبة حتى غطاه فان كان الستري يصيب وجهه ورأسه يكره له ذلك لانه يشبه ستروجهه ورأسه بثوب، وان كان متجافيا فلا يكره لانه بمنزلة الدخول تحت ظلة.“^۲

ترجمہ: ”اگر غلاف کعبہ کے اندر داخل ہو یہاں تک کہ غلاف اس کو ڈھانپ لے تو اگر غلاف اس کے چہرے و سر کو لگ رہا ہو تو اس کے لئے مکروہ ہے، اس لئے کہ یہ چہرہ و سر کو کپڑے سے ڈھانکنے کے مماثل ہے اور اگر کپڑا چہرہ سے الگ ہو تو مکروہ نہیں اس لئے کہ وہ سایہ میں داخل ہونے کے درجہ میں ہے۔“

خواتین کے لئے چہرے کا پردہ

عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ حالت احرام میں چہرہ پر کپڑے نہ ڈالیں۔ دوسری طرف اس زمانہ فتنہ میں پردہ بھی ضروری ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سر سے کوئی ایسی چیز باندھ لیں، جو کسی قدر آگے کو نکلی ہوئی ہو اور اس پر کپڑا ڈال لیں۔ اس سے پردہ بھی ہو جائے گا اور کپڑا بھی چہرہ سے نہیں لگے گا۔ چنانچہ علامہ کا سانی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”وكذا لا بأس أن تسدل على وجهها بثوب تجافيه عن وجهها.“^۳

ترجمہ: ”اس میں کوئی حرج نہیں کہ عورتیں چہرے پر پردہ ڈال لیں اور اسے چہرہ سے الگ رکھیں۔“

حج بدل میں تمتع

فقہاء رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے کہا ہے کہ حج بدل میں حج افراد یا حج قرآن ہی کیا جاسکتا ہے، حج تمتع نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مگر فقہاء کی بعض عبارتوں سے ”حج تمتع“ کا بھی جائز ہونا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ”درمختار“ میں حج بدل کی

^۱ البحر الرائق: ۸/۳ ^۲ بدائع: ۱۸۶/۲ فصل فی بیان ما يحظره الاحرام وما لا يحظره ^۳ بدائع الصنائع: ۱۸۵/۲

صورت تمتع کی قربانی کے اخراجات اس شخص کے ذمہ رکھے گئے ہیں جس کی طرف سے حج کیا جا رہا ہو۔
 ”دم القران والتمتع والجنایة علی الحاج إن أذن له الأمر بالقران والتمتع“
 ترجمہ: ”قران و تمتع اور جنایت کی قربانی، کرنے والے ہی پر ہوگی، گوج کا حکم دینے والے نے
 (جس کی طرف سے حج بدل ادا کر رہا ہے) اس کی اجازت دی ہو۔“
 اور ماضی قریب کے علماء میں مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے بھی بعض شرائط کے ساتھ اجازت
 دی ہے۔

لیکن اس زمانہ میں حج و عمرہ کرنے میں عام آدمی آزاد نہیں کہ جب اور جس وقت چاہیں جا سکیں اور طویل
 احرام سے بچنے کے لئے ایام حج سے بالکل قریب سفر کر سکیں۔ ہر طرف حکومتوں کی پابندیاں شدید ہیں۔ اس
 لئے اگر کسی حج بدل کرنے والے کو وقت سے زیادہ پہلے جانے کی مجبوری ہو اور احرام طویل میں واجبات احرام کی
 پابندی مشکل نظر آئے تو اس کے لئے تمتع کر لینے کے گنجائش ہے۔
 اس لئے موجودہ حالات میں اگر افراد و قرآن کی وجہ سے اتنے دنوں حالت احرام میں رہنا پڑے کہ حاجی
 کے لئے اس کو برداشت کرنا دشوار ہو تو حج بدل میں بھی تمتع کی گنجائش ہے۔

ذبح و قربانی

موجودہ دور کے اہل کتاب کا ذبیحہ

اسلام نے ذبیحہ اور نکاح کے اعتبار سے کافروں کے دو گروہ کئے ہیں: اہل کتاب، عام کفار و مشرکین۔
 عام کفار و مشرکین کا ذبیحہ حرام اور ان سے رشتہ نکاح جائز نہیں، اہل کتاب خواتین سے نکاح جائز اور ان
 کے مرد و خواتین کا ذبیحہ حلال ہے، حنفیہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں اہل کتاب کا کوئی بھی طبقہ ہو، مسلم ملک میں
 رہتا ہو یا غیر مسلم ملک میں، عرب ہو یا غیر عرب، قابو شدہ جانور ذبح کرے یا بے قابو جانور کا شکار ہو، ہر صورت
 کتابی کا ذبیحہ حلال ہے..... لیکن اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ واقعہ اہل کتاب میں ہو، اہل کتاب سے
 مراد وہ لوگ ہیں جو کم از کم نزول قرآن کے زمانہ میں یہود و نصاریٰ جو عقائد رکھتے تھے، ان کے قائل ہوں،

لہ الدر علی هامش الرد: ۲/۲۴۷ جواہر الفقہ: ۱/۵۱۶ ۵۱۶ ہدایہ مع الفتوح: ۹/۴۸۸، مختصر الطحاوی: ۲۹۶

تورات پر ایمان رکھتے ہوں، خدا کے وجود، نبوت، وحی، فرشتوں پر ایمان رکھتے ہوں، خدا کے منکر نہ ہوں، جو لوگ ان امور کے قائل نہ ہوں، خدا کا، نبوت کا، وحی کا مذاق اڑاتے ہوں اور صرف نسلِ عیسائی یا یہودی ہوں، یا انہوں نے مذہب کے خانہ میں اپنا نام یہودی یا عیسائی لکھایا ہو، تو وہ اہل کتاب میں نہیں، اسی لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان عرب نصاریٰ کے بارے میں جو برائے نام عیسائی تھے، فرمایا کہ ان کا ذبیحہ حلال نہیں کہ سوائے شراب نوشی کے ان کے پاس عیسائیت کا کوئی عمل نہیں..... اور اس پر قریب قریب اتفاق ہے..... لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کا بسم اللہ کہنا بھی ضروری ہے؟ اس میں اختلاف ہے، حنفیہ و حنابلہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر قصداً بسم اللہ چھوڑ دیا تو مسلمان کی طرح اہل کتاب کا ذبیحہ بھی حرام ہے..... مالکیہ اور شوافع رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر وہ ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام نہ لیں تو گو بسم اللہ بھی نہ کہیں پھر بھی ان کا ذبیحہ حلال ہوگا۔

لہذا موجودہ دور کے جن یہودیوں یا عیسائیوں کی بابت معلوم ہو کہ وہ ملرود ہریہ اور مذہب کے منکر نہیں ہیں اور خدا و نبوت کے قائل ہیں، ان کا ذبیحہ حنفیہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسی شرط کے ساتھ حلال ہے کہ اس نے ”بسم اللہ“ کہنا قصداً نہ چھوڑا ہو، اور شوافع و مالکیہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک بسم اللہ نہ کہا ہو، تب بھی ذبیحہ حلال ہے۔ تاہم آج کل جہاں مسلمانوں کو مسلمانوں کا ذبیحہ بہ آسانی دستیاب ہو اور اہل کتاب کے ذبیحہ کی بابت کوئی مناسب تصدیق و توثیق موجود نہ ہو، بہتر ہے کہ مسلمان اہل کتاب کے ذبیحہ سے اجتناب کریں۔

ذبح سے پہلے الیکٹرک شاک

آج کل مسالخ میں مشینی طریقہ پر ذبح کا جو طریقہ مقرر ہے، اس میں ذبح سے پہلے الیکٹرک شاک یا کوئی اور ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جس سے جانور نیم بے ہوش ہو جاتا ہے، اس سے دو مسئلے متعلق ہیں: اول یہ کہ اس حالت میں جانور ذبح کر دیا جائے تو حلال ہوگا یا نہیں؟ دوسرے خود یہ فعل مناسب ہے یا نہیں؟ جہاں تک جانور کی حرمت و حلت کا تعلق ہے تو یہ زندگی کے باقی رہنے پر موقوف ہے، اگر بے ہوش ہونے کے باوجود جانور کے اندر ”معمول“ کی زندگی باقی ہو اور دوران خون جاری ہو تو ذبیحہ حلال ہو جائے گا، ایسی اضطراری کیفیت اور حرکت جو عام طور پر موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے، اس کا اعتبار نہیں، ایسی حرکت باقی رہتے ہوئے بھی جانور ذبح کر دیا جائے تو یہ مردار ہی کے حکم میں ہے۔

۱۔ احکام القرآن للجصاص: ۳۲۱/۳ ۲۔ دیکھئے: مختصر الطحاوی: ۲۹۶، الشرح الصغیر: ۱۵۸/۲، شرح مہذب: ۷۸/۹،

المغنی: ۳۱۲/۹ ۳۔ ہدایہ مع الفتح: ۴۸۹/۹، المغنی: ۳۱۱/۹ ۴۔ شرح مہذب: ۷۸/۹، الشرح الصغیر: ۱۵۸/۲

۵۔ رد المحتار: ۱۸۸/۵، بدائع الصنائع: ۵۰/۵

خود اس عمل کی وجہ سے شبہ نہیں کہ جانور کو ایک گونہ تکلیف ہوتی ہے، لیکن چوں کہ یہ تکلیف ذبح کی شدید تر تکلیف کے احساس کو کم کرنے اور آسان بنانے کے لئے ہے، اس لئے محض اس وجہ سے اس کو مکروہ قرار دینا صحیح نظر نہیں آتا؛ فقہ کا اصول ہے کہ فاعل کے مقصد و ارادہ کے لحاظ سے اس کے افعال کا حکم متعین ہوگا: الامور بمقاصدھا، البتہ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ کیا بے ہوش کرنے کی وجہ سے جانور کا دوران خون بھی کم ہو جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ڈاکٹروں ہی سے اس کی تحقیق ہو سکتی ہے، اگر دوران خون میں کوئی کمی واقع نہ ہو تو یہ صورت بلا کراہت جائز ہوگی اور اگر خون کا دوران کم ہو جاتا ہے تو یہ عمل مکروہ ہوگا۔

دوران ذبح گردن الگ ہو جائے

جانور اس طرح ذبح کیا کہ گردن ہی الگ ہوگئی، تو اگر اس نے قصد اس طرح ذبح کیا ہے تو اس کا یہ عمل مکروہ ہوگا، مگر ذبیحہ حلال و درست ہوگا۔

”ولو ضرب عنق جزور أو بقرة أو شاة وأبانها وسمی، فان كان ضربها من قبل الحلقوم توکل وقد أساء.“^۱

ترجمہ: ”اگر اونٹ، گائے یا بکری کی گردن ماری اور اس کو علاحدہ کر دیا اور ایسا کرتے ہوئے اللہ کا نام لیا تو اگر اس پر حلق کی جانب سے وار کیا تو ذبیحہ کھایا جائے گا، لیکن اس نے یہ طریقہ ذبح اختیار کر کے غلطی کی۔“

مغربی ممالک سے آئے ہوئے گوشت

مسلم ممالک کی صنعتی پسماندگی اور مغربی ممالک کے ارتقاء نے نوبت یہاں تک پہنچادی کہ ہم غذائی طور پر بھی خود ملکتی نہیں ہیں اور اکثر مسلم ممالک کو یورپی اور عیسائی ممالک ذبح شدہ گوشت سپلائی کرتے ہیں، اس بات کی تحقیق کے لئے کہ کیا یہ جانور شرعی طریقہ پر ذبح کئے گئے ہیں؟ مسلم ملکوں کی طرف سے ”مراقب“ متعین ہیں، وہ پورے نظام کی نگرانی کرتے ہیں اور ذبیحہ کے پیکٹ پر ”ذبح علی طریق شرعی“ کی مہر لگا دیتے ہیں۔

اصولی طور پر ان کا کھانا حلال و جائز ہے، اس لئے کہ فقہاء نے ان امور میں غیر مسلموں کی ایسی اطلاع کو بھی معتبر مانا ہے جس کو جھٹلانے کے لئے کوئی واضح سبب موجود نہ ہو، عالمگیری میں ہے:

”من أرسل أجیراله مجوسیا أو خادما فاشتری لحما، فقال اشتریت من یهودی

أونصرانی أو مسلم وسعه اكله۔^۱

ترجمہ: ”جس نے اپنے مجوسی ملازم یا خادم کو بھیجا، اس نے گوشت خریدا اور کہا کہ میں نے یہودی،

نصرانی یا مسلمان سے خرید کیا ہے تو اس کو کھانے کی گنجائش ہے۔“

ہاں، اگر دوسرے قرائن اور معتبر و معقول ذرائع سے اس بات کا غالب گمان ہو جائے کہ یہ بس یونہی لکھ دیا گیا ہے، حقیقی معنوں میں شرعی طریقہ کی رعایت نہیں کی گئی ہے تو اب اس کا کھانا درست نہ ہوگا، اس پر فقہاء کی اس تصریح سے روشنی پڑتی ہے:

”رجل اشتری لحماً فلما قبضه فأخبره مسلم ثقة أنه قد خالطه لحم الخنزير

لم يسعه أن ياكل۔“^۲

ترجمہ: ”کسی شخص نے گوشت خریدا اور جب گوشت اپنے قبضہ میں لیا تو کسی قابل اعتماد مسلمان

نے اطلاع دی کہ اس سے خنزیر کا گوشت ملا ہوا تھا، تو اب اس کے لئے کھانے کی گنجائش نہیں۔“

قربانی گاؤ کا مسئلہ

گائے کے سلسلہ میں دوسرے جانوروں کے مقابلہ میں احترام و تقدس کا تصور دنیا کی مختلف قوموں میں زمانہ قدیم ہی سے رہا ہے۔ بنی اسرائیل کی گاؤ پرستی اور گمراہی کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ قدیم اقوام میں قوم عمالقہ میں بھی یہ گمراہی تھی ہندوؤں میں بھی ابتداء گائے کی حرمت کا کوئی تصور نہیں تھا مگر رفتہ رفتہ اسے خدائی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ ابوریحان البیرونی نے ہندوستان کی سیاحت کے دوران گائے کے تقدس کا جو خیال ہندوؤں میں دیکھا اس کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔^۳

سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں جہاں کہ گاؤ کشی قانوناً ممنوع ہے اور برادران وطن کے لئے گائے کی قربانی یا ذبح گاؤ ایک انتہائی حساس اور جذباتی مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں کو اس کا تسلیم کر لینا اور اس سے رک جانا شرعاً درست ہے یا اس کی مخالفت ضروری ہے؟ یہ سوال قدرے تفصیل چاہتا ہے:

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام میں گائے کا گوشت حلال ہے اور اس کا ذبح کرنا اور قربانی بھی جائز ہے اور اس پر امت کا اجماع اور اتفاق ہے۔^۴

قرآن مجید میں صریح لفظوں میں گائے کے حلال ہونے کا ذکر موجود ہے۔^۵

^۱ ملاحظہ ہو ”تحقیق مافی الہند“ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد

^۲ انعام: ۱۴۴

^۳ ہندیہ: ۳۰۹/۵

^۴ المیزان الکبریٰ للشعرانی: ۲/۵۸، ۶۴

حضرت عائشہ صدیقہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی گائے کا گوشت تناول فرمایا ہے۔ آپ ﷺ سے گائے کی قربانی بھی ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ سفر کی حالت میں تھے اور عید الاضحیٰ آگئی۔ ہم لوگوں نے ایک گائے میں شرکت کر لی۔ حضرت جابر رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ایک گائے سات آدمیوں کی طرف سے کافی ہے۔^۱

ان تصریحات سے جہاں ذبح گاؤ اور اس کی قربانی کا جواز معلوم ہوتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم نہیں دیا ہے اس کا کرنا واجب یا کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں ہے اور نہ اس کو کچھ استحباب وغیرہ کا درجہ حاصل ہے۔ ایسے احکام کو شریعت میں ”مباح“ اور ”جائز“ کہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہوگا کہ کیا اصولی طور پر اس کی ممانعت یا اس کو تسلیم کر لینا اور اجتماعی اور دائمی طور پر اس سے رک جانا درست ہوگا؟ اس سلسلہ میں دو اصول ہیں جو بتلاتے ہیں کہ انفرادی طور پر عمل نہ کرنا اور بات ہے لیکن اجتماعی اور اصولی سطح پر اسے تسلیم کر لینا درست نہیں۔

ذبیحہ کی حیثیت ”شعائرِ دین“ کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

”من صلی صلوٰتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذاک المسلم الذی لہ ذمۃ اللہ ورسولہ فلا تخفروا اللہ فی ذمتہ۔“^۲

ترجمہ: ”جس نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کا استقبال کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلمان ہے جس کے لئے خدا اور رسول کا عہد ہے۔ تم اللہ کے عہد کے معاملہ میں زیادتی نہ کرو۔“

یہاں مسلمانوں کے ذبیحہ کو حلال سمجھنے اور کھانے کو اسلام کی علامت اور نشان کی حیثیت دی گئی ہے، نیز اس کا ذکر نماز اور استقبال قبلہ کے ساتھ کیا گیا ہے جس کا شعارِ اسلامی ہونا ظاہر ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے کہ یہاں ہندو مذہبی اور اعتقادی حیثیت سے گاؤ کشی کو حرام سمجھتے ہیں۔ اب اگر یہاں اس پر پابندی تسلیم کر لی جائے تو یہ نہ صرف یہ کہ اسلام کے ایک شعار کو کھونا ہوگا بلکہ ایک غیر اسلامی شعار کو قبول کر لینے کے مترادف ہوگا۔

جب کہ اسلام شعائرِ دین کے سلسلہ میں بہت غیور اور حساس ہے اور ادنیٰ درجہ مداخلت کو گوارا نہیں کرتا۔ اسی لئے فقہاء رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم نے ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم دیا ہے جو اجتماعی طور پر اذان یا جماعت کا اہتمام ترک کر دیں اس لئے کہ ایسے لوگ محض ایک مسنون عمل ہی کو ترک نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان شعائرِ دین سے گریزاں

^۱ المیزان الکبریٰ للشعرانی: ۲/۵۸، ۶۴ ^۲ بخاری، عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۵۶/۱ فصل استقبال القبلة

ہیں جو اسلام کے اظہار اور اس کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔

دوسرے اس طرح ایک ایسی چیز پر خط نسخ پھیر دینا لازم آئے گا جس کی نہ صرف یہ کہ اسلام نے اجازت دی ہے بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے خود بھی اس پر عمل فرمایا ہے اور یہ بھی درست نہیں ہے۔ اسی کو فقہاء ”ایجاب مباح“ سے تعبیر کرتے ہیں۔

وہ امور جن کی اجازت خود نصوص یعنی قرآن و حدیث سے ثابت ہو، ان میں بعض وہ ہیں جو شرعاً پسندیدہ اور مطلوب ہیں وہ جن باتوں کا ذریعہ بنتی ہیں وہ بھی پسندیدہ ہیں، مثلاً تعدد ازواج کہ یہ افزائش نسل اور عفت و عصمت کا ذریعہ ہے یا تجارت جو خلق خداوندی اور مسلمانوں کی خدمت ہے۔ ایسے احکام انفرادی لحاظ سے محض جائز ہیں، ان کا کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہے مگر اجتماعی سطح پر مطلوب ہیں۔

بعض امور ایسے ہیں کہ شریعت نے ان کی اجازت تو ضرور دی ہے مگر اجازت محض ضرورت کی بناء پر ہے ورنہ وہ اپنی اصل کے لحاظ سے ناپسندیدہ ہیں اور نامناسب نتائج کی حامل ہیں۔ مثلاً طلاق کہ خود شریعت کی نگاہ میں وہ ناپسندیدہ ہے۔

ایسے احکام انفرادی اعتبار سے تو جائز ہیں مگر اجتماعی لحاظ سے ان سے باز رہنا شریعت کا مطلوب ہے..... شرعی نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایسے مباحات کو عام طور پر اختیار کیا جانے لگے اور قانون کا غلط استعمال ہونے لگے تو اس کے سد باب کے لئے حکومت اس کو قابل سرزنش جرم قرار دے سکتی ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں طلاق مغلطہ پر کوڑے لگوائے ہیں مگر سرے سے ان احکام کو باطل اور کالعدم قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ان معاملات کا اختیار افراد سے سلب کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً طلاق کے بے جا استعمال پر ”طلاق“ کو بے اثر قرار نہیں دیا جاسکتا نہ مردوں سے یہ حق چھینا جاسکتا ہے مگر سرزنش کی جاسکتی ہے۔

اور بعض احکام وہ ہیں جو شریعت کی نگاہ میں نہ پسندیدہ ہیں اور نہ ناپسندیدہ اسی طرح وہ اپنی ذات کے اعتبار سے نہ کسی ایسی بات کا ذریعہ بنتے ہیں جسے شریعت تحسین کی نظر سے دیکھتی ہے اور نہ کسی ایسی بات کا جو شریعت کی نگاہ میں مذموم ہو مثلاً گاوؤ کشی کا مسئلہ ہے۔ خود ”نص“ سے اس کا جواز ثابت ہے اور کہیں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں ہے جس سے اس کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہو۔ ایسے احکام پر بھی عام حالات میں عمومی پابندی عائد کرنا صحیح نہ ہوگا۔

اسلام سے پہلے بھی اہل کتاب نے بعض چیزوں کو بطور خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا جن کو قرآن نے ”اصر

نہ ابواسحاق شاطبی نے پہلی صورت کو المباح بالجزء المطلوب بالفعل بالکل، دوسری صورت کو المباح بالجزء المطلوب التبرک بالکل اور تیسری صورت کو المباح المطلق سے تعبیر کیا ہے۔

واغلال“ سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن نے اس طرز عمل کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے:

”من حرم زينة الله التي اخرج لعباده والطيبات من الرزق.“^۱

ترجمہ: ”کس نے اللہ کی وہ زینت جو اس نے بندوں کے لئے نکالی تھی اور (اللہ) کی پیدا کی ہوئی پاک رزق حرام کر دی؟“

حضرت عبداللہ بن عباس رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُما سے مروی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اپنے اوپر گوشت، گھی اور چربی حرام کر لی تھی۔ ابن زید رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے بکری کا گوشت، دودھ اور گھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، یہ آیت ان ہی لوگوں کے بارے میں ہے۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے قتادہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے نقل کیا ہے کہ اس آیت میں ان تمام اہل جاہلیت کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے دیوتاؤں اور فرضی خداؤں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانور کو اپنے اوپر حرام تصور کرتے تھے۔

بہر حال اس آیت کا شان نزول جو واقعہ بھی ہو یہ آیت اسی موقع پر اور ان ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنے اوپر بعض حلال چیزوں کو حرام کر چکے تھے۔

ممکن ہے یہاں یہ شبہ پیدا ہو کہ قرآن میں جس تحریم کی مذمت کی گئی ہے وہ عقیدے کے اعتبار سے حرام قرار دے لینا ہے لیکن حکومت جب کسی کو ایک جہت کا پابند بناتی ہے تو آدمی کو اس کا پابند نہیں کرتی کہ عقیدے کے اعتبار سے بھی اس کو حرام ہی تصور کرنے لگے، بلکہ محض عملی حیثیت سے اس مباح کے ترک کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

یہ شبہ دو وجوہ سے غلط ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن میں مطلقاً حرام کر لینے کی مذمت کی گئی ہے اور یہ تحریم جس طرح اعتقاد اور فکر کے اعتبار سے حرام کر لینے پر بولا جاتا ہے۔ اسی طرح عملاً حرام کر لینے کو بھی کہتے ہیں۔ دوسرے خود قرآن مجید کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ محض عملاً کسی شے کو اپنے اوپر حرام کر لینا بھی ایک نادرست اور غیر اسلامی عمل ہے اور حلال کو حرام قرار دے لینے کے مرادف ہے چنانچہ آنحضور ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

”لم تحرم ما احل الله لك تبتغي مرضات ازواجك.“^۲

ترجمہ: ”اے نبی ﷺ! اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنی بیویوں کی رضا جوئی میں کیوں حرام کر رہے ہو؟“

ابن سعد، عبد بن حمید، امام بخاری اور ابن منذر رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے حضرت عائشہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ، حضرت زینب بنت جحش رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا کے پاس ٹھہر کر شہد نوش فرمایا کرتے تھے چنانچہ میں نے اور حفصہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا نے ایک روز پہلے طے کر لیا اور جب حضور ﷺ تشریف لائے تو ہم دونوں نے کہا کہ آپ کے منہ سے گوند کی بدبو آ رہی ہے۔ کیا آپ (ﷺ) نے ابھی یہ تناول فرمایا ہے؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: نہیں بلکہ میں نے زینب رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا کے پاس شہد پیا ہے اور آئندہ نہیں پیوں گا۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن منذر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے بھی اسی حدیث کو حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا سے روایت کیا ہے۔ لیکن اس روایت میں ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا کی بجائے حضرت سودہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا کے یہاں شہد کھانے کا تذکرہ ہے۔^۱

حاصل یہ ہے کہ اصولی طور پر اس کو ممنوع تسلیم کر لینا تو قطعاً درست نہیں ہوگا البتہ فتنہ کے اندیشہ سے وقتی طور پر کسی کام سے مصلحتاً رک جانا جائز ہے جیسے کسی آبادی میں کسی خاص موقع پر اس کی وجہ سے سخت فساد پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو، اور وقتی طور پر اس سے رک جایا جائے، مگر اس کی حیثیت جزوی اور انفرادی ہے۔

سرد ہونے سے پہلے ذبیحہ کا چمڑا اتارنا

آج کل بعض مسلخوں میں ایسا ہوتا ہے کہ جانور ابھی سرد بھی نہ ہو پایا اور اس کے چمڑے کھینچ لئے جاتے ہیں، یہ مکروہ ہے۔ اس لئے کہ اس سے بلا فائدہ جانور کو تکلیف پہنچتی ہے۔

”وكره كل تعذيب بلا فائدة مثل قطع الراس والسلخ قبل ان تبرداى تسكن عن الاضطراب.“^۲

امام نووی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”ان الفعل مکروه والعضو المقطوع حلال وبه قال مالک وابو حنیفہ واحمد واسحاق.“^۳

تَرْجَمَہ: ”یہ عمل مکروہ ہے لیکن اس حالت میں جو حصہ کاٹ لیا گیا ہے وہ حلال ہے امام مالک، ابو حنیفہ، اور اسحاق رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی بھی اسی کے قائل ہیں۔“

البتہ چوں کہ ذبح شرعی پایا جا چکا ہے اس لئے اس کا کھانا حلال ہو جائے گا۔



معاشرتی مسائل

ازدواجی زندگی

اہل کتاب سے نکاح

شریعت میں غیر مسلموں اور عام کافروں کے مقابلے میں اہل کتاب کو مسلمانوں سے تعلقات اور روابط کے لحاظ سے ایک گونہ فوقیت دی گئی ہے۔ چنانچہ ان کا ذبیحہ حلال قرار دیا گیا اور ان کی عورتوں سے مسلمان مردوں کے لئے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ خود قرآن مجید (مائدہ: ۵) میں اس کا ذکر موجود ہے۔ مگر اس سلسلہ میں یہ باتیں پیش نظر رہیں:

- ۱ کسی مسلمان عورت سے کوئی عیسائی یا یہودی مرد نکاح نہیں کر سکتا۔
 - ۲ ایسی کتابی عورتوں سے نکاح کیا جائے گا جو پاک دامن اور عصمت مآب ہوں۔ اسی کے اظہار کے لئے قرآن نے ”محصنت“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔
 - ۳ وہ واقعہ عیسائی یا یہودی ہوں یعنی وحی، رسالت و آخرت وغیرہ پر ایمان رکھتی ہوں، دہریے اور خدا کے منکرین جو صرف نام کے عیسائی اور یہودی کہلاتے ہوں ان کا یہ حکم نہ ہوگا۔
 - ۴ غیر مسلم ملک میں بسنے والی یہودی یا عیسائی عورت سے نکاح کرنا بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرام اور احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کے یہاں مکروہ تحریمی ہے۔
- موجودہ زمانہ میں جو عیسائی اور یہودی عورتیں ہیں اور اہل کتاب کہلاتی ہیں ان کے اندر زنا، فحاشی اور ناجائز تعلقات کی اتنی کثرت ہے جس کو سن کر انسانیت کی پیشانی پر پسینہ آ جاتا ہے اور جس نے گویا حیوانوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

دوسرے ان کی اکثریت الحاد، مذہب بیزاری، انکار آخرت وغیرہ کی شکار ہے، ظاہر ہے ایسے لوگوں سے نکاح قطعاً حلال نہ ہوگا اور وہ قرآن کی اصطلاح میں اہل کتاب شمار نہ ہوں گے۔

۱۰ وفی التجرید منهم من یقر بالتوحید ویجحد بالرسالة خلاصہ: ۳۸۹/۴

اس کے علاوہ جو غیر مسلم ممالک کی کتابیہ عورتیں ہیں ان کے بارے میں ذکر کیا ہی جا چکا ہے کہ ان سے نکاح مکروہ ہے اور اس عاجز کی رائے میں اگر یہ سب باتیں نہ بھی پائی جائیں تو بھی ہمارے عہد میں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کراہت سے خالی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ مسلم حکمرانوں کے تحت اہل کتاب عورتوں کے ہونے کی وجہ سے اسلامی حکومتوں کو شدید نقصانات پہنچے ہیں اور اس کی وجہ سے ایسے ممالک میں جہاں اس کا رواج ہے مسلمانوں کے اخلاقی حالات کو بھی بے پناہ نقصان پہنچا ہے۔ یہ تو ہمارا دور ہے، سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود اپنے زمانہ میں اس نقصان کو محسوس کیا اور مسلم گورنروں کو اس سے باز رہنے کی خصوصی ہدایات فرمائیں۔ چنانچہ حضرت شقیق ابن سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے نکاح کر لیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کی اطلاع ملی تو ان کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دے دو۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں لکھا کہ کیا وہ میرے لئے حرام ہے؟ امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں حرام نہیں کہتا لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں عام طور پر عفت و پاک دامنہ نہیں ہے اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ آپ لوگوں کے گھرانے میں اس راہ سے فحاشی و بدکاری داخل نہ ہو جائے۔

چنانچہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ فقہاء احناف رحمہم اللہ تعالیٰ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو مکروہ سمجھتے ہیں۔^۱ اور علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل کتاب عورتوں سے نکاح پر سخت تنبیہ فرمائی اور حکم دیا کہ انہیں طلاق دے دیں۔^۲

شیعہ سے نکاح

اہل تشیع کے بعض فرقے وہ ہیں جن کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے مثلاً جو لوگ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدامانتے ہوں، ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگاتے ہوں یا قرآن کی صحت اور اس کی غیر محرف اور ترمیم و حذف سے پاک ہونے میں شک کرتے ہوں، وہ کافر ہیں اور ظاہر ہے ان سے نکاح جائز نہیں ہوگا۔

لیکن وہ روافض جو ان چیزوں کے قائل نہ ہوں چاہے وہ حضرات شیخیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو برا بھلا ہی

کیوں نہ کہتے ہوں علماء محققین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ کافر نہیں ہیں بلکہ فاسق ہیں۔^۱
لیکن چوں کہ ایک تو اس صورت میں بھی کراہت ہے اور دوسرے بعض لوگوں نے اس کو کفر بھی قرار دیا ہے
..... اس لئے اہل تشیع سے نکاح سے احتراز ہی کرنا چاہئے۔

کمیونسٹوں سے نکاح

کمیونزم، فکر و اعتقاد سے لے کر معیشت تک ہر باب میں ایک مستقل نظام اور تصور رکھتا ہے اس کی فکری بنیاد الحاد اور مذہب و آخرت سے انکار ہے، اس طرح جو آدمی ان تمام نظریات کے ساتھ کمیونسٹ ہو وہ نہ مسلمان ہی باقی رہتا ہے اور نہ اس کا شمار اہل کتاب ہی میں کیا جاسکتا ہے، وہ کافروں کے زمرہ میں ہے اور ان سے نکاح مطلقاً جائز نہیں ہے۔

ہاں اگر وہ محض معاشی سطح پر انفرادی ملکیت کے قائل نہ ہوں اور ان قرآنی آیات کا جن سے ذاتی ملکیت کا ثبوت ملتا ہے تاویل کریں تو اب ان کا شمار کافروں میں نہ ہوگا بلکہ وہ محض بدعتی سمجھے جائیں گے اور ان سے نکاح درست ہوگا۔

قادیانی سے نکاح

جو لوگ اسلام سے قادیانیت کی طرف گئے ہیں وہ تو مرتد ہیں اور ان سے نکاح کے جواز کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جو لوگ نسلی طور پر قادیانی ہیں، وہ بھی زندیق اور بددین ہیں اور ان سے بھی نکاح جائز نہیں، اسی بناء پر فقہاء رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے اہل قبلہ میں سے ہونے کے باوجود معتزلہ سے نکاح کی اجازت نہیں دی ہے۔
”المناکحة بین اهل السنة واهل الا حزال لا يجوز“۔ اس لئے قادیانی اہل کتاب کے حکم میں نہیں ہیں بلکہ زندیق ہیں اور ان سے کسی قسم کا شادی بیاہ کا تعلق جائز نہیں۔

عدالتی نکاح

عدالت کے ذریعہ نکاح کی مروجہ صورت یہ ہے کہ مرد و زن رجسٹرار کے پاس نکاح نامہ پر دستخط کر دیتے ہیں، قانوناً نکاح منعقد ہونے کے لئے زبانی ایجاب و قبول اور گواہان کی موجودگی ضروری خیال نہیں کی جاتی ہے شرعاً اس طرح نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ جب فریقین توت گویائی رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ زبان کے ذریعہ ایجاب و قبول ہو اور دو مسلمان مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں بہ حیثیت گواہان موجود ہوں، اگر رجسٹرار کے پاس ان

۱۔ رد المحتار: ۴۵۳/۳ ۲۔ الروافض ان کان یسب الشیخین ویلعنہما فہو کافر: خلاصة الفتاوی: ۴/۲۸۱

۳۔ خلاصة الفتاوی: ۶/۲

دونوں شرطوں کی تکمیل ہو جاتی ہو، تب تو نکاح صحیح ہوا اور ان دونوں کے ازدواجی تعلقات حلال ہوں گے، ورنہ تعلقات حرام ہوں گے اور نکاح فاسد۔ اگر خدا نخواستہ کسی نے ایسے فاسد طریقہ پر نکاح کر لیا تو چاہئے کہ دوبارہ گواہان کی موجودگی میں ایجاب و قبول کر کے نکاح کو درست کر لیں۔

یوں بھی رجسٹرار کے ذریعہ نکاح کا یہ طریقہ اسلام کے تصور نکاح کی روح کے خلاف ہے، اسلام چاہتا ہے کہ نکاح علانیہ ہو، اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر ہو اور لوگ زوجین کے درمیان حلال و جائز طریقہ پر مبنی ازدواجی رشتہ سے آگاہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ عدالتی نکاح کی مروجہ صورت میں اگر زبانی ایجاب و قبول ہو جائے اور گواہان بھی موجود ہوں، جب بھی اس مقصد کی کما حقہ تکمیل نہیں ہوتی، نکاح صحیح کی صورت میں نکاح کے تمام ہی احکام ثابت ہوں گے۔ لیکن اگر نکاح فاسد ہو اور مرد نے اس عورت سے صحبت کر ہی لی تو عورت کا خاندانی مہر (مہر مثل) اسے ادا کرنا ہوگا۔ نیز اس سے بچہ پیدا ہو جائے تو اس بچہ کا نسب بھی اس مرد سے ثابت ہوگا اور وہ اس کے لئے محرم قرار پائے گا۔ البتہ لڑکے کو اس مرد سے میراث نہیں ملے گی۔^۱

تحریری نکاح

تحریر کے ذریعہ بھی نکاح ہو سکتا ہے مگر یہ ضروری ہے کہ طرفین میں سے ایک کی جانب سے نکاح کی قبولیت کا زبانی اظہار ہو اور صرف ایک ہی طرف سے تحریر ہو۔ نیز قبولیت کا اظہار دو گواہوں کے سامنے کیا جائے اور وہ تحریر بھی ان گواہوں کو سنادی جائے۔ مثلاً زید ہندہ کو لکھے کہ میں نے تم سے اتنے مہر پر نکاح کیا، ہندہ کے پاس جب یہ تحریر پہنچے تو اول وہ دو گواہوں کو طلب کر کے ان کو یہ تحریر سنادے اور پھر کہے کہ میں اسے قبول کرتی ہوں۔ اب نکاح منعقد ہو جائے گا۔

اگر ہندہ وہ تحریر پڑھ کر گواہوں کو نہ سنائے بلکہ صرف اپنی قبولیت کا اظہار ان کے سامنے کرے یا زبانی اظہار کی بجائے صرف تحریر لکھ دے اور اسی پر گواہوں کے دستخط کرا لے یا گواہوں کے دستخط بھی نہ کرائے ان تمام صورتوں میں نکاح نہیں ہو سکے گا۔^۲

ٹیلی فون کے ذریعہ نکاح

صرف ٹیلی فون پر ایجاب و قبول کافی نہ ہوگا، اس لئے کہ ایک تو دونوں کی مجلس بالکل مختلف ہے، دوسرے گواہان، فریقین کی بات پوری طرح سن نہیں سکتے البتہ یہ صورت ممکن ہے کہ فون کے ذریعہ کوئی ایک فریق کسی کو

^۱ درمختار ورد المحتار: ۴۸۴/۲

^۲ خلاصۃ الفتاوی: ۴۸/۲ الفصل السابع عشر فی النکاح بالکتاب ودرمختار: ۴۳۴/۲

نکاح کے لئے وکیل بنادے اور وکیل دو گواہوں کی موجودگی میں بہ حیثیت وکیل ایجاب و قبول کا فریضہ انجام دے، مثلاً ہندہ، زید کو ٹیلی فون کر دے کہ میں تم کو اس بات کا وکیل بناتی ہوں کہ تم اپنے آپ سے میرا نکاح کر دو۔ اب زید یہ کرے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں کہے کہ تم لوگ گواہ رہو کہ میں نے فلانہ بنت فلاں سے نکاح کر لیا، تو نکاح ہو جائے گا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ گواہان اس عورت سے واقف اور متعارف ہوں۔

”إمراة وكلت رجلا بأن يزوجهها من نفسه فقال الوكيل اشهدوا اني قد تزو جت فلانة من نفسي إن لم يعرف الشهود فلانة لا يجوز النكاح ما لم يذكر إسمها و إسم ابیها وجدها و إن عرف الشهود فلانة وعرفوا أنه اراد به تلك المرأة يجوز.“^۱

کوئی عورت کسی مرد کو اس بات کا وکیل بنائے کہ وہ اپنے آپ سے اس کا نکاح کر لے پھر وہ وکیل کہے کہ گواہ رہو کہ میں نے فلاں خاتون کا اپنے آپ سے نکاح کر لیا، تو اگر گواہ اس عورت کو نہ جانتے ہوں تو اس وقت تک جائز نہ ہوگا جب تک کہ وہ عورت کا اور اس کے باپ اور دادا کا نام ذکر نہ کر دے اور اگر گواہ اس خاتون کو پہچان لیں کہ وہی عورت ہے اور مرد اسی سے نکاح کا ارادہ کر رہا ہے تو جائز ہے۔

طرفین ایک دوسرے کو نکاح کا وکیل بنانے کے بجائے ایک فریق کسی کو نکاح کا وکیل بنادے اور دوسرے فریق کے سامنے بہ حیثیت وکیل ایجاب کرے اور دوسرا فریق قبول کر لے تو بھی نکاح منعقد ہو جائے گا۔

غیر عربی لفظوں سے نکاح و طلاق

شریعت کا اصول یہ ہے کہ جو امور ذکر سے متعلق ہیں ان میں الفاظ و معانی دونوں ہی مقصود ہوتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید، نماز وغیرہ جس میں تلاوت قرآن اور بعض اذکار واجب ہیں۔ اگر ان میں اس کی بجائے اس کا ترجمہ پڑھ دیا جائے تو صحیح تر قول کے مطابق درست نہ ہوگا۔ لیکن عام گفتگو اور معاملات میں عربی ہی کے الفاظ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے جیسے خریدنا، بیچنا، ہبہ کرنا وغیرہ۔

نکاح و طلاق بھی ان ہی معاملات میں سے ہے۔ وہ تمام الفاظ جن سے کسی بھی زبان میں نکاح و طلاق کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ نکاح ہو جانے اور طلاق ہونے کے لئے کافی ہوں گے۔ طلاق کے لئے کسی دوسری زبان کا ایسا لفظ استعمال کیا جائے جو خاص اسی مفہوم کو ادا کرتا ہو اور اس کو بولنے کے بعد کسی اور طرف ذہن جاتا ہی نہ ہو تو اس سے طلاق رجعی واقع ہوگی یعنی اس طلاق کے بعد بیوی کو لوٹا لینے کا حق باقی رہے گا اور اگر ایسے غیر

عربی الفاظ سے طلاق دی ہے جو متعدد مفہوم کا احتمال رکھتے ہیں اور بولنے والے کی نیت طلاق کی ہو تو طلاق بائن واقع ہوگی اور اگر لفظ تو ایسے ہی ہوں جس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں لیکن طلاق کے مفہوم میں اس کا اتنا غالب استعمال ہونے لگا ہو کہ فوراً ذہن اسی طرف جائے تو طلاق تو اس سے بلا نیت واقع ہوگی لیکن طلاق بائن۔ جیسا کہ علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے لفظ حرام کے ذریعہ بلا نیت طلاق بائن واقع قرار دی ہے۔

کیا خون سے حرمت نسب ثابت ہوگی؟

کبھی دواء ایک شخص کا خون دوسرے آدمی کے جسم میں چڑھایا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسی صورت میں وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے حرام ہو جائیں گے اور ان دونوں کا نکاح باہم درست ہوگا یا نہیں؟ جب کہ فقہاء رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی دودھ کی وجہ سے حرمت پیدا ہو جانے کے قائل ہیں اور اس کی وجہ یہی بیان کرتے ہیں کہ جب دودھ پلانے والی کے جسم کا ایک جزو، دودھ پینے والے کے جسم میں گیا تو گویا اب وہ دودھ پلانے والی کا اسی طرح جزو ہو گیا جیسے بچہ اپنے ماں باپ کا۔

جواب یہ ہے کہ حرمت پیدا نہ ہوگی۔ ایک تو اس لئے کہ دودھ کی وجہ سے حرمت کا پیدا ہو جانا ایک خلاف قیاس بات ہے۔ اگر شریعت کا یہ حکم نازل نہ ہوتا تو ہم آپ اپنی عقل سے اس کو نہ سمجھ سکتے اس لئے دوسری چیزوں کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے شیر خوار بچے کو دودھ دینا بطور غذا کئے ہے نہ کہ بطور دوا کے۔ اور خون چڑھانا دوا کے طور پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدت رضاعت گزر جانے کے بعد جب آدمی اپنی غذا کے لئے عورت کے دودھ کا محتاج نہ رہے اور دواء اس کا دودھ کسی ذریعہ سے استعمال کر لے تو اس کی وجہ سے حرمت پیدا نہیں ہوتی۔

پھر جو حکم خون کا ہے وہی حکم حرمت کے معاملے میں اعضاء کی تبدیلی اور پیوند کاری کا بھی ہوگا۔

نکاح میں گانے بجانے کا حکم

گانا بجانا اور نغمہ و سرود اسلام میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔ فقہاء احناف رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی نے اس کو مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے۔

علامہ عبدالرشید طاہر البخاری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

”استماع صوت الملاہی كالضرب بالقصب وغيره حرام لانه من الملاہی

وقال عليه الصلوة والسلام استماع الملاہی معصية والجلوس عليها فسوق

والتلذذ بها من الكفر، هذا على وجه التهديد لكن وجب عليه أن يجتهد حتى لا يسمع“^۱

ترجمہ: ”ڈھول جیسی نوعیت کے باجوں کی آواز سننا حرام ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے ساز انسان میں غفلت پیدا کرتے ہیں، جناب نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ باجے سننا معصیت ہے اور گانے کی محفلوں میں شرکت کرنا کارِ معصیت ہے اور اس سے لذت اندوز ہونا کافروں کے اعمال میں سے ہے آپ ﷺ نے یہ بات ازراہ تہدید کہی ہے۔ تاہم واجب ہے کہ حتی المقدور گانا سننے سے بچے۔“

اور شامی میں ہے:

”استماع ضرب الدف والمزمار وغير ذلك حرام.“^۲

ترجمہ: ”دف اور مزمار وغیرہ کے ساز کا سننا حرام ہے۔“

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ حکم عام حالات کے لئے لکھا ہے۔ جہاں تک شادی کی بات ہے تو اس میں دف اور اچھے اشعار کا ثبوت خود احادیث سے ہے۔ چنانچہ حضرت ربیع بنت معوذ بن عفرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ ان کی شادی کے موقع پر حضور ﷺ تشریف لائے اور ان کے سامنے ہی چند چھوٹی بچیاں دف بجا رہی تھیں اور غزوہ بدر میں میرے آباء واجداد کی بہادری کا تذکرہ کر رہی تھیں۔^۳

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے نکاح کے موقع پر دف بجانے کا حکم دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی میں حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ تم نے دہن کے ساتھ کسی ایسی عورت کو کیوں نہیں بھیجا جو اس طرح گاتی ہو: ”اتینا کم اتینا کم فحیانا و حیاکم۔“^۴

اس سے معلوم ہوا کہ اچھے اشعار پڑھنے کی اجازت ہے۔ حضرت ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ انصاری اور قرظہ بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بدر میں شریک ہونے والے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ہیں ان سے بھی شادی کے موقع پر کمن بچیوں کے اشعار سننے ثابت ہیں اور فتاویٰ عالمگیری کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے موقع پر اور عید کے دن دف بجانے کی اجازت ہے۔^۵

^۱ خلاصۃ الفتاویٰ: ۳۴۵/۴ کتاب الکراہیۃ، الفصل، فیما یتعلق بالمعاصی ^۲ رد المحتار: ۲۴۹/۵

^۳ بخاری عن ربیع: ۷۷۳/۲ باب ضرب الدف فی النکاح ^۴ ابن ماجہ عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ

عنه: ۱۳۷/۱ باب الغناء والدف (ہم تمہارے پاس آئے ہم تمہارے پاس آئے ہم کو اور تم کو مبارک ہو) ^۵ نسائی عن عامر

بن سعد: ۹۲/۲ باب اللہو والغناء عند العرس ^۶ فتاویٰ عالمگیری: ۳۵۲/۵ الباب السابع عشر فی الغناء واللہو

لیکن بیہودہ، عشقیہ، گالیوں اور طعنوں پر مشتمل اشعار پڑھنا، بالغ یا مشتبہات بچیوں کا اجنبیوں تک اپنی آواز پہنچانا، دف کے علاوہ کسی اور چیز سے اپنی آواز ہم آہنگ کرنا جیسے ہارمونیم، طبلے، باجے وغیرہ مطلقاً حرام، ناجائز اور شدید گناہ اور معصیت کے کام ہیں اور ہمارے زمانے میں دف کی اجازت سے قوی اندیشہ ہے بلکہ مشاہدہ ہے کہ ان ساری برائیوں کو راہ مل جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے زمانے میں اس کی اجازت نہیں دینی چاہئے اور اس سے بچنا چاہئے۔ اسی طرف مولانا تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بھی رجحان ہے دعائیہ اور صالح و داعی اشعار پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مہر کی کم سے کم مقدار

حنفیہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک مہر کی کم سے کم مقدار ۱۰ درہم ہے۔ اس سے کم مقدار میں مہر باندھنا معتبر نہیں اور متعین کر لیا تب بھی کم سے کم ۱۰ درہم بہ طور مہر واجب ہوگا۔ دس درہم کا وزن دو تولہ ۱/۲ ماشہ مانا گیا ہے اور ایک تولہ ۶۶۳ء ۱۱ (گیارہ گرام ۶۶۳ ملی گرام) کے برابر ہوتا ہے۔ اس طرح موجودہ مروجہ اوزان میں ۱۰ درہم ۶۱۸ء ۳۰ (۳۰ گرام ۶۱۸ ملی گرام) کے مساوی ہے، اتنی چاندی یا اس کی قیمت مہر کی کم سے کم مقدار ہوگی، اس سے کم مہر مقرر کیا تو درست نہیں۔

مہر فاطمی

صاحبزادی رسول حضرت فاطمہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا کا مہر پانچ سو درہم تھا، چنانچہ محمد بن ابراہیم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سے مروی ہے:

”کان صداق بنات رسول اللہ و نسائه خمس مائة درہم اثنتی عشرة اوقیة و نصفاً.“^۱

ترجمہ: ”رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی صاحبزادیوں اور ازواج کا مہر پانچ سو درہم یعنی ساڑھے بارہ اوقیہ تھا۔“

اور مشہور محدث امام نووی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

”المستحب أن لا یزید علی خمس مائة درہم وهو صداق أزواج النبی و بناته.“^۲

ترجمہ: ”مستحب ہے کہ مہر پانچ سو درہم سے زیادہ نہ ہو، جو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی ازواج اور

^۱ شرح مہذب: ۳۲۷/۱۶

^۲ طبقات ابن سعد: ۲۲/۸

^۳ دیکھئے: امداد الفتاویٰ: ۲۹/۲

صاحبزادیوں کا مہر تھا۔“

موجودہ اوزان کے اعتبار سے مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اس کو ۱۳۱ تولہ ۳ ماشہ چاندی کے برابر مانا ہے..... جو گرام کے مروجہ پیمانہ کے لحاظ سے ایک کلو، ۵۳۰ گرام نو سو ملی گرام (۱۰۵۳۰۰۰) کے برابر ہوتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ آج کل ۱۲ گرام کا تولہ مروج نہیں ہے، بلکہ ۱۰ گرام کے تولہ کے حساب سے سونا چاندی کی خرید و فروخت ہوتی ہے، اس لحاظ سے مہر فاطمی قریب ۱۵۲ تولہ چاندی ہو جائے گا۔

جہیز کی حیثیت

سامان جہیز کے طور پر لڑکی کے والدین جو کچھ اسے دیتے ہیں اس کی حیثیت کیا ہوتی ہے؟ کیا اسے بیوی کی ملک سمجھا جائے گا یا شوہر کی؟

اس کا مدار ”در اصل عرف اور اشیاء کی نوعیت پر ہے۔ جو چیزیں خالصہ مردوں کے استعمال کی ہیں وہ تو مردوں ہی کی ہوں گی۔ مثلاً نوشہ کا لباس اور گھڑی وغیرہ اور جو عورتوں کے استعمال کی ہیں جیسے زنانی کپڑے، زیورات وغیرہ تو وہ ان ہی کے شمار ہوں گے۔

بچ رہے مشترک نوعیت کے سامان، فرنیچر وغیرہ۔ تو اگر نیت داماد کو ہبہ کرنے کی تھی تو وہ اس کا مالک ہو گیا اور اگر خدا خواستہ زوجین میں تفریق ہوئی تب بھی واپسی کا مطالبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔

ہمارے یہاں عرف میں عموماً مقصد خود اپنی بچی کو ایسے سامان دینا ہوتا ہے اس لئے بچی ہی اس کی مالک سمجھی جائے گی اور علاحدگی کے وقت یا اس سے پہلے بھی اسے اپنی سسرال سے واپس لانے کی مجاز ہوگی۔

فقہاء کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء جہیز پر عورت کو مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے۔

”إمرأة دفعت متاعا لها الى الزوج وقالت اين رافروش ودر كتخدائی خرم كن

ففعل هل عليه قيمته لها نعم كذا في فتاوى الخجندی.“^۱

ایک خاتون نے شوہر کو اپنا سامان دیا اور کہا کہ اسے فروخت کر دو اور نکاح میں خرچ کرو پھر اس نے ایسا کیا تو کیا مرد پر اپنی عورت کے یہ پیسے واجب ہوں گے؟ ہاں، ایسا ہی فتویٰ خجندی میں ہے۔

ہمبستری میں نرودھ ولوپ کا استعمال

موجودہ زمانے میں بچوں کی تعداد میں تحدید اور کمی کی غرض سے بعض مخصوص قسم کے ربر استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان ربر کی ٹوپوں میں ایک تو وہ ہوتی ہے جسے خود مرد اپنے عضو مخصوص پر پہنا لیتا ہے، اس کو نرودھ کہتے

^۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۱/۳۲۸ الفصل السادس عشر فی جهاز البنت

لہ جواہر الفقہ: ۱/۲۴۴

ہیں۔ دوسرے وہ جسے عورت کے فم رحم پر پہنایا جاتا ہے تاکہ مادہ اندر داخل نہ ہو سکے۔ اس کو ”لوپ“ کہا جاتا ہے۔ یہ صورت گو کہ نئی ہے مگر چوں کہ کم اولاد ہونے کا جذبہ بہت قدیم اور پرانا ہے۔ اس لئے ہمیں اسلام کے ابتدائی عہد میں بھی اس کی نظیر ملتی ہے۔

اسلام سے پہلے لوگ اس کے لئے ”عزل“ کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔ عزل یہ ہے کہ ہمبستری کے دوران جب انزال کا وقت آئے تو مرد اپنا عضو مخصوص باہر نکال لے۔ احادیث میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ مگر اس کا حکم کیا ہوگا؟

اس سلسلہ میں احادیث مختلف ہیں۔ بعض احادیث سے مطلقاً جواز معلوم ہوتا ہے اور اکثر فقہاء احناف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کا اسی طرف رجحان ہے۔ بشرطیکہ بیوی کی اجازت سے ہو بعض حضرات مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اکثر فقہاء کی یہی رائے ہے اور زیادہ تر احادیث بھی ایسی ہی منقول ہیں اور بعض احادیث سے تو بالکل حرمت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ بعض روایات میں اس کو ”موودت“ (بچوں کو زندہ درگور کرنا) قرار دیا گیا ہے۔

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ بلا عذر عزل کرنا کراہت سے خالی نہیں، بالخصوص اس وقت جب کہ محض معاشی حالات کے پیش نظر اولاد سے بچنا مقصود ہو اور محققین فقہاء احناف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی المتوفی ۱۰۱۴ھ حدیث کے اس فقرہ ”ذالك الواد الخفی“ کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ذالك لا يدل على حرمة العزل بل يدل على كراهته.“^۱

ترجمہ: ”یہ عزل کی حرمت کو نہیں بتلاتا ہے بلکہ محض کراہت کو بتاتا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ زودھ اور لوپ کا استعمال مکروہ ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ یہ محض معاشی پریشانی کے احساس پر مبنی ہو۔ البتہ کسی عذر کی بناء پر ہو تو اجازت ہے۔ مثلاً حمل ٹھہر جانے کی وجہ سے شیر خوار بچہ کے دودھ سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہو یا حمل ٹھہر جانے میں عورت کی صحت کو معمول سے زیادہ خطرہ لاحق ہو البتہ ان اعذار کے باعث بھی جب زودھ کا استعمال کرے تو بیوی سے اجازت لے لینی چاہئے کہ عزل میں بھی یہی حکم ہے، اس لئے کہ عورت کی جنسی تسکین پر اس کا اثر پڑتا ہے۔

مانع حمل دوائیں

ضبط تولید کی دوسری صورت یہ ہے کہ مادہ منویہ تو عورت کے رحم میں پہنچ جائے مگر ایسی دواؤں کا استعمال کیا

جائے کہ استقرارِ حمل نہ ہو سکے۔ فقہی نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بھی عام حالات میں ناجائز ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ابھی مادہ روح اور زندگی سے خالی ہے، اس لئے اس کو برباد کر دینا ”اصطلاحی قتل“ کے زمرہ میں نہیں آئے گا لیکن اگر اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو کچھ مدت گزرنے پر وہی ایک زندہ نفس کی شکل اختیار کر لیتا۔ اس لئے مال کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو قتل نفس کے مرادف سمجھا جائے گا۔ شمس الائمہ سرخسی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اسی کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے:

عورت کے رحم میں جا کر نطفہ جب تک خراب نہ ہو زندگی کی صلاحیت رکھتا ہے، اس لئے اس کو ضائع کرنے کی صورت میں اسے ایک زندہ شخص قرار دیا جائے گا اور اس کا ضمان واجب ہوگا جیسے کہ کوئی شخص حالتِ احرام میں شکار کا انڈا توڑ دے تو اس پر وہی جزا (تاوان) واجب ہوتی ہے جو ایک شکار کے مار ڈالنے کی ہوتی ہے۔^۱

محمد احمد علیش مالکی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے بھی ان تمام صورتوں کو جن کا مقصد استقرارِ حمل کو روکنا ہو، ناجائز قرار دیا ہے اور ایسی دواؤں کے ناجائز ہونے کی تصریح کی ہے۔ فرماتے ہیں:

منع حمل کے لئے دوا استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور جب منی رحم میں داخل ہو جائے تو زن و شو کو یا ان میں سے کسی ایک کو بھی ایسی دوا کا استعمال جائز نہیں ہے اور آقا کے لئے بھی اپنی باندی کے معاملہ میں انسانی ڈھانچہ مکمل ہونے سے پہلے پہلے اسقاط کی تدبیریں اختیار کرنا مشہور مذہب کے مطابق جائز نہیں ہے۔^۲

اس بارے میں امام غزالی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے یہ ہے کہ:

وجود انسانی کا سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ نطفہ رحم میں جا کر عورت کی منی کے ساتھ مل جائے اور زندگی کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اس کا برباد کر دینا گناہ ہے۔^۳

ان تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلا کسی عذر کے محض اولاد سے بچنے کے لئے ایسے ذرائع کا استعمال جائز نہیں ہے۔

اسقاطِ حمل

روح اور آثارِ زندگی پیدا ہو جانے کے بعد اسقاطِ حمل کی حرمت میں تو شرعاً کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں ہے اس لئے کہ جب حمل میں زندگی پیدا ہوگئی تو ایک زندہ نفس اور اس کے درمیان اس کے سوا اور کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا کہ ایک پردہ رحم کے غلاف میں ہے اور دوسرا اس دنیائے آب و گل میں آچکا ہے۔ قتل نام ہے کسی زندہ

^۱ احمد علیش: فتح العلی المالك: ۱/۳۹۹ ^۲ احیاء العلوم: ۲/۵۳

^۳ سرخسی المبسوط: ۲۶/۸۷

وجود کو زندگی سے محروم کر دینے کا۔ یہ جرم اگر بطن مادر میں ہو تو بھی قتل ہے اور تلوار اور لٹھی کا سہارا لیا جائے تو بھی قتل ہے: لا تقتلوا اولادکم کے مخاطب اگر بچوں کو زندہ درگور کر دینے والے ہو سکتے ہیں تو آخر وہ لوگ اس سے کیوں کر دامن کش ہو سکتے ہیں جو رحم مادر میں پلنے والے بچوں کو زندگی کی نعمت سے محروم کر دیں۔ اسی لئے فقہاء رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے بالاتفاق اس صورت میں اسقاط کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”اسقاط الحمل حرام باجماع المسلمین وهو من الوأد الذی قال تعالیٰ فیہ واذا الموءودة سئلت بأی ذنب قتلت.“^۱

ترجمہ: ”اسقاط حمل بالاجماع حرام ہے اور وہ اسی نفس کشی میں داخل ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن زندہ دفن کر دی جانے والی معصوم بچیوں سے سوال کیا جائے گا کہ آخر تمہیں کس جرم میں قتل کر دیا گیا۔“

جہاں تک زندگی اور روح پیدا ہونے سے پہلے اسقاط حمل کی بات ہے تو یہ پہلے ذکر کی گئی صورت کے درجہ کا گناہ تو نہیں ہے لیکن ہے ناجائز ہی۔ چنانچہ ”درر الاحکام“ میں ہے:

”الجنین الذی استبان بعض خلقه بمنزلة الجنین التام.“

ترجمہ: ”ایسا حمل جس کے بعض اعضاء دیکھنے میں آجائیں۔ کامل الخلق وجود کے درجہ میں ہے۔“

اسی اصول کی روشنی میں فقہاء رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی نے لکھا ہے کہ اگر تکمیل خلقت سے پہلے ہی حمل ساقط کر دیا جائے تو شرعاً وہی ضمان واجب ہوتا ہے جو ایک کامل الخلق حمل ضائع کرنے کی صورت میں واجب ہوتا ہے: جس نے کسی حاملہ کے پیٹ پر مارا اور حمل ساقط ہو گیا تو چاہے اس کی تخلیق پوری ہو گئی ہو یا ابھی پوری نہ ہو سکی ہو۔ بالاجماع غرہ (ایک غلام یا باندی کا دینا) واجب ہوگا۔ اس لئے کہ اس سے ایک کامل انسان کی تخلیق متوقع تھی۔

ممکن ہے کہ یہاں یہ اشکال پیدا ہو کہ چوں کہ ایک دوسرا آدمی کسی کے ساتھ اس کی رضامندی کے بغیر جبراً اور ظماً یہ حرکتیں کرتا ہے اس لئے اس کو جرم قرار دیا گیا ہے، اس کے برخلاف اگر کوئی ار خود اپنی مرضی سے ایسا کرے تو اس کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا؟

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلام میں انسان خود اپنے جسم کا بھی مالک نہیں ہے۔ اس

کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے بدن کے کسی عضو کو کاٹ ڈالے یا خودکشی کر لے۔ اس لئے جب یہ حرکتیں دوسروں کے لئے جرم ہیں تو شریعت خود اس کو بھی مجرم ٹھہراتی ہے اور سزا کا مستحق قرار دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء نے ایسی حرکتوں کے ارتکاب پر عورت کو قاتلہ قرار دیا ہے۔

چنانچہ ابن عابدین شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

”ولا يخفى أنها تأثم القتل لو استبان خلقه ومات بفعلها“^۱

ترجمہ: ”اور یہ بات ظاہر ہے کہ آثار خلقت کے ظہور کے بعد اگر پیٹ کا بچہ عورت کی حرکت سے مر گیا تو اس کو قتل کا گناہ ہوگا۔“

ابراہیم نخعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سے اسقاط حمل کے سلسلہ میں منقول ہے:

ابراہیم نخعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ایسی عورت کے سلسلہ میں جس نے دوا پی کر یا کچھ داخل کر کے اپنا حمل ساقط کر لیا ہو، کہا ہے کہ کفارہ دے اور اس پر ایک غرہ (غلام یا باندی خرید کر آزاد کرنا) واجب ہے۔^۲

قاضی خاں رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے تو اس سلسلہ میں بڑی عمدہ بات لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسقاط حمل اگر زندگی پیدا ہونے کے بعد ہو تو ظاہر ہے اس کی حرمت میں کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن اگر زندگی کے ظہور سے پہلے ہی اسقاط ہو تب بھی جائز نہیں ہوگا اس لئے کہ جب تک روح نہ پیدا ہو جائے حمل کو عورت ہی کا ایک جزو اور حصہ بدن تصور کیا جائے گا اور جس طرح کسی کا قتل درست نہیں ہے اسی طرح اپنے جسم کے کسی حصہ کو کاٹ پھینکنا بھی حرام ہے۔^۳

ان باتوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی ناگزیر عذر اور غیر معمولی مجبوری کے بغیر کسی بھی مرحلہ میں اسقاط حمل شرعاً جائز نہیں ہے۔

نس بندی

ضبط ولادت کی ایک صورت نس بندی بھی ہے۔ یعنی ایسا آپریشن جس سے دائمی طور پر قوتِ تولید ختم ہو جائے اور تو والد و تناسل کی اہلیت باقی نہ رہے۔

زمانہ جاہلیت میں قوتِ تولید کے خاتمہ کے لئے اختصاء کی صورت اختیار کی جاتی تھی۔ اختصاء کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے فوطوں کی وہ گولیاں نکال ڈالی جائیں۔ جو جنسی صلاحیت اور خاص کر قوتِ تولید کا اصل سرچشمہ ہیں۔ خود آنحضور ﷺ سے بعض صحابہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ نے اس کی اجازت چاہی تا کہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کر سکیں لیکن آپ ﷺ نے سختی سے منع فرمایا۔ چنانچہ تمام فقہاء

رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا اس کے حرام ہونے پر اتفاق ہے حتیٰ کہ اگر کسی نے کسی کو خسی کر دیا تو اس پر وہی تاوان واجب ہوتا ہے جو ایک آدمی کے قتل پر واجب ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام شرف الدین موسیٰ مقدسی حنبلی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی دیت واجب کرنے والی چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اور شل ہو جانے والے اعضاء کا اور وہ یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں، مرد کا آلہ تناسل، چھاتی وغیرہ کی منفعت فوت ہو جائے تو تاوان واجب ہوگا۔

اس سلسلہ میں عام طور پر یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اختصاء اور نس بندی میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ آپریشن میں اشتہاء و قوت جماع باقی رہتی ہے، صرف قوت تولید ختم ہو جاتی ہے اور اختصاء میں نہ شہوت رہتی ہے اور نہ جماع پر قدرت۔

یہ اعتراض غلط ہے۔ اس لئے کہ قوت جماع کا ختم کرنا اور قوت تولید کا ختم کرنا، یہ دونوں بجائے خود دو مستقل جرم ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اختصاء میں یہ دونوں چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ فقہاء رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے اس سلسلہ میں جو اصول بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی منفعت کو ختم کر دینا حرام اور موجب دیت ہے چاہے اس کا تعلق جماع سے ہو یا تولید سے۔ علامہ علاء الدین کا سانی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

وہ صورتیں جن میں مکمل دیت واجب ہوتی ہے ان میں دو باتوں پر غور کرنا ہے، ایک سبب اور دوسرے شرائط۔ دیت کے واجب ہونے کا سبب اس نفع سے مکمل محرومی ہے جو کسی عضو کا مقصود ہوتا ہے، نفع کا فقدان اور محروم ہونا دو صورتوں میں ہوگا: ایک تو یہ کہ عضو کو جسم سے علاحدہ کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ عضو تو باقی رہے لیکن اس سے جو کام لیا جانا مقصود ہو وہ اس کام کے لائق نہ رہے۔

آگے خود علامہ کا سانی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسی زمرے میں یہ صورت بھی آتی ہے کہ کسی کا آلہ تناسل تو باقی رہے مگر توالد و تناسل کی قوت برباد کر دی جائے۔ یہ جزئیہ موجودہ نسبندی پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

غرض کہ نسبندی جو مرد و عورت کی قوت تولید کو دائمی طور پر ختم کر دینے کا ذریعہ ہے قرآن و حدیث کی رو سے ایک غیر اسلامی طریق کار ہے اور اس کے ناجائز و حرام ہونے پر سمجھوں کا اتفاق ہے۔

فطری ضبط تولید

حیض (MENCESS) کے بعد طبی تحقیق کے مطابق کچھ ایام ایسے ہوتے ہیں جن میں عورتوں کو حمل نہیں

ٹھہرتا، کسی مصنوعی ذریعہ کے استعمال کے بغیر اگر خاص کر ان ہی دنوں میں آدمی اپنی بیوی سے جنسی تعلقات قائم کرے اور جن ایام میں استقرارِ حمل کا امکان ہو ان میں جنسی تعلقات سے احتراز کیا جائے تو فطری طور پر بچوں کی پیدائش پر روک لگ جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ یہ طریق کار اختیار کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

میرے خیال میں بجائے خود اس طرزِ عمل میں تو کوئی قباحت نہیں ہے کہ آدمی بعض ایام میں بیوی سے ملے اور بعض ایام میں نہ ملے، البتہ اب اس شخص کی نیت پر یہ صورت موقوف رہے گی۔ اگر وہ غیر ارادی طور پر ایسا کر گزرا یا کسی جائز مقصد کے لئے ایسا کر گزرا تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اگر معاش کا بے جا خوف یا کوئی دوسرا غیر شرعی جذبہ کارفرما ہو تو ظاہر ہے اس صورت کا اختیار کرنا بھی ایک غیر شرعی طریقہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”انما الاعمال بالنیات“ (تمام اعمال کا دار و مدار نیت اور ارادہ پر ہے۔)

نشہ آور دواؤں کے استعمال کے بعد طلاق

اگر کسی شخص نے یہ جانے بغیر کسی نشہ آور شے کا استعمال کر لیا کہ وہ نشہ آور ہے یا دوا کھالی جس سے نشہ پیدا ہو گیا پھر ہوش و حواس جاتا رہا۔ اسی حالت میں طلاق دے دی تو طلاق واقع نہ ہوگی۔

شیخ عبدالرشید بخاری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی (متوفی ۵۴۲ھ) لکھتے ہیں:

”ذکر عبدالعزیز الترمذی قال سئلت أبا حنیفہ و سفیان عن رجل شرب البنج فارتفع الی رأسه فطلق امراته قالا إن کان حین یشرب یعلم انه ماہی فہی طالق وان لم یعلم لم تطلق ولو ذهب عقله من دواء لا تطلق“^۱

ترجمہ: ”عبدالعزیز ترمذی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ذکر کیا کہ میں نے امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی سے بھنگ پینے والے کے بارے میں دریافت کیا جس کے دماغ تک اس کا اثر پہنچ جائے اور وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے، ان حضرات نے جواب دیا کہ اگر اس نے یہ جاننے کے باوجود پیا کہ وہ کیا ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر اس سے واقف ہی نہ تھا تو طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر کسی دوا کے استعمال کی وجہ سے عقل چلی گئی تو بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔“

اسی سے ان دواؤں کے بعد نشہ کی حالت میں طلاق دینے کا حکم معلوم ہو گیا جس میں الکحل ہو۔

^۱ ضبط ولادت کی فقہی حیثیت پر تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ”فیملی پلاننگ اور اسلام“ اور مسئلہ کے تجرباتی اور عقلی پہلو پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ”ضبط ولادت اور اسلام“
^۲ خلاصہ الفتاویٰ: ۷۵/۲

بلڈ پریشر کی حالت میں طلاق

بعض لوگ بلڈ پریشر کے مریض ہوتے ہیں۔ جب بی پی بڑھتا ہے تو دماغی کیفیت غیر متوازن ہو جاتی ہے، تو اگر واقعی کوئی شخص مرض کی وجہ سے عقلی توازن سے محروم ہو جائے اور ماہر و معتبر ڈاکٹر اس کی تصدیق کریں تو اس حالت میں دی گئی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے حالت جنون کی طلاق پر گفتگو کرتے ہوئے جنون کے اسباب کا بھی ذکر کیا ہے، اور من جملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ”وأما خروج مزاج الدماغ عن الاعتدال بسبب خلط أو آفة.“^۱

طلاق بذریعہ ٹیلی فون یا ٹیلی گرام

طلاق کے لئے بیوی کی موجودگی ضروری نہیں۔ وہ جس وقت اور جہاں بھی بیوی کی طرف نسبت کر کے طلاق کے الفاظ کہہ دے یا لکھ دے، طلاق واقع ہو جائے گی اس لئے اگر کوئی شخص ٹیلی فون سے یا تار کی وساطت سے طلاق دے دے، تب بھی طلاق واقع ہو جائے گی، البتہ محض فون کی آواز یا ٹیلی گرام کی تحریر اس کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ دو آوازوں میں کافی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ تار میں تو خود اس شخص کی تحریر بھی نہیں ہوتی بلکہ ایک تیسرے ہی شخص کی تحریر ہوتی ہے اور اس کا کوئی تیقن بھی نہیں ہوتا کہ جس کی طرف یہ تحریر منسوب ہے، واقعی اس کے حکم سے لکھی گئی ہے نہ محکمہ پوسٹ و ٹیلی گرام اس کی تحقیق ہی کرتا ہے کہ جو شخص یہ ٹیلی گرام کر رہا ہے کیا یہ واقعی اس نام کا آدمی ہے۔

اس لئے محض فون یا ٹیلی گرام سے طلاق ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر شوہر کو انکار ہو کہ اس نے فون نہیں کیا تھا یا تار نہیں دیا تھا تو اب طلاق واقع نہ ہوگی۔ عورت کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اپنا نفس مرد کے حوالے کر دے۔ مرد اگر جھوٹ بول رہا ہے تو عند اللہ سخت گنہگار ہوگا اور زانی قرار پائے گا۔ ہاں اگر مرد کو خود ہی اقرار ہو یا دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں موجود ہوں جو اس بات کی شہادت دیں کہ انہوں نے خود مرد کو فون کرتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے یا ٹیلی گرام کراتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے تو اب شرعی اصول کے مطابق طلاق ثابت ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

زیباش و آرائش

خضابی کنگھی کا استعمال

حضور ﷺ نے بالوں کے لئے خضاب کے استعمال کو پسند فرمایا ہے، بالخصوص اس لئے بھی کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں یہود و نصاریٰ خضاب نہیں لگاتے تھے۔..... لیکن سیاہ خضاب کا استعمال ناپسند فرمایا ہے۔ فتح مکہ کے موقع سے حضرت ابو بکر صدیق رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے والد حضرت ابو قحافہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ لائے گئے جن کے ڈاڑھی اور سر کے بال بالکل سفید ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ کسی خضاب سے ان کا رنگ بدلا جائے، البتہ سیاہ خضاب کے استعمال سے پرہیز کیا جائے ”اجتنبوا السواد“..... ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ سیاہ خضاب لگانے والے جنت کی بو سے بھی محروم ہوں گے۔..... مہندی اور زرد رنگ کے خضاب کو آپ ﷺ نے پسند فرمایا ہے..... اس لئے فقہاء احناف رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے سیاہ خضاب کے استعمال کو مکروہ قرار دیا ہے: ”ویکرہ الخضاب بالسواد“..... سیاہ خضاب کے مذموم ہونے پر تمام ہی فقہاء رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ متفق ہیں: ”اتفقوا علی ذم خضاب الراس او اللحية بالسواد“..... اور صرف مجاہدین کے لئے اس کی اجازت دی ہے تاکہ دشمنوں پر رعب رہے، بعض اور حضرات نے نو عمر بیوی کی رعایت کرتے ہوئے بھی اس کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔ ان ہی میں امام ابو یوسف رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ بھی ہیں۔..... اسحاق بن راہویہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے بیوی کو اجازت دی ہے کہ وہ شوہر کے لئے آرائش کے طور پر خضاب لگا سکتی ہے۔ ”ورخص فیہ اسحاق للمرأة تتزین بہ لزوجھا۔“

جو حکم سیاہ خضاب کا ہے وہی سیاہ خضابی کنگھی کا ہے جو اس زمانہ میں ایجاد ہوئی ہے جس طرح دوسرے رنگ کے خضابوں کا استعمال درست ہے اسی طرح اسی رنگ کی خضابی کنگھی کا استعمال بھی درست ہوگا۔

۱۔ ترمذی عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۳۰۵/۱ باب ماجاء فی الخضاب، بخاری عن ابی ہریرہ: ۸۷۵/۲ باب الخضاب، نسائی عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۲۷۷/۲ باب الاذن بالخضاب

۲۔ مسلم عن جابر: ۱۹۹/۱ باب استحباب الشیب بصفرة وحمرة وتحريمه بالسواد

۳۔ ابو داؤد عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۵۷۸/۲ باب ماجاء فی خضاب السواد

۴۔ ابو داؤد عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۵۷۸/۲ باب، ماجاء فی خضاب السواد

۵۔ المغنی: ۶۷/۱ ۶۔ شرح مہذب: ۲۹۴/۱ ۷۔ الفتاویٰ الہندیہ: ۳۵۹/۵ ۸۔ المغنی: ۶۷/۱

رنگین کریم

مہندی کا استعمال عورتوں کے لئے نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ بہتر اور پسندیدہ ہے..... البتہ مردوں کو اس کی ممانعت ہے۔ امام نووی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”وہو حرام علی الرجال الا لحاجة التداوی ونحوہ.“^۱

تَرْجَمَہ: ”اس کا استعمال مردوں کے لئے حرام ہے سوائے اس کے کہ دوا وغیرہ کے لئے اس کی ضرورت پڑ جائے۔“

چنانچہ حضور ﷺ نے مردوں کو اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ وہ اپنے بدن میں زعفران ملیں ”ان یتزعفر الرجل“..... یہاں تک کہ فقہاء رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی نے اس بات کو بھی نامناسب قرار دیا ہے کہ کم سن بچوں کو مہندی لگائی جائے۔

”لا ینبغی للصغیر أن یخضب یدہ بالحناء لانه تزین وأنه یباح للنساء دون الرجال.“^۲

تَرْجَمَہ: ”نابالغ بچے کو بھی ہاتھ میں مہندی لگانا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ یہ آرائش ہے جو صرف خواتین کے لئے جائز ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھ پاؤں، ہونٹ، رخسار وغیرہ پر کسی خاص قسم کے رنگین کریم کا استعمال عورتوں کے لئے تو درست ہے مردوں کے لئے نہیں۔

عورتوں کا بال تراشنا

آج کل عورتوں کے بال تراشنے کا عام رواج سا ہو گیا ہے، فقہاء رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے کیوں کہ اس میں مردوں سے تشبیہ، اور مماثلت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ علامہ حنفی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”قطعت شعر رأسها اثم ولعنت زاد فی البزازیة وان باذن الزوج، لانه لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق ولذا یحرم علی الرجل قطع اللحیتہ والمعنی الموثر التشبه بالرجال.“^۳

^۱ ابو داؤد عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۵۷۴/۲ باب فی الخضاب للنساء

^۲ بخاری عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۸۶۹/۲ باب التزعفر للرجل

^۳ درمختار علی هامش الرد: ۲۶۱/۵

^۴ شرح مہذب: ۲۹۴/۱

^۵ خلاصۃ الفتاوی: ۳۷۳/۴

تَرْجَمًا: ”عورت اپنے سر کے بال کاٹے تو گناہ گار اور قابل لعنت ہوگی، بزاز یہ میں اس کا بھی اضافہ ہے: اگرچہ شوہر کی اجازت سے کاٹا ہو کہ اللہ کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی بات ماننا جائز نہیں۔ اسی لئے مردوں پر ڈاڑھی کا کاٹنا حرام ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس میں مردوں سے تشبہ و مماثلت ہے۔“

البتہ اگر طبی مقصد کے تحت بال تراشایا مونڈانا پڑے تو اس کی گنجائش ہے۔^۱

مصنوعی بالوں کا استعمال

ہمارے زمانہ میں خواتین میں بالوں کے جوڑے کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ یہ ناجائز اور نادرست ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے:

”ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن الواصلة والمستوصلة.“^۲

آپ نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی پر لعنت کی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاویہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ آخری دفعہ مدینہ تشریف لائے خطاب فرمایا اور اسی درمیان بالوں کا ایک گچھا نکالا اور فرمایا: میں سمجھتا ہوں یہودیوں کے سوا کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ حضور ﷺ نے اس کو یعنی بال جوڑنے کے فیشن کو فریب قرار دیا ہے..... یہاں تک کہ ایسی نوجوان لڑکیوں کے لئے اس کی اجازت چاہی گئی جن کی شادی ہونی تھی اور بیماری کی وجہ سے ان کے سر کے بال گر گئے تھے لیکن حضور ﷺ نے پھر بھی سختی سے منع فرمایا۔

ہاں اگر دھاگوں یا کپڑوں کا استعمال اس کے لئے کیا جائے جیسے ربن، چوٹی وغیرہ تو اس کی اجازت ہے۔ چنانچہ ابوداؤد میں سعید بن جبیر رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے مروی ہے: لا بأس بالتوامل..... فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”وصل الشعر بشعر الادمی حرام سواء كان شعرها أو شعر غیرها كذا فی الا

ختیار شرح المختار ولا بأس للمرأة أن تجعل فی قرونها وذوائبها شیئا من

النوبر كذا فی فتاویٰ قاضی خان.“^۳

^۱ دیکھئے: بزاز یہ علی ہامش الہندیہ: ۳۷۱/۶، ہندیہ: ۳۵۸/۵

^۲ بخاری عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۸۷۸/۲ باب الوصل فی الشعر

^۳ بخاری عن معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۸۷۹/۲ باب الوصل فی الشعر

^۴ بخاری عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما: ۸۷۹/۲ باب الوصل فی الشعر

^۵ ابوداؤد: ۵۷۴/۲ باب فی صفة الشعر ^۶ الفتاویٰ الہندیہ: ۳۵۸/۵، کتاب الکراہیۃ، الباب التاسع عشر

تَرْجَمًا: ”بالوں کے ساتھ آدمی کے بال جوڑنا حرام ہے، چاہے خود اس کے (علاحدہ شدہ) بال ہوں یا کسی دوسری خاتون کے ہاں، عورتوں کے لئے اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے کہ اپنے جوڑوں میں جانوروں کے بال کا کچھ حصہ رکھ لیں۔“

علامہ ابن قدامہ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے بھی بال جوڑنے کی ممانعت پر روشنی ڈالتے ہوئے کسی اور چیز کے استعمال کی اجازت دی ہے:

”والظاهر ان المحرم انما هو وصل الشعر بالشعر لما فيه من التدليس واستعمال المختلف في نجاسته، وغير ذلك لا يحرم لعدم هذه المعاني فيها وحصول المصلحة من تحسين المرأة لزوجها من غير مضرة.“^۱

تَرْجَمًا: ”ظاہر ہے کہ دراصل بالوں کو بال سے جوڑنا حرام ہے کہ ایک تو اس میں دھوکہ دہی ہے، دوسرے ایک ایسی چیز کا استعمال کرنا ہے جس کے ناپاک ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ اس کے علاوہ دوسری صورتیں حرام نہیں کہ ان میں حرمت کی یہ علت موجود نہیں اور کسی ضرر کے بغیر یہ مصلحت بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ عورت شوہر کے لئے اپنے کو آراستہ و پیراستہ کر لے۔“

بھوس باریک کرنا

اس زمانے کے فیشن میں ایک یہ بھی ہے کہ خواتین مصنوعی طور پر اپنی بھوؤں کو باریک ظاہر کرنے کی غرض سے کناروں سے اس کے بال مونڈتی یا اکھاڑتی ہیں اور اسے بہ تکلف آراستہ کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درست نہیں ہے۔ حضور ﷺ کی زبان سے چہرہ کے بال نوچنے والی اور اس کام میں مدد لینے والی عورت پر لعنت منقول ہے:

”لعنت الواصلة والمستوصلة والنامصة والمتنمصة.“^۲

ہاں امام ابو یوسف رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی سے اس طرح بھوؤں کے بال اکھاڑنے کی اجازت منقول ہے کہ چہرہ ہجڑوں کی طرح نہ ہو جائے۔

”لابأس بأخذ الحاجبين وشعر وجهه مالا يتشبه بالمخنث.“^۳

حسن کے لئے اعضاء کی سرجری

اسلام کا نقطہ نظریہ ہے کہ جسم اللہ کی امانت اور اس کا پیکر اللہ کی تخلیق کا مظہر ہے جس میں کسی شرعی اور فطری

^۱ المغنی: ۶۸/۱ ^۲ مسلم عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۲/۲۰۵ باب تحريم فعل الواصلة

والمستوصلة الخ ^۳ الفتاویٰ الہندیہ: ۵/۳۵۸

ضرورت کے بغیر کوئی خود ساختہ تبدیلی درست نہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مصنوعی طور پر بال لگانے کو بصورتی کے لئے دانتوں کے درمیان فصل پیدا کرنے کو ناجائز، قابل لعنت اور اللہ کی خلقت میں تغیر قرار دیا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ محض زینت اور فیشن کی غرض سے اس قسم کا کوئی آپریشن اور جسم میں کوئی تغیر قطعاً درست نہ ہوگا جیسا کہ آج کل ناک، پستان وغیرہ کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے:

”لعن اللہ الواشمات والمستوشمات والمتنمصات.“^۱

ترجمہ: ”اللہ کی لعنت ہو گوندنے اور گوندوانے والی اور بالوں کو اکھاڑنے والیوں پر۔“

نیز حضرت ابوریحانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

”ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم الوشر.“^۲

”آپ ﷺ نے دانتوں کو نوک دار بنانے سے منع فرمایا۔“

دانتوں کے درمیان تھوڑے فصل کو حسن سمجھا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے خواتین مصنوعی طور پر ایسا کیا کرتی تھیں، اس کی ممانعت کی گئی۔ روایت میں ہے:

”لعن المتفلجات للحسن المغيرات خلق اللہ.“^۳

ترجمہ: ”حسن و جمال کے لئے دانتوں کے درمیان مصنوعی فصل پیدا کرنے والی خدا کی تخلیق میں

تغیر پیدا کرنے والی عورتوں پر لعنت ہو۔“

ہاں اگر عام فطرت کے خلاف کوئی عضو زیادہ ہو گیا مثلاً پانچ کی بجائے چھ انگلیاں ہو گئیں تو آپریشن کے ذریعہ ان کو علاحدہ کیا جاسکتا ہے:

”إذا أراد الرجل أن يقطع إصبعاً زائدة أو شيئاً آخر..... ان كان الغالب على

من قطع مثل ذلك الهلاك فانه لا يفعل وان كان الغالب هو النجاة فهو في

سعة من ذلك.“^۴

ترجمہ: ”جب آدمی زائد انگلی یا کسی دوسری چیز کو کاٹ دینا چاہے تو اگر غالب امکان اس کے کاٹنے

کی وجہ سے ہلاکت کا ہو تو ایسا نہ کرے اور اگر غالب امکان بچ جانے کا ہو تو اس کی گنجائش ہے۔“

^۱ بخاری کتاب اللباس، باب المستوشمة ۲۸۱/۲ نسائی: ۳۵/۴ ۱۳۴/۱۵

^۲ مسلم عن عبد اللہ: ۲۰۵/۲ باب تحریم فعل الواصلة الخ ۳۶۰/۵ الفتاویٰ الہندیہ:

بالوں کی صفائی کے لئے کریم وغیرہ کا استعمال

آج کل بعض کریم اور صابن خاص اس مقصد کے لئے بنائے جاتے ہیں کہ ان کے ذریعہ جسم کے فاضل اور غیر ضروری بال صاف کر دیئے جائیں۔ زیر ناف وغیرہ کے بالوں کے لئے ان کے استعمال میں کچھ مضائقہ نہیں۔ جیسا کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے چونا استعمال کرنے کی اجازت دی ہے:

”ولو عالج بالنورة في العانة يجوز.“^۱

ترجمہ: ”اگر موئے زیر ناف میں چونے سے کام لے تو جائز ہے۔“

غرض اصل مقصود بال کی صفائی ہے نہ کہ اس کے لئے استعمال ہونے والے ذرائع اور سامان۔

آرنگ نتھ وغیرہ کے احکام

اسلام نے زیب و زینت کے معاملہ میں اعتدال اور میانہ روی کی راہ اختیار کی ہے۔ اس نے ایک طرف زیبائش کے لئے غیر معمولی اور بے جا تکلف سے بھی منع کیا ہے اور دوسری طرف ایک خاص حد میں اس کی اجازت بھی دی ہے۔ چنانچہ نتھ اور آرنگ وغیرہ پہنانے کے لئے بچیوں کی ناک اور کان میں سوراخ کرنا درست ہے:

”لا بأس بثقب أذن من البنات.“^۲

اور ظاہر ہے جب یہ درست ہوگا تو ان کا استعمال بھی جائز ہوگا۔

اسی طرح بالوں میں خوبصورتی کے لئے چاندی، سونے یا کسی دھات کے کانٹے پھول وغیرہ بھی لگانے کی اجازت ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”لا بأس للنساء بتعليق الخرز من شعورهن من صفرو ونحاس وحديد ونحوها للزينة.“^۳

ترجمہ: ”عورتوں کے لئے ازراہ زینت اپنے بال پر پیتل، تانبے، لوہے وغیرہ کے ٹکینے لگانے میں کوئی حرج نہیں۔“

گھڑی کس ہاتھ میں باندھی جائے؟

گھڑی ایک سامان زینت بھی ہے اور ضرورت بھی۔ عہد رسالت میں اس کی بہترین نظیر انگلیٹھی ہے جس

^۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۳۵۷، ۵۸/۵ کتاب الکراہیۃ ^۲ خلاصہ الفتاویٰ: ۴/۳۷۷ ^۳ فتاویٰ عالمگیری: ۳۵۹/۵

میں زینت کا پہلو بھی موجود تھا اور وہ ضرورت بھی تھی کہ سلاطین مملکت کو خطوط روانہ کرتے وقت اسی سے مہر لگائی جاتی تھی۔ حضور ﷺ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنی ہے جس کے راوی حضرت انس اور عبداللہ بن جعفر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں..... اور بائیں ہاتھ میں بھی، جس کی روایت حضرت انس اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے۔

اس لئے گھڑی دونوں ہی ہاتھ میں باندھی جاسکتی ہے۔ مگر چوں کہ اکثر خیر کی چیزوں میں حضور ﷺ نے دائیں سمت کو ترجیح دی ہے اور گھڑی بھی ذریعہ خیر ہے کہ اس سے نماز اور عبادات کے اوقات معلوم ہوتے ہیں اس لئے دائیں ہاتھ میں پہننا زیادہ بہتر ہوگا۔

سونے کی قلعی کی ہوئی گھڑی اور بٹن وغیرہ کے احکام

سونے کی قلعی کی ہوئی چیزوں کا استعمال مردوں کے لئے جائز ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”ولا بأس بتموه السلاح بالذهب والفضة كذا في السراجية.“^۱

ترجمہ: ”ہتھیاروں پر سونا اور چاندی کا پانی چڑھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔“

نیز یہ کہ:

”والتمويه الذی لا یخلص منه شیء لا بأس به بالا جماع ولا بأس بالا نفع بالا

وانی المموه بالذهب والفضة بالا جماع.“^۲

ترجمہ: ”اس طرح سونے چاندی کا پانی چڑھانا کہ اس سے سونے چاندی کے اجزاء کا الگ کرنا

ممکن نہ ہو، اس میں بالاتفاق کوئی حرج نہیں ہے۔ سونے چاندی کے قلعی کئے ہوئے برتنوں سے

فائدہ اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔“

اسی پر قیاس کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ سونے کا پانی چڑھایا ہوا گھڑی کا پٹہ، بٹن وغیرہ کا استعمال درست

ہے۔

سونے چاندی کے بٹن اور گھڑی

شریعت نے چاندی کی انگوٹھی استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس لئے قیاس ہے کہ اس کے بٹن کا

^۱ بخاری عن عبداللہ: ۷۳/۲ باب من جعل فص الخاتم فی بطن کفه ابوداؤد عن علی: ۵۸۰/۲ باب ماجاء فی

التختم فی الیمین والیسار ^۲ مسلم عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابوداؤد عن عبداللہ بن عمر رضی

اللہ تعالیٰ عنہ: ۵۸۰/۲ باب ماجاء فی التختم فی الیمین والیسار

^۳ خلاصۃ الفتاوی: ۳۷۲/۴ کتاب الکراہیۃ ^۴ خلاصۃ الفتاوی: ۳۷۲/۴ کتاب الکراہیۃ

استعمال بھی جائز ہوگا، لیکن سونے کے بٹن کا استعمال درست نہیں گو کہ بعض فقہاء نے اس کی بھی اجازت دی ہے۔ ہندیہ میں ہے

”لا بأس بازرار الديباج والذهب.“^۱

ترجمہ: ”ریشم اور سونے کی گھنڈیوں میں کچھ مضائقہ نہیں۔“

مجھے اس سے اس لئے اختلاف ہے کہ فقہاء نے ازراہ ضرورت ٹوٹے ہوئے دانت کو سونے کے تار سے باندھنے کی بھی اجازت نہیں دی ہے جب کہ وہاں علاج مقصود ہے اور ایک ضرورت موجود ہے، پھر آخر بٹن کے لئے اس کا استعمال کیوں کر روا کیا جاسکتا ہے؟ خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

”يشد الاسنان بالفضة ولا يشدها بالذهب.“^۲

میرے خیال میں یہی حکم گھڑی کا بھی ہوگا کہ سونے کی گھڑی کا استعمال تو مطلق جائز نہ ہوگا اور غالباً ایسی گھڑی کا استعمال بھی کراہت سے خالی نہ ہوگا جس کا کیس چاندی کا ہو اور وہ نمایاں ہو۔ اس لئے کہ انگوٹھی کے علاوہ دوسری استعمالی چیزوں میں بھی چاندی کے استعمال کو فقہاء مکروہ قرار دیتے ہیں:

”وكذا الاكل بملعقة الذهب والفضة وكذا الاكتحال بميل الذهب والفضة.“^۳

ترجمہ: ”سونے اور چاندی کے چمچوں سے کھانا اور ان کی سلاخیوں سے سرمہ لگانے کا حکم بھی اسی طرح ہے یعنی مکروہ ہے۔“

ہاں اگر اس کا کوئی کل پرزہ سونے کا ہو تو درست ہوگا اور چاندی میں تو بدرجہ اولیٰ۔ چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

”ولا بأس بمسامير الذهب والفضة.“^۴

ترجمہ: ”سونے چاندی کی میخوں میں کوئی حرج نہیں۔“

اسی طرح اگر اندر کی مشین سونے اور چاندی کی بنی ہو اور اوپر کا کیس لوہے کا ہو تو بھی اجازت ہوگی اس لئے کہ فقہاء نے لوہے کی انگوٹھی کے حرام ہونے کے باوجود لوہے کی ایسی انگوٹھی کو جائز قرار دیا ہے جس پر چاندی کا غلاف چڑھا ہو:

”لا بأس بأن يتخذ خاتم حديد قدلوى عليه فضة وألبس بفضة حتى لا يری.“^۵

ترجمہ: ”اس میں کوئی حرج نہیں کہ لوہے کی انگوٹھی بنائی جائے جس پر چاندی لپیٹ دی جائے اور

^۱ ہندیہ: ۳۳۲/۵ کتاب الکراہیۃ ^۲ خلاصۃ الفتاویٰ: ۳۷۱/۴ کتاب الکراہیۃ

^۳ خلاصۃ الفتاویٰ: ۳۷۱/۴ کتاب الکراہیۃ ^۴ الفتاویٰ الہندیہ: ۳۳۵/۵ ^۵ رد المحتار: ۳۵۴/۵

اس پر چاندی اس طرح پہنا دی جائے کہ لوہا نظر نہ آئے۔“

سونے چاندی کے قلم

آج کل بعض ایسے قلم بھی بنائے جا رہے ہیں جو مکمل سونے اور چاندی کے ہوتے ہیں یا ان کی نب ان دھاتوں کی ہوتی ہے۔ اس قسم کے تعیشتات اسلام کے مزاج کے خلاف ہیں اور کتب فقہ میں اس سے لکھنے کو ناجائز قرار دیا گیا ہے:

”وَيَكْرَهُ أَنْ يَكْتُبَ بِالْقَلَمِ الْمَتَّخَذِ مِنَ الذَّهَبِ أَوْ الْفِضَّةِ أَوْ مِنْ دَوَاةٍ كَذَلِكَ وَيَسْتَوِي فِيهِ الذَّكْرُ وَالْأُنْثَى“۔^۱

ترجمہ: ”سونے چاندی کے بنے ہوئے قلم یا دوات کی مدد سے لکھنا مکروہ ہے اور اس کراہت میں مرد و عورت دونوں کا حکم یکساں ہے۔“

اصل یہ ہے کہ زیورات کے علاوہ کسی اور کام کے لئے سونا چاندی کا استعمال نہ مرد کے لئے جائز ہے، نہ عورت کے لئے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”لَا خِلَافَ بَيْنَ أَصْحَابِنَا فِي أَنَّ اسْتِعْمَالَ الْإِنْيَةِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ حَرَامٌ وَهُوَ مَذْهَبُ أَبِي حَنِيفَةَ وَمَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَلَا أَعْلَمُ فِيهِ خِلَافًا“۔^۲

ترجمہ: ”ہمارے اصحاب کے درمیان سونے چاندی کے برتنوں کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہی رائے امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی بھی ہے اور میرے علم کی حد تک اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔“

اسٹیل وغیرہ کے برتن

اسلام نے صرف سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرنے سے منع کیا ہے اس لئے کہ یہ بہت زیادہ تعیش اور اللہ کی نعمتوں کا غلط اور ناروا استعمال ہے۔ سونے اور چاندی کے علاوہ کسی بھی دھات کا برتن استعمال کیا جاسکتا ہے:

”وَفِي الْجَوْهَرَةِ وَأَمَّا الْإِنْيَةُ مِنْ غَيْرِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ فَلَا بَأْسَ بِأَكْلِهَا وَالْإِنْتِفَاعِ بِهَا كَالْحَدِيدِ وَالصُّفْرِ..... وَالرِّصَاصِ وَالْخَشْبِ وَالطِّينِ“۔^۳

ترجمہ: ”جوہرہ نامی کتاب میں ہے کہ سونے چاندی کے علاوہ دوسرے برتنوں میں کھانے پینے

^۱ الفتاویٰ الہندیہ: ۳۳۴/۵ ^۲ المغنی: ۵۸/۱ ^۳ رد المحتار: ۲۳۸/۵

اور اس سے نفع اندوز ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جیسے لوہا، پیتل، تانبا، سیسہ، لکڑی اور مٹی۔“
”فاما سائر الانیۃ فمباح اتخاذها واستعمالها سواء كانت ثمینۃ کالیاقوت والبلور والعقیق والصفیر والمخروط من الزجاج أو غیر ثمینۃ کالخشب والخزف والجلود۔“^۱

ترجمہ: ”ہر طرح کے برتن کا بنانا اور استعمال کرنا درست ہے، چاہے قیمتی ہی کیوں نہ ہو جیسے یا قوت، بلور، عقیق، پیتل اور شیشے سے منقش جیسے لکڑی ٹھیکری اور چمڑے۔“
یہاں تک کہ اگر برتن پر سونے اور چاندی کا پانی چڑھایا ہوا ہو تب بھی اس کا استعمال درست ہے بشرطیکہ اس کو منہ سے لگانے کی نوبت نہ آئے:

”ولا بأس بالاکل والشرب من إناء مذهب ومفضۃ إذا لم یضع فاه علی الذهب والفضۃ۔“^۲

ترجمہ: ”ایسے برتن میں کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں ہے جس پر سونے یا چاندی کی قلعی ہو بشرطیکہ اس سے منہ لگانے کی نوبت نہ آئے۔“
اس سلسلہ میں نزوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”وبہ قال أبو حنیفۃ وأحمد وإسحاق وکرہہ الشافعی۔“^۳
ترجمہ: امام ابو حنیفہ، امام احمد اور اسحاق رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی اسی کے قائل ہیں، امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے اس سے منع کیا ہے۔

اسماء الہی وغیرہ کے تمنغے

آج کل شیشے، کانسی وغیرہ کے ایسے تمنغے بنائے جاتے ہیں جن پر اللہ کا نام ہوتا ہے اس کی اجازت ہے جیسا کہ کتب فقہ میں اس قسم کی انگوٹھیوں کو جائز رکھا گیا ہے:

”اتخذ خاتم فضۃ وجعل فصہ من عقیق او فیروز او یاقوت ونقش علیہ اسمہ او اسما من اسماء اللہ تعالیٰ لا بأس بہ۔“^۴

چاندی کی انگوٹھی بنائے اور اس کا نگینہ عقیق، فیروز یا یاقوت کا ہو اور اس پر خود اس کا یا اللہ کا نام نقش ہو تو کوئی حرج نہیں۔

چنانچہ ابراہیم نخعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی انگٹھی پر کندہ تھا: اللہ ولی ابراہیم و ناصرہ۔ اور حضرت مسروق رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی انگٹھی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم۔^۱

قرآن مجید کی آیات کا لکھنا مناسب نہیں۔ چنانچہ امام محمد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے استاد حماد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ان کی انگٹھی پر ”لا الہ الا اللہ“ لکھا ہوا تھا۔ اس اثر کو نقل کرنے کے بعد اپنی جورائے لکھی ہے وہ یہ ہے:

”لا نرى بأساً أن ينقش في الخاتم ذكر الله مالم يكن اية تامة فان ذلك لا ينبغي أن يكون في يده في الجنبات والذي على غير وضوء وهو قول أبي حنيفة.“^۲

ترجمہ: ”ہم اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ انگٹھی میں ذکر الہی نقش ہو، بشرطیکہ مکمل آیت نہ ہو۔ اس لئے کہ مکمل آیت والی انگٹھی کا جنابت اور بے وضو حالت میں رکھنا مناسب نہیں۔ یہی امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے ہے۔“

تانبے پیتل وغیرہ کے مجسمے

تر زمین و آرائش کے مقصد سے تانبے وغیرہ کے مجسمہ بنانے، ان سے گھروں کو آراستہ کرنے اور اس مقصد کے لئے ان کے خریدنے بیچنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ حدیث یہ ہے کہ آج میٹھائیوں کے بھی پتلے بنائے جاتے ہیں یہ تمام صورتیں شرعاً ناجائز اور گناہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو عند اللہ سب سے بڑا معذب قرار دیا ہے جو تصویریں بنایا کرتے ہیں ”اشد الناس عذاباً عند اللہ المصورون“۔..... ہر چند کہ اہل علم کے یہاں بے سایہ تصویروں کی بابت کسی قدر اختلاف بھی ہے لیکن ایسی صورت سازی جو سایہ دار ہو اس کے ناجائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کو یقیناً اس سے بچنا اور احتیاط کرنا چاہئے۔

اسٹیل کی چین

آج کل گھڑیوں میں لوہا اور اسٹیل کی چین کا استعمال عام ہے، یہ جائز ہے گھڑی کی حفاظت کے لئے اس طرح کی چین حاجت کا درجہ رکھتی ہے اور فقہاء کا اصول ہے کہ حاجت بھی بعض اوقات ضرورت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے جس کی وجہ سے ناجائز چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں: ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة“، یہ بات اس پس منظر میں کہی جا رہی ہے کہ آپ ﷺ نے لوہے کی انگٹھی کے استعمال سے منع فرمایا ہے، اگر اس

^۱ امام ابو یوسف کتاب الآثار: ص ۲۳۲ ^۲ امام محمد: کتاب الآثار ^۳ بخاری: ۲/۸۸۰

ممانعت کو ان تمام چیزوں میں وسیع مان لیا جائے جو ہاتھ میں پہنی جائیں تو یہ چین حاجت کی بناء پر اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے اور اگر اس ممانعت کو انگوٹھی ہی کے ساتھ مخصوص سمجھا جائے تو چین کے ممنوع ہونے کی کوئی وجہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ لوہے کی انگوٹھی اور گھڑی کے چین میں ایک اور فرق ہے۔ انگوٹھی میں پورا حلقہ مقصود ہوتا ہے اور گھڑی میں چین مقصود نہیں، بلکہ وہ تابع ہے اور ضمنی حیثیت میں بعض ایسی چیزیں جائز قرار دی جاتی ہیں، جو اصالۃً جائز نہیں ہوتیں۔ اسی کو فقہاء نے لکھا ہے:

”یغتفر فی التوابع مالا یغتفر فی غیرھا۔“^۱

ترجمہ: ”تابع اور ضمنی چیزوں میں بعض ایسی باتیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں جو عام صورتوں میں نظر انداز نہیں کی جاتیں۔“

طب و علاج

اکسرے

اکسرے جو جسم کے اندرونی حصہ کی تصویر ہوتی ہے اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے شریعت میں جس تصویر سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد وہ تصویریں ہیں جن میں صاحب تصویر کی شناخت ہو جائے یہی وجہ ہے کہ ایسی تصویروں کی جن میں سر اور چہرے کی صورت محفوظ نہ رہے۔ ممانعت نہیں ہے..... ظاہر ہے اکسرے کی تصویر کا تعلق چوں کہ جسم کے اندرونی حصہ سے ہوتا ہے اس لئے وہ قابل شناخت نہیں رہتی دوسرے وہ ایک طبی ضرورت بھی ہے اس لئے اس میں کوئی حرج نہیں۔

خون چڑھانا

ایک انسان کا خون طبی ضرورت کی بناء پر دوسرے انسان کے جسم میں چڑھانا اصلاً ناجائز ہے اور فقہاء احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کا اصل فتویٰ تو یہی ہے کہ جو چیزیں ناجائز اور حرام ہوں، ان سے علاج درست نہیں۔ پھر خون کے حرام ہونے کے لئے دو اسباب جمع ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہ ناپاک اور نجس ہے، دوسرے انسان کا جزو

^۱ لا الاشباہ والنظائر لابن نجیم: ۱۲۱ ۲ ابوداؤد عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۵۷۳/۲ باب لا تدخل

الملائکۃ بیتافیہ صورۃ او کلب. ترمذی: ۱۰۸/۲ باب لا تدخل الملائکۃ بیتافیہ صورۃ او کلب

ہے جس سے فائدہ اٹھانا انسانیت کے احترام کے منافی ہے۔ مگر چونکہ اکثر فقہاء رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی نے ضرورت کی بناء پر ازراہ علاج حرام اشیاء کے استعمال کو بھی درست قرار دیا ہے اور قرآن و حدیث کی بھی بعض تصریحات سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ حضور ﷺ نے ازراہ علاج اصحابِ عرینہ کو اونٹ کا پیشاب پینے کی اجازت دی تھی۔..... حضرت عرفجہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو سونے کی ناک بنانے کا حکم دیا جو مردوں کے لئے حرام ہے اور اس کی شدید ممانعت مروی ہے..... اور اضطرار و مجبوری کی حالت میں قرآن نے جان بچانے کی خاطر مردار اور سور کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے جس کا حرام ہونا صریح اور قطعی ہے..... اور علاج کا بھی یہی مقصود ہے۔ اس لئے بعد کو چل کر فقہاء احناف رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی نے بھی حرام اشیاء سے علاج (تداوی بالحرام) کی اجازت دے دی ہے۔ فقہاء متاخرین کی کتابوں میں اس کی بہت ساری نظیریں موجود ہیں۔

بالخصوص خون کے سلسلہ میں تو فقہاء کی صراحت موجود ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ:

”يجوز للعليل شرب الدم والبول واكل الميتة للتداوى اذا أخبره طبيب مسلم أن شفاؤه فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه وإن قال الطبيب يتعجل شفاك فيه وجهان.“^{۱۵}

ترجمہ: ”بیمار کو ازراہ علاج مردار کھلانا اور خون و پیشاب پلانا جائز ہے بشرطیکہ کوئی مسلمان طبیب اطلاع دے کہ اس میں شفاء ہے اور وہ کوئی دوسری مباح چیز نہ پائے جو اس کے قائم مقام ہو..... اگر اس کی متبادل دوا تو موجود ہو لیکن طبیب کہے کہ اس میں جلد شفاء ہوگی تو اس میں دورائیں ہیں، یعنی بعض نے جائز اور بعض نے ناجائز قرار دیا ہے۔“

لیکن اس مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی غور طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا انسان کا خون اس مقصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے یا یہ کہ صرف دوسرے حیوانوں کے خون کے لئے یہ حکم خاص ہے۔ اس سلسلہ میں عام فقہی اصول تو یہی ہے کہ انسان کے جزو سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے اور خون بھی انسان کا ایک جزو ہے لیکن کتب فقہ کی بعض تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عللاً بعض صورتوں میں اس کی اجازت ہے، مثلاً:

”ولا بأس بان يسعط الرجل بلبن المرأة بشربه للدواء.“^{۱۶}

ترجمہ: ”اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ازراہ علاج آدمی کی ناک میں عورت کا دودھ ڈالا یا پلایا جائے۔“

^{۱۵} بخاری: ۸۴۸/۲ عن انس رضى الله تعالى عنه باب الدواء بابوال الابل

^{۱۶} ترمذی: ۳۰۶/۱ عن عبدالرحمان بن عرفجة باب ماجاء في شد الاسنان بالذهب، نسائی عن عبدالرحمان بن

عرفجه رضى الله تعالى عنه: ۲۸۵/۲ باب ماجاء من اصيب انفه هل يتخذ انفا عن ذهب

^{۱۷} البقرة: ۷۳، المائدة: ۳ ^{۱۸} الفتاویٰ الہندیہ: ۳۵۵/۵ ^{۱۹} حوالہ سابق.

دودھ خون کی قریبی نظیر ہے، لہذا ازراہ علاج ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں ڈالا جاسکتا ہے البتہ اس کے لئے درج ذیل شرطیں ہوں گی:

- ۱ خون کے علاوہ کوئی دوسری متبادل دوا نہ ہو جس سے مریض کی جان بچ سکے یا صحت یاب ہو سکے۔
 - ۲ کوئی ماہر طبیب خون کے استعمال کو ناگزیر قرار دے دے۔
 - ۳ محض قوت یا جسمانی حسن میں اضافہ مقصود نہ ہو کہ یہ ضرورت کے درجہ کی چیز نہیں ہے۔
- اسی طرح اگر کوئی ایسی دوا موجود ہے جس کے استعمال سے صحت کا امکان تو ہو مگر اس میں تاخیر کا اندیشہ ہو، اس صورت میں بھی بہتر ہے کہ خون کے استعمال سے بچا جائے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں حرام چیزوں سے علاج کے جائز ہونے اور نہ ہونے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

الکحل

”الکحل“ آج کی زندگی کے لوازم میں ہو گیا ہے، ہو میو پیتھک دوائیں عام طور پر الکحل سے بنتی ہیں۔ ایلو پیتھک کی بھی بہت سی دواؤں میں الکحل شامل ہوتا ہے۔ عطریات اور بعض دوسرے فوائد کے حامل ”اسپرے“ میں بھی الکحل ڈالی جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ الکحل بنیادی طور پر نشہ آور شئی ہے، بلکہ نشہ کی کیفیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ اگر غیر متوازن مقدار میں اس کا استعمال کر لیا جائے تو ہلاکت کا قوی امکان ہے۔

اکثر فقہاء رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک تمام ہی نشہ آور چیزیں شراب یعنی ”خمر“ کا مصداق ہیں، یہی رائے فقہاء حنفیہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی میں امام محمد رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی ہے اور یہی دلائل کے اعتبار سے زیادہ قوی نقطہ نظر ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اس رائے کے مطابق کوئی بھی نشہ آور شئی کم ہو یا زیادہ حرام بھی ہے اور نجاست غلیظہ بھی، نہ اس کا پینا درست ہے اور نہ خارجی استعمال لیکن امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک چار قسم کی شراب ”خمر“ کا مصداق ہیں۔ انگور کی کچی یا پکائی ہوئی شراب اور کھجور یا منقا کی شراب، یہ تو مطلق حرام ہے اور ان کا خارجی استعمال بھی جائز نہیں، لیکن ان کے علاوہ دوسری چیزوں کی شراب اس وقت حرام ہے جب اتنی مقدار میں پی جائے جو نشہ پیدا کر دے، غرض عام فقہاء نے ”خمر“ کی حقیقت میں شراب کے اثر اور نتیجہ کو سامنے رکھا ہے اور ہر نشہ آور چیز کو ”خمر“ قرار دیا ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک ”خمر“ ہونے میں اصل اس کے اجزاء ہیں کہ وہ کن اجزاء سے مرکب ہے۔

موجودہ دور میں جو ابتلاء کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، اس کے تحت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے سے فائدہ اٹھایا جائے اور الکحل کی حد تک اسی رائے پر فتویٰ دیا جائے۔ اس طرح

انگور، کھجور اور منقا کے علاوہ جن نباتات یا کیمیائی اجزاء سے الکحل تیار کیا گیا ہو، اس کی معمولی مقدار (جو نشہ پیدا نہ کر پائے) جائز ہوگی اور ایسے اسپرے جن میں الکحل کا استعمال کیا گیا ہو، نجاست خفیفہ کے حکم میں ہوں گے کہ جس حصہ میں لگایا گیا ہو، اگر چوتھائی حصہ سے کم ہو تو نماز درست ہو جائے گی۔

دواؤں میں الکحل ملی ہوئی ہو تو اس کے استعمال کا جائز ہونا فقہاء کی ان عبارتوں سے بھی ظاہر ہے جن میں ازراہ علاج شراب کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے:

”شرب البنج للتداوی لا بأس به۔“^۱

ترجمہ: ”ازراہ علاج بھنگ پینے میں کوئی حرج نہیں۔“

”هل يجوز شرب القليل من الخمر للتداوی اذا لم يجد شینا يقوم مقامه فیہ وجہان۔“^۲

ترجمہ: ”جب شراب کا کوئی متبادل نہ ہو تو کیا تھوڑی سی شراب دوا کے بہ طور پی جاسکتی ہے؟ اس میں فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی دورائیں ہیں: بعض نے جائز اور بعض نے ناجائز قرار دیا ہے۔“

مصنوعی اعضاء

مصنوعی اعضاء۔ جیسے آنکھ، دانت وغیرہ۔ لگوانے میں کوئی مضائقہ نہیں، خواہ اس کا مقصد علاج ہو یا چہرہ کو بدنمائی سے بچانا، حضرت عرفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے چاندی کی ناک بنوائی مگر اس میں بو پیدا ہوگئی تو آپ ﷺ نے سونے کی ناک بنوانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اسی بناء پر فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی کے دانت لگانے یا دانتوں کی بندش میں اس کے تار استعمال کرنے کی اجازت دی ہے ظاہر ہے کہ آج کل مصنوعی آنکھ اور دانت میں جو کیمیکل استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان کی بابت تو کوئی ممانعت بھی وارد نہیں ہے اور مردوں کے لئے سونا چاندی کے مطلق استعمال اور عورتوں کیلئے بھی سوائے زیورات کے اس کے استعمال کی ممانعت خود احادیث سے ثابت ہے، تو جب باوجود ممانعت کے ان اشیاء کا مصنوعی عضو جزو بدن بنایا جاسکتا ہے تو کیمیائی اجزاء سے مرکب اعضاء کا ان مقاصد کے لئے استعمال تو بدرجہ اولیٰ جائز و درست ہوگا۔

آپریشن

انسان کا جسم اسلام میں ایک قابل احترام چیز ہے اور اس میں بے مقصد کاٹ چھانٹ گناہ ہے، لیکن اگر خود

^۱ خلاصتہ الفتاوی: ۲۰۴/۴ ^۲ ہندیہ: ۳۵۵/۵ ^۳ ترمذی: ۳۰۶/۱ باب ماجاء فی شد الاسنان بالذهب

^۴ دیکھئے بدائع الصنائع: ۱۳۲/۵

جسم انسانی کی حفاظت اور علاج کے لئے اس کی ضرورت پڑ جائے تو اجازت ہے:

”ولا بأس بقطع العضوان وقعت فيه الأكلة لثلا تسرى ولا بأس بشق المثانة اذا كانت فيها حصاة.“^۱

ترجمہ: ”اگر عضو میں سرن پیدا ہو جائے تو اس کے نشوونما کو روکنے کے لئے عضو کو کاٹ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور مثانہ میں کنکری ہو تو اس کو چیرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔“
محض حسن و جمال میں اضافہ کے لئے اعضاء کی سرجری درست نہ ہوگی اس لئے کہ یہ کوئی ضرورت نہیں ہے اور اسلام آرائش و زیبائش کے لئے ان تکلفات کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں اگر پیدائشی طور پر کوئی عضو زیادہ ہو گیا ہو اور اس کو الگ کر دینے میں کوئی خطرہ نہ ہو تو آپریشن کے ذریعہ اس کو الگ کیا جاسکتا ہے:

”إذا أراد الرجل أن يقطع إصبعاً زائدة أو شيئاً آخران كان الغالب على من قطع مثل ذلك الهلاك فانه لا يفعل وان كان الغالب هو النجاة فهو في سعة من ذلك.“^۲

ترجمہ: ”جب آدمی اپنی زائد انگلی یا کوئی دوسرا حصہ کاٹنا چاہے تو اگر اس کی وجہ سے ہلاکت کا غالب اندیشہ ہو تو ایسا نہ کرے اور غالب امید نجات کی ہو تو اس کی گنجائش ہے۔“

پوسٹ مارٹم

پوسٹ مارٹم بھی اگر کسی ضرورت کے پیش نظر ناگزیر ہو جائے تو جائز ہے مثلاً مقدمہ کی تحقیق کے لئے موت کی وجہ معلوم کرنی ہو، یا کوئی شخص اپنا اندرونی عضو ہبہ کر دے اور علماء اس کے جواز کا فتویٰ دے دیں اس لئے اس عضو کو نکالنا ہو وغیرہ..... چنانچہ فقہاء نے اس مردہ حاملہ عورت کا پیٹ چاک کرنے کی اجازت دی ہے، جس کے پیٹ کا بچہ ابھی زندہ ہے تاکہ اس طرح اس کو نکالا جاسکے۔^۳

میڈیکل تعلیم کی غرض سے پوسٹ مارٹم کا جواز قابل غور مسئلہ ہے۔ ایک طرف یہ ضرورت بھی ہے کہ اس طرح اگر تجرباتی تعلیم نہ دی جائے تو طلبہ کے لئے انسانی جسم کی پیچیدہ ساخت کا سمجھنا مشکل ہو جائے گا اور دوسری طرف اسلام میں مردہ کا جو احترام اور انسانیت کی جو تکریم پیش نظر رکھی گئی ہے وہ اس کی اجازت نہیں دیتی اس لئے اس کے لئے پلاسٹک کے مصنوعی اعضاء اور جسم حیوانوں، مینڈک، بندر، بن مانس وغیرہ کے جسمانی تجزیہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

^۱ فتح القدیر: ۱۰۲/۲ و حوالہ سابق

^۲ فتاویٰ عالمگیری: ۱۱۴/۴

^۳ فتاویٰ عالمگیری: ۳۵۶/۵

لیکن اگر یہ اس مقصد کے لئے کافی نہ ہو تو انسانی نعشوں کا پوسٹ مارٹم بھی درست ہے۔ اس لئے کہ اس ایک نقصان سے بڑا اجتماعی اور قومی مفاد وابستہ ہے اور فقہ کا اصول ہے کہ جہاں دو میں سے کسی ایک نقصان سے دو چار ہونا ناگزیر ہو جائے وہاں اہم تر نقصان سے بچنے کے لئے کمتر نقصان کو گوارا کر لیا جائے گا:

”لو كان احدهما اعظم ضررا من الآخر فان الاشد يزال بالاخف.“^۱

دانتوں میں سمنٹ یا چاندی بھروانا

بعض کھوکھلے اور جراثیم خوردہ دانتوں میں سمنٹ اور چاندی وغیرہ بھروائی جاتی ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے چاندی اور سونے کے تاروں سے دانتوں کو باندھنے کی اجازت دی ہے:

”ويشد الاسنان بالفضة ولا يشدها بالذهب وقال محمد لا بأس به“^۲

یہ اس کے لئے واضح نظیر ہے۔

موت میں مددگار دوائیں

بیمار اور معذور افراد کو جن کی زندگی کی توقع نہیں جو ایک طرف خود اذیت میں گرفتار ہیں اور دوسری طرف اہل خانہ پر بوجھ ہیں، انہیں اذیت سے نجات دینے یا خاندان کو ان کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایسی صورت اختیار کرنا کہ وہ جلد مر سکیں جائز ہوگا؟ مثلاً کینسر، طویل سکتہ، فالج وغیرہ۔

اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

① ایسی دواؤں کا استعمال کرنا جو زندگی کو ختم کر دیں۔

② زندگی کو طول دینے والی دواؤں اور معالجہ سے پرہیز۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے کائنات کی کسی شے کا یہاں تک کہ خود اپنا مالک بھی نہیں ہے، اس لئے جس طرح اس کے لئے یہ درست نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی زندگی کے درپے ہو اور اسے ہلاک کر دے یا اس کے جسم کو جزوی نقصان پہنچائے۔ اسی طرح یہ بات بھی روا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاک کر لے اور کسی شرعی مصلحت کے بغیر اپنے کسی حصہ جسم ہی کو ضرر پہنچائے۔ اس کا جسم دراصل اس کے ہاتھوں میں اللہ کی امانت ہے۔ جس کی حفاظت اس کا فریضہ ہے اور جس کا استعمال اس کو حکم خداوندی کے مطابق کرنے کی اجازت ہے مگر اس نوعیت کا تصرف کسی طور پر جائز نہیں ہے۔

یہ طرز فکر بجائے خود اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ایسی مہلک دواؤں کا استعمال جائز نہ

ہوگا۔ چنانچہ روایت میں ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے پہاڑ سے گرا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیا تو وہ دوزخ میں بھی ہمیشہ اسی طرح اپنے آپ کو گراتا رہے گا اور جس نے زہر پی کر اپنی جان دی تو دوزخ میں ہمیشہ اسی طرح پیتا رہے گا اور جس نے کسی دھاردار ہتھیار سے خودکشی کی تو دوزخ میں بھی خود اپنے ہاتھ سے اپنے پیٹ پر وار کرتا رہے گا۔

اس حدیث نے معلوم ہوتا ہے کہ چاہے قتل کے لئے کسی آلہ حادثہ کا استعمال کیا جائے یا آتشیں اسلحہ کا یا کسی مشروب کا ہر ایک خودکشی کے زمرہ میں آئے گا۔ اس طرح وہ دوائیں جو جسم میں داخل ہو کر اعضاء کو کاٹ ڈالتی ہوں ”آلہ حادثہ“ میں، کسی خاص عضو کو اپنی حدت سے جلا دیتی ہوں وہ آتشیں اسلحہ میں اور اس طرح کی تکلیف کے بغیر زہر بن کر ہلاک کر دیتی ہوں جیسے انجکشن اور دوائیں وغیرہ..... ”مشروب زہر“ میں شمار ہوں گی اور حرام ہوں گی۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حدیث میں عام حالات میں خودکشی سے منع کیا گیا ہوگا، لیکن اگر ”شدت اذیت“ کی وجہ سے محض ایک واقعی تکلیف سے بچنے کا ارادہ ہو تو مصلحتاً اس کی اجازت ہوگی۔ مگر دوسری احادیث نے اس مسئلہ کو بھی واضح کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت جناب بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم سے پہلے کی قوموں میں ایک شخص کو زخم تھا، وہ شدت تکلیف سے گھبرا گیا، پھر چھری لی اور اس سے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا اور خون تھم نہ سکا یہاں تک کہ موت آگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے اپنی ذات کے معاملہ میں میرے فیصلہ پر سبقت کی کوشش کی۔

خود عہد رسالت کا واقعہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح منقول ہے:

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی قوم کے ایک آدمی کے ساتھ ہجرت کی، وہ شخص بیمار پڑ گئے اور شدت تکلیف سے گھبرا کر چاقو سے انگلیوں کے پور کاٹ ڈالے۔ ان کے ہاتھ سے بے تحاشا خون بہنے لگا۔ یہاں تک کہ ان کی وفات ہو گئی حضرت طفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو خواب میں اچھی حالت میں دیکھا۔ البتہ ان کے ہاتھ ڈھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ تمہارے رب نے کیا کیا؟ انہوں نے جواب دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرنے کی طفیل مغفرت کر دی۔ حضرت طفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا یہ ہاتھ ڈھکے کیوں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھ سے کہا گیا کہ ہم اس چیز کو درست

نہیں کرتے جسے تم نے خود بگاڑ لیا ہے۔ حضرت طفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔ خداوند ان کے ہاتھوں کو بھی بخش دے۔

یہ تصریحات بتاتی ہیں کہ غیر معمولی جسمانی اذیت اور کلفت سے بچنے کے لئے بھی ایسا طرز عمل اختیار کرنا حرام ہے۔ اس کو آپریشن یا علاجاً بعض اعضاء کی تراش خراش اور جسم سے قطع و برید پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ کسی عضو کو علاجاً کاٹنے میں جسم کے دوسرے حصوں کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنا اور جان بچانا مقصود ہوتا ہے اور اس اہم تر شرعی اور جسمانی مصلحت کے پیش نظر کمتر نقصان کو گوارا کر لیا جاتا ہے جب کہ یہاں مقصود ہی ہلاک کرنا ہے۔ چنانچہ ایک غزوہ کے موقع پر ایک صحابی کا ہاتھ اس طرح کٹ گیا کہ چمڑا لگا ہوا تھا اور ہڈیاں لٹک رہی تھیں۔ نیز اس کی وجہ سے مقابلہ میں دشواری پیش آرہی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچ کر علاحدہ کر دیا..... اس عمل سے اپنے آپ کو ہلاک کرنا مقصود نہ تھا بلکہ اپنے آپ کو دفاع کے قابل بنانا تھا جس میں ان کی جان کی حفاظت مضمّن تھی۔

یہ حکم جب کہ خودکشی کا ہے جس میں انسان خود اپنے جسم اور اعضاء میں تصرف کرتا ہے تو اس صورت میں تو بدرجہ اولیٰ ہوگا جب طبیب کسی دوسرے کے ساتھ ایسا طریقہ اختیار کرے۔ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے تصریح کر دی ہے کہ اطباء کو ان ہی حدود میں رہ کر علاج کی اجازت ہے جو مریض کو صحت مند کرے اور اس کو موت سے بچانے کی کوشش ہو۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”فی الجراحات المخوفة والقروح العظيمة والحصاة الواقعة في المثانة ونحوها
أن قبل قد ينجو وقد يموت او ينجو ولا يموت يعالج و إن قبل لا ينجو أصلاً
لا يداوى بل يترك.“^۱

ترجمہ: ”سنگین اور کاری زخموں اور مثانہ میں ہونے والی پتھریوں اور اس کے مثل میں اگر اطباء کی رائے ہو کہ ممکن ہے بچ جائے اور ممکن ہے مر جائے یا یہ کہ بچ جائے گا مرے گا نہیں تو آلات جارحہ کے ذریعہ علاج کیا جائے گا اور اگر کہا گیا کہ صحت کی کوئی امید نہیں تو ایسا علاج نہیں کرایا جائے گا بلکہ چھوڑ دیا جائے گا۔“

غرض کسی بھی مصلحت کے تحت مریض کی اپنی اجازت سے یا اس کے علم و اطلاع کے بغیر ایسی مہلک دواؤں کا استعمال جائز نہیں اور جہاں تک یہ مصلحت ہے کہ اس کے متعلقین کو اس کی گرانباری سے نجات ملے تو یہ عمل غیر اسلامی ہونے کے ساتھ ساتھ غیر انسانی بھی ہے۔ جس شریعت کا تصور یہ ہے کہ آدمی محض ذریعہ ہے

رزق رساں دراصل خداوندِ قدوس ہے اور جس دین کا پیغمبر کہتا ہو کہ رزق معصوم بچوں، عورتوں اور معذوروں ہی کی وجہ سے ملتا ہے اس میں ایسے تصور کی کیا گنجائش؟

اس کا دوسرا جزویہ ہے کہ اس کا علاج ہی نہ کیا جائے تا آنکہ موت از خود آجائے۔ میرا خیال ہے کہ یہ صورت بھی درست نہ ہوگی۔ آدمی کسی مجبوری سے علاج کرانے پر قادر نہ ہو تو اس کی نوعیت اور ہے اور قدرت کے باوجود اپنی لا پرواہی اور غفلت کی وجہ سے علاج نہ کرائے تو یہ بھی نادرست ہے کہ جسم اللہ کی امانت ہے اور اس کی حفاظت انسان کا فریضہ ہے اور اگر علاج نہ کرانے یا نہ کرنے کی نیت ہی یہ ہو کہ موت آجائے اور مریض ہلاک ہو جائے تو ظاہر ہے کہ یہ ناجائز ہوگا۔ اس لئے کہ گو عملاً اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی ہے جس پر قتل نفس کا اطلاق ہو لیکن اس کی نیت یہی ہے کہ ایک زندہ وجود ہلاک ہو جائے اور یہ بجائے خود ناجائز ہے۔ معالج تو کجا ایک عام انسان کا فریضہ بھی یہی ہے کہ دوسروں کو حتی الوسع موت اور ہلاکت سے بچانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص نماز میں مصروف ہو اور کوئی نابینا کنویں میں گرنے کے قریب ہو تو نماز توڑ دینی واجب ہے۔ اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ اگر کوئی شخص کشتی میں سوار ہو اور کشتی میں آگ لگ جائے اور اس کو امید ہے کہ دریا میں کود جائے تو اس کی جان بچ سکتی ہے تو اس پر کودنا واجب ہوگا..... غرض اپنے آپ کو اور دوسروں کو موت و ہلاکت سے بچانے کی آخری حد تک تدبیر کرنا شرعی فریضہ ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ بیماریوں کا علاج کرایا کرو، بڑھاپے کے علاوہ ساری بیماریاں وہ ہیں جن کا علاج اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیا ہے۔

حرام جانوروں کے روغن اور مرہم

بعض جانور (جن کا کھانا حرام ہے) یا کیڑے مکوڑے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی چربی یا کسی اور چیز کا روغن، مرہم، طلا وغیرہ بنا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اصولی طور پر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جو اشیاء ”نجس بعینہ“ (پورے وجود سمیت ناپاک) ہیں، ان کو نہ کھانا درست ہے اور نہ ان کا خارجہ استعمال، یعنی جسم پر لگانا بھی جائز نہیں۔ جیسے خون، مردار کا گوشت جس میں بہتا ہوا خون بھی پایا جاتا ہو۔ سور، شراب، پیشاب اور پانچخانہ وغیرہ۔ بعض اشیاء وہ ہیں جن کو فقہاء ”نجس لغيرہ“ قرار دیتے ہیں جیسے سور کے علاوہ وہ جانور جن کا کھانا حلال نہیں ہے ایسے کیڑے مکوڑے جن میں بہتا ہوا خون (دم مسفوح) نہیں ہے، ان کا خارجی استعمال جائز ہے۔

لہذا اب ایسے تیلوں اور مرہموں کے احکام حسب ذیل ہوئے:

① ایسے حشرات الارض جن میں بہتا ہوا خون نہ ہو، ان کو تیل وغیرہ میں پکا کر روغن یا مرہم بنایا جائے تو اس

کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲ سور اور کتے کے علاوہ جن جانوروں کا کھانا جائز نہیں، ان کو شرعی طور پر ذبح کر دیا جائے تو گوشت پاک ہو جائے گا۔ اس سے بھی مرہم، روغن بنا کر لگایا جاسکتا ہے۔

۳ حشرات الارض یا ذبح کئے ہوئے جانوروں کے گوشت جلا کر راکھ کر دیئے جائیں تو حقیقت بدل جانے کی وجہ سے وہ اب پاک ہو گئے۔ ان کو کسی اور تیل میں ملا کر بنایا ہو مرہم اور روغن بھی جائز ہے۔

۴ سور، کتا، مردار، بہتے ہوئے خون والے حشرات الارض کو تیل میں پکا کر روغن بنایا جائے تو یہ ناپاک رہیں گے اور ان کا استعمال درست نہ ہوگا۔

یہ احکام عام حالات میں ہیں۔ بالکل اضطرار اور مجبوری کی صورت مستثنیٰ ہے۔ اس وقت تو شریعت ضرورت کے مطابق ناجائز چیزوں کے استعمال کی بھی اجازت دے دیتی ہے۔

بلڈ بینک کا قیام

آج کل جگہ جگہ خون کے بینک قائم ہیں، جہاں باضابطہ خون کی خرید و فروخت کی جاتی ہے..... علماء نے ضرورت علاج کے لئے خون چڑھانے کی اجازت دی ہے لیکن فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

بلڈ بینک اس وقت ایک ضرورت ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ انسان کبھی بھی کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو سکتا ہے اور اسے خون کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ پھر ہر آدمی کا خون ہر آدمی کے جسم کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ بلکہ ضروری ہے کہ اجزاء کے لحاظ سے خون کا گروپ یکساں ہو، اس کے بغیر جسم دوسرے خون کو قبول نہیں کرتا۔ بلڈ بینک پہلے سے مختلف نوعیت کے خون علاحدہ علاحدہ رکھتا ہے، جن سے بہ سہولت مریض کے مناسب حال خون لیا جاسکتا ہے، ہر مریض کے لئے بروقت رضا کارانہ خون دینے والے مہیا ہو جائیں اولاً تو یہی مشکل ہے اور اس سے زیادہ دشوار یہ ہے کہ ان کا خون مریض کے لئے موافق بھی ہو جائے۔ اس لئے ایسے بینک ایک طبی ضرورت بن گئے ہیں اور ”الضرورات تبیح المحظورات“ کے تحت اس کی اجازت دی جانی چاہئے۔

جہاں تک خون خریدنے کی بات ہے تو وہ ازراہ حاجت جائز ہے مگر مسئلہ خون کی فروخت کا ہے، یہ جائز نہیں۔ آپ ﷺ کی صراحت موجود ہے کہ آپ ﷺ نے خون کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ پس خون فروخت کرنے والا گناہ گار ہوگا اور اس کی قیمت اس کے حق میں حرام ہوگی۔

میں اس سلسلہ میں ”مجمع الفقہ الاسلامی“ کے اجلاس ۱۳/ تا ۲۰/ رجب ۱۴۰۹ھ کی قرارداد نقل کرنے پر اکتفا

کرتا ہوں:

”خون کا فروخت کرنا اور اس کا عوض لینا جائز نہیں، صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام فرماتے ہیں تو اس کی قیمت کو بھی حرام کر دیتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے خون کی بیع سے منع فرمایا، تاہم اگر طبی اغراض کے تحت خون چڑھانا ضروری ہو جائے اور بلا عوض حاصل نہ ہو سکے تو چوں کہ ضرورت کی وجہ سے بقدر ضرورت ناجائز چیزیں جائز ہو جاتی ہیں اس لئے ایسی صورت میں خریدار کا معاوضہ دے کر خون حاصل کرنا حلال ہے، اور گناہ معاوضہ لینے والے پر ہے، ہاں ازراہ ترغیب اس کار خیر میں حصہ لینے والے کو بطور انعام و تحفہ کے کچھ دے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں کہ یہ تبرعات کے قبیل سے ہے نہ کہ معاوضات کے۔“^۱

جانوروں پر میڈیکل ریسرچ

مختلف دواؤں کے اثرات اور فائدوں کا تجربہ کرنے کے لئے بسا اوقات جانوروں کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ پہلے ان کے جسم میں ایسے جراثیم داخل کئے جاتے ہیں جو اس بیماری کو پیدا کر دیں۔ پھر ان ممکنہ دواؤں کو ان پر آزمایا جاتا ہے جو ان امراض کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہوں۔ یہ صورتیں جائز ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے جانوروں کو خواہ مخواہ اذیت دینے اور اس کے مشاہدہ کو اپنے لئے سامان تفریح بنانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ لیکن دوسری طرف اس نے یہ تصور بھی پیش کیا ہے کہ کائنات کی تمام اشیاء انسان کے لئے خادم ہیں، اسی لئے جانوروں کی سواری، ان کے گوشت کو غذا، چمڑوں کو لباس اور کسی عضو انسانی کی صحت کے لئے اس کے جسم میں پیوند کاری کی اجازت دی گئی ہے مذکورہ صورتوں میں بھی چوں کہ تفریح اور بے مقصد اذیت رسانی نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی ایک واقعہ اور لازمی ضرورت کے لئے ان سے خدمت لینا اور استفادہ کرنا اصل منشاء ہے اس لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ڈاکٹر کی فیس

ڈاکٹر بعض اوقات دوا نہیں دیتے ہیں، صرف مرض تشخیص کر کے دواؤں کا نسخہ لکھتے ہیں اور اس کی فیس لیتے ہیں، یا وکلاء قانونی مشورے دیتے ہیں اور اس کی فیس لیتے ہیں، شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں، ہر قسم کی خدمت پر بشرطیکہ حرام کی حد میں داخل نہ ہو..... کوئی اجرت متعین کرنا اور لینا درست ہے۔ مشورے دینا ہدایات دینا اور اس کے لئے اپنے دماغ اور علم کا استعمال کرنا بھی ایک خدمت ہے، اس لئے اس کی فیس مقرر کرنا بھی جائز ہوگا۔

خوراک و پوشاک

وہیل مچھلی کا حکم

وہیل مچھلی غالباً وہی ہے جس کو ہمارے علماء بال مچھلی سے تعبیر کرتے ہیں، علامہ دمیری لکھتے ہیں:

”البال سمكة في البحر يبلغ طولها خمسين ذراعاً يقال لها العنبر“^۱

ترجمہ: ”بال (وہیل) سمندر کی ایک مچھلی ہے جس کی لمبائی ۵۰ ہاتھ ہوتی ہے، اس کو عنبر کہا جاتا ہے۔“

اس صراحت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسی مچھلی کو عنبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، عنبر مچھلی کے بارے میں صراحۃً حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم بھی عام مچھلیوں کا ہے، اس کا کھانا حلال ہے اور مچھلی ہونے کی حیثیت سے ذبح بھی ضروری نہیں۔

اس عظیم الجثہ سمندری مچھلی کے سلسلہ میں حدیث میں جو واقعہ آیا ہے اس کا ماہصل یہ ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت جو تین سو آدمیوں پر مشتمل تھی حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں ایک مہم پر تھی، وہ ایسا مقام تھا کہ وہاں خورد و نوش کا سامان میسر نہیں ہوتا تھا، زاد راہ جو اپنے ساتھ لے گئے تھے قریب اکتتم ہو گیا تو امیر العسکر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ جس کے پاس جو کچھ باقی ہوا کر ایک جگہ جمع کر دو، تو جمع شدہ ذخیرہ سے کھجوروں کے صرف دو تھیلے بھرے ہوئے تھے، ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس میں سے ایک ایک کھجور فی کس روزانہ تقسیم کرتے تھے یہاں تک کہ یہ توشہ بھی ختم ہو گیا اور درختوں کے پتے کھا کر گزارا کرنا پڑا، ایک روز دیکھا کہ سمندر کے کنارے پر ایک بہت بڑا جانور مرا پڑا ہے، دور سے وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی معلوم ہوتی تھی، قریب جا کر دیکھا تو وہ ایک مچھلی تھی جسے عنبر کہتے تھے تو ہم نے اٹھارہ دن تک خوب کھایا، پھر جب ہم مدینہ پہنچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ رزق نکالا تھا، کھاؤ اور ہمیں بھی کھلاؤ، بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کچھ گوشت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی پیش کیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا، اسی روایت میں ہے کہ یہ عنبر مچھلی اتنی بڑی تھی کہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس کی دو پسلیاں لے کر قینچی بنا کر کھڑی کر دو پھر

سب سے طویل القامت شخص کو اونٹ پر سوار کر کے اس کے نیچے سے گزارا تو سوار کا سر پیچی سے نہیں لگا۔

میز و کرسی پر کھانا

میز و کرسی پر کھانا جائز ہے، شریعت نے ان معاملات میں وسعت اور فراخی رکھی ہے البتہ مسنون طریقہ کے خلاف ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ٹیک نہ لگانے کا تھا، آپ ﷺ نے خود فرمایا ”لَا آكُلُ مَتَكْنًا“ (میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا ہوں) کرسی اپنی وضع کے لحاظ سے ایسی ہوتی ہے کہ پشت کی جانب ٹیک لگالی جائے، اس طرح ظاہر ہے یہ مسنون طریقہ کے خلاف نشست ہوگی، اور اس لئے بھی کہ احادیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ کھانے کے وقت متواضع ہیئت اختیار کرتے تھے جب کہ کرسی میز پر بیٹھنے سے ایک گونہ ترفع کا اظہار ہوتا ہے، یہی حکم تحت و چوکی پر کھ کر کھانے کا بھی ہے جس کا بعض مقامات پر رواج ہے، حضرت انس رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے مروی ہے کہ:

”ما اكل النبي على خوان ولا في سكرجة. قيل لقتادة على ماياً كلون قال على السفر“^۱

ترجمہ: ”حضور ﷺ نے نہ چوکی پر کھایا نہ طشتری میں، قتادہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے کہا گیا کس چیز پر لوگ کھایا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا دسترخوانوں پر۔“

چمچوں، کانٹوں سے کھانا

چمچوں اور کانٹوں سے کھانا اور بلا ضرورت ان کا بالخصوص کانٹوں کا استعمال کرنا مسنون طریقہ کے خلاف ہے اور ایک گونہ مکروہ ہے، رسول اللہ ﷺ ہاتھوں سے تناول فرمایا کرتے تھے اور کھانے کے اختتام پر انگلیاں چاٹتے بھی تھے، گوشت کاٹنے کے بجائے کھینچ کر کھانے کا معمول تھا۔ آپ ﷺ نے گوشت کے لیے چھری کے استعمال کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا:

”لَا تَقْطَعُوا اللَّحْمَ بِالنَّسَكِينِ فَإِنَّهُ مِنْ صَنِيعِ الْأَعَاجِمِ وَانْهَشَوْهُ فَإِنَّهُ أَهْنَأُ وَأَمْرٌ“^۲

^۱ صحیح بخاری عن جابر، باب احل لكم صيد البحر.

^۲ بخاری عن ابی حنیفہ: ۸۱۲/۲ باب الاكل متکناً

^۳ بخاری عن ابی قتادة: ۸۱۴/۲، باب ما كان النبي واصحابه يأكلون

^۴ مسلم عن كعب بن مالك وجابر: ۱۷۵/۲، باب استحباب لعق الاصابع

^۵ ترمذی عن ابی ہریرہ: ۵/۲، باب ماجاء انهشوا اللحم نهشاً

^۶ ابوداؤد عن عائشہ: ۵۳۰/۲، باب فی اكل اللحم، ابوداؤد اور بیہقی نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

تَرْجَمًا: ”گوشت کو چھری سے نہ کاٹو اس لیے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے، اسے کھینچ کر کھایا کرو، یہ زیادہ لذت اندوز اور خوش ذائقہ ہوگا۔“

ہاں کسی ضرورت کی بنا پر کھائے تو کچھ حرج نہیں۔ روایت میں ہے:

”يَجْتَزُّ مَنْ كَتَفَ شَاةَ فِي يَدِهِ فِدْعَى إِلَى الصَّلَاةِ فَالْقَاهَا وَالسَّكِينِ الَّذِي يَجْتَزُّ بِهَا“^۱

تَرْجَمًا: ”آپ کے ہاتھ میں بکری کا شانہ تھا جسے کاٹ کر کھا رہے تھے نماز کے لئے بلایا گیا تو اس کو اور چھری کو جس سے کاٹ رہے تھے رکھ دیا۔“
اس مسئلے میں زیادہ سختی نہیں برتنی چاہئے۔

جرسی گائے

گائے کی ایک خاص قسم ان دنوں ”جرسی گائے“ کہلاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ گائے کافی مقدار میں دودھ دیتی ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ دودھ کی اس کثرت کی بنیاد یہ ہے کہ خنزیر کے مادہ منویہ کو گائے کے رحم میں آبیار کیا جاتا ہے اور اس سے یہ نسل پیدا ہوتی ہے، بظاہر اس میں تمام خصوصیات گائے ہی کی ہوتی ہیں۔
ایسی گائیں حلال ہیں اور ان کا دودھ بھی پاک اور جائز ہے، فقہاء نے دو جانوروں سے مخلوط جانور کی بابت یا تو ظاہری علامات و خصوصیات کو معیار بتایا ہے اور معلوم ہے کہ اس گائے میں تمام خصوصیات گائے ہی کی جیسی ہے، یا مادہ جانور کو معیار بنایا گیا ہے اور بچہ کو اس کے تابع سمجھا گیا ہے، چنانچہ علامہ کا سانی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”فان كان متولدا من الوحشى والانسى فالعبرة بالامر فان كانت اهلية يجوز والا فلا، حتى أن البقرة الاهلية اذا نزل عليها ثور وحشى فولدت ولدا فانه يجوز أن يضحى به وإن كانت البقرة وحشية والثور أهلياً لم يجز لان الاصل في الولد الامر لانه ينفصل عن الامر“^۲

گوبر میں ابالی ہوئی ہلیدیاں

سنا گیا ہے کہ آج کل ہلدیوں میں رنگ پیدا کرنے کے لیے اس کو گوبر میں ابالا جاتا ہے، تو جس ہلدی کے

^۱ بخاری عن عمرو بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۸۱۴/۲، باب قطع اللحم بالسکین

^۲ بدائع: ۶۹/۵، البحر الرائق: ۱۰۷/۳

بارے میں ایسا کیا جانا معلوم ہو وہ ناپاک ہے اور اس کو کھانا جائز نہیں۔ کیونکہ ابا نے کی وجہ سے گوبر کی نجاست ہلدی میں پیوست ہو جاتی ہے، اس پر فقہاء کے اس صراحت سے روشنی پڑتی ہے کہ:

”قدر طبخ و وقعت فيه نجاسة لم توكل المرقة وكذا لحم اذا كان في حالة الغليان فان لم يكن في حالة الغليان يغسل ويوكل.“^۱

اگر اس ہلدی کا سفوف بنادیا جائے تب تو اس کے پاک اور قابل استعمال ہونے کی کوئی صورت نہیں اور اگر ہلدی کے ڈلے ہوں تو امام ابو یوسف رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک اس کو پاک کرنے کی صورت یہ ہے کہ تین بار اسے اس طرح ابالا جائے کہ ہر بار اسے پہلے ابال کر خشک کیا جائے پھر دوبارہ ابالا جائے اس طرح تین بار ابا نے کے بعد ہلدی پاک ہو جائے گی، اسی پر فتویٰ ہے، علامہ شامی کا بیان ہے:

”والحنطة المنتفخة بالنجس فعند محمد لا يطهر ابدا وعند ابی یوسف ينقع في الماء ثلاثا ويجفف كل مرة والاول اقيس والثاني اوسع اه وبه يفتی.“^۲

جامد نشلی اشیاء کا حکم

نشہ آور اشیاء سیال ہوں یا جامدان کا استعمال حرام ہے، البتہ شریعت میں شراب کی جو سزا مقرر ہے وہ جامد نشہ آور اشیاء پر نہیں ہے، درمختار میں ہے:

”ويحرم اكل البنج والحشيشة هي ورق القنب والا فيون لانه مفسد للعقل ويصد عن ذكر الله وعن الصلوة لكن دون حرمة الخمر، فان اكل شيئا من ذلك لا حد عليه.“^۳

فی زمانہ منشیات ایک وبا بن گئی ہے اور ہزاروں نوجوانوں کی زندگی کی تباہی و بربادی کا سامان بنی ہوئی ہے، پوری دنیا میں اس کی تجارت کے منظم و منصوبہ بند گروپ ہیں، اس لئے یہ حرام تو ہیں ہی ان کے سر باب کے لئے سخت گیری اور عبرتناک سزا مقرر کرنا درست ہے، کیونکہ یہ فقہ کی اصطلاح میں تعزیری جرائم کے قبیل سے ہے اور تعزیر میں حکومت وقت اپنی صوابدید سے جرم کی نوعیت، اس کے شیوع و عموم اور مجرمین کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔

بے سٹم

آج کل کھانے کا ایک یہ طریقہ بھی رواج پا رہا ہے کہ میز پر کھانا رکھ دیا جاتا ہے اور لوگ کھڑے ہو کر اپنے

اپنے برتنوں میں حسب ضرورت اشیاء لے کر کھاتے پیتے ہیں، اس کو بے سسٹم (BAFFAY SYSTEM) کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ غیر اسلامی بھی ہے اور غیر مہذب و ناشائستہ بھی، حدیث کی کتابوں میں تفصیل سے وہ روایات موجود ہیں جن میں حضور ﷺ کے کھانے کی مفصل کیفیت مذکور ہے، ان میں کوئی ایک روایت بھی غالباً ایسی نہیں ہے جس میں آپ سے کھڑے ہو کر کھانا ثابت ہو، بلکہ بعض احادیث میں کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کھڑے ہو کر کھانا بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا، دوسرے اس قسم کی روش کا اصل محرک مغرب کی کورانہ تقلید اور اسلامی تہذیب و تمدن کے سلسلہ میں احساس کمتری ہے، یہ ایک بڑی خطرناک اور مذموم ذہنیت ہے جو اس قسم کے جزوی اور فروعی مسائل کو بھی اپنی جگہ اہم بنا دیتا ہے، یہ ایک نہایت خطرناک اور مذموم مرض ہے جو اسلام پر ایمان و ایقان کو کمزور کرتا ہے اور اپنی تہذیب و تمدن کے معاملہ میں کاسہ لیس کا مزاج بناتا ہے۔

جدید کپڑے

لباس و پوشاک کے معاملے میں اسلام نے بڑی وسعت اور آسانی رکھی ہے اور کسی خاص وضع و طریق کی تحدید و تعیین نہیں کی ہے، اسلام نے اس کے لیے جو حدیں رکھی ہیں وہ یہ ہیں:

①..... لباس ساتر ہو، مردوں کے لیے ستر ناف سے گھٹنوں تک اور عورتوں کے لیے چہرہ اور ہاتھ کو مستثنیٰ کر کے پورا جسم ہے، اور اگر گھر سے باہر نکلیں، تو چہرہ اور ہاتھوں کا حجاب بھی ہے، ایسا لباس ہو کہ وہ ان حصوں کو چھپائے رہے، نیز اتنا گاڑھا اور ڈھیلا ہو کہ جسم کے مستور اعضاء یا ان کی ساخت نمایاں نہ ہونے پائے۔

②..... مردوں کے کپڑے ریشمی، شوخ رنگوں کے نہ ہوں اور نہ مصور کپڑے ہوں، جن پر ذی روح کی تصویر ہو، مصور کپڑے کی ممانعت مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ہے۔

③..... کپڑا اتنا لانا نہ ہو کہ ٹخنوں سے نیچے چلا جائے کہ یہ کبر و تعالیٰ علامت ہے، یہ حکم صرف مردوں کے لیے ہے۔

④..... تشبہ سے اجتناب برتا جائے، تشبہ کی مختلف صورتیں ہیں اور سب ہی درجات کے لحاظ سے کم و بیش مکروہ ہیں، ایک کافروں سے مذہبی شعار کے معاملہ میں تشبہ جیسے زنا اور صلیب وغیرہ یہ تو قطعاً حرام ہے، دوسرے عام لباس میں ان کی مشابہت جیسا کہ رسول اللہ نے صرف عمامہ یا ٹوپی پہننے سے منع فرمایا تھا کہ یہ مشرکین عرب کا طریقہ تھا اور دونوں کے ایک ساتھ استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی تھی، تیسرے فاسقوں،

۱۔ مسلم عن ابی ہریرہ و انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

۲۔ ترمذی، عن رکانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: مگر یہ حدیث قوی نہیں ہے۔

فاجروں کی عام وضع قطع کی مشابہت اور چوتھے مردوں کا خواتین کی طرح اور خواتین کا مردوں کی طرح لباس اختیار کرنا، یہ تمام صورتیں مکروہ ہیں، ان میں پہلے قسم کا تشبہ تو بہر صورت ناجائز ہی رہے گا یہاں تک کہ بعض فقہاء نے اس کو موجب کفر تک قرار دیا ہے لیکن اور دوسری صورتوں میں تشبہ کا حکم اسی وقت تک رہے گا جب تک کہ اس کا عموم نہ ہو جائے اور اس وضع قطع سے خاص انہی لوگوں کی طرف ذہن جائے، جیسا کہ ہیٹ، کوٹ، پیٹ سے ایک زمانہ میں ذہن اس طرف جاتا تھا کہ وہ عیسائی ہے، ساڑی خاص ہندو خواتین کا شعار تھا اور دھوتی اب بھی بہت سے مقامات پر ہندوؤں کا امتیاز ہے، کہ اس کو دیکھ کر ذہن اس کے ہندو ہی ہونے کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

اب ساڑی چونکہ ایک عمومی لباس ہو گیا ہے اس لیے اس کے پہننے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ تشبہ اب باقی نہیں رہا، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”جہاں مسلمان عورتوں کے اپنے لباس میں ساڑھی داخل ہو وہاں جائز ہے، اور جہاں مسلمانوں میں ساڑھی مروج نہ ہو صرف غیر مسلم عورتوں کے لباس میں داخل ہو وہاں مکروہ ہے۔“^۱

انگریزی بال، ہیٹ، کوٹ، پتلون کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ان میں سے ہر چیز تشبہ کے لیے کافی ہے مگر تشبہ کا حکم اسی صورت میں ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اسے دیکھ کر اس شبہ میں پڑ جائے کہ یہ شخص اس قوم کا فرد ہے، مثلاً ہیٹ لگانے والے کو کرٹان سمجھا جائے“

”تو جو چیزیں کہ غیر لوگوں میں بھی عام طور پر استعمال ہونے لگی ہوں مثلاً بوٹ، پتلون، کوٹ تو ان میں تشبہ کی جہت کمزور اور کراہت خفیف رہ جاتی ہے۔“^۲

میں عرض کروں گا کہ مفتی صاحب نے یہ بات اپنے زمانے کے لحاظ سے لکھی ہے، اب اس کے رواج و استعمال میں جو عموم پیدا ہو گیا ہے اور مصر و افریقہ وغیرہ میں جس طرح علماء اور اہل دین بھی اس لباس کو بے تکلف اختیار کرتے ہیں اس نے تشبہ کو ختم ہی کر دیا ہے، البتہ ہندوستان کی حد تک اس میں ایک خفیف سی کراہت اس لیے ہوگی کہ یہ علماء و صلحاء کے لباس اور ان کی وضع کے خلاف ہے، چنانچہ مولانا تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی بھی لندن میں انگریزی لباس کے استعمال کے سلسلے میں جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”میں اس باب میں یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ جس جگہ یہ لباس قومی ہے جیسے ہندوستان میں وہاں اس کا پہننا ”ہن تشبہ بقوم فہو منہم“ میں داخل ہوتا ہے اور جہاں ملکی ہے جس کی علامت یہ ہے کہ وہاں سب تو میں اور سب مذاہب کے لوگ ایک ہی لباس پہنتے ہوں وہاں پہننا کچھ حرج نہیں۔“^۳

^۱ کفایت المفتی: ۱۶۱/۹

^۲ ابوداؤد عن ابی ہریرۃ وابن ابی ملیکہ.

^۳ امداد الفتاوی: ۲۶۸/۴ سوال ۳۴۵ (ترتیب جدید)

^۴ کفایت المفتی: ۱۵۴/۹

امید ہے کہ اوپر ذکر کئے ہوئے ان اصول و احکام کی روشنی میں جدید لباس کی فقہی حیثیت سمجھنے میں سہولت ہوگی، وباللہ التوفیق۔

جن رنگوں کا استعمال مردوں کے لئے ممنوع ہے

شوخی رنگوں کے کپڑوں کا استعمال بطور لباس کے مردوں کے لئے مکروہ ہے اور خواتین کے لیے جائز، فقہاء سے اس سلسلہ میں جو تصریح مذکور ہے وہ یوں ہے:

”وَيَكْرَهُ لِلرَّجُلِ أَنْ يَلْبَسَ الثَّوْبَ الْمَصْبُوغَ بِالْعَصْفَرِ وَالزَّعْفَرَانِ وَالْوَرَسِ كَذَا فِي فَتَاوَى قَاضِي خَانَ وَعَنْ أَبِي حَنِيفَةَ لَا بَأْسَ بِالصَّبْغِ الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ كَذَا فِي الْمُلْتَقَطِ“^۱

ترجمہ: ”مردوں کے لیے مکروہ ہے کہ عصفر، زعفران اور ورس کے رنگ کے کپڑے پہنیں، فتاویٰ قاضی خاں میں امام ابو حنیفہ رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی سے سرخ و سیاہ رنگ کی اجازت منقول ہے۔“^۲ سرخ رنگ کے بارے میں مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

”عصفر و زعفران مردان را حرام است نہ زنان را، بروایت رنگ سرخ مردان را مطلقاً مکروہ است مگر مخطوط مثل سوسی۔“^۳

ترجمہ: ”عصفر و زعفرانی رنگ مردوں کے لیے حرام ہیں نہ کہ عورتوں کو ایک روایت کے مطابق مردوں کو سرخ مطلقاً مکروہ ہے سوائے اس دھاری دار کپڑے کے جو سوسی نامی کپڑے کی مانند ہو۔“

جدید سلک کے کپڑے

آج کل سلک کے مختلف ایسے کپڑے ایجاد ہو گئے ہیں جن میں خاصی چمک پائی جاتی ہے لیکن غالباً ریشم کے بجائے کوئی دوسری چیز ان کپڑوں میں استعمال کی جاتی ہے، اگر یہ صحیح ہے اور کسی دوسری طرح اس میں چمک پیدا کی جاتی ہو تو پہننے میں حرج نہیں، ہاں اگر ریشم ہو تو اس سلسلہ میں حکم یہ ہے کہ:

”يَكْرَهُ لِبَسَ مَا كَانَ لِحِمْتِهِ مِنْ حَرِيرٍ وَسَدَاهُ مِنْ غَيْرِ الْحَرِيرِ فِي غَيْرِ الْحَرْبِ“^۴

ترجمہ: ”ایسے کپڑے کا پہننا عام حالات میں مکروہ ہے جس کا تانا ریشم کا ہو اور بانا ریشم کے علاوہ کسی اور چیز کا ہو۔“

^۱ فتاویٰ عالمگیری: ۳۳۲/۵، فصل فی اللباس و خلاصۃ الفتاویٰ: ۳۶۸/۴، کتاب الکراہیہ، فصل فی اللباس۔

^۲ خلاصۃ الفتاویٰ: ۳۶۹/۴

^۳ ملتقط

^۴ مالا بدمنہ: ص ۱۰۳

ہمارے فقہاء نے ریشم کے بستر وغیرہ بنانے کی اجازت دی ہے، اس کے مطابق اگر ان کپڑوں میں اس مقدار میں بھی ریشم ہو تو چادر وغیرہ کے طور پر ان کا استعمال جائز قرار پائے گا، مگر امام بخاری رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے حضرت حذیفہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے جو حدیث نقل کی ہے، اس میں صراحت ہے کہ حضور ﷺ نے اس پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے (نہانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن لبس الحریر والدیاج وأن یجلس علیہ) اس لیے دل اس کو قبول نہیں کرتا ہے!

تفریحی امور

نغمہ و موسیقی

نغمہ و موسیقی ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو عیش پسند، واقعی مسائل سے غافل اور جذباتی بنادیتی ہیں، اس لیے اسلام اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا، آپ ﷺ نے اس سے دلچسپی لینے سے شدت سے منع فرمایا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس سے دل میں نفاق پیدا ہوتا ہے، اور یہ کہ اس سے حاصل ہونے والی کمائی حرام اور ناجائز ہے۔

اسی طرح وہ آلات جو نغموں کے ساتھ ہم آہنگ کیے جاتے ہیں ان کی بھی آپ نے شدید مذمت فرمائی ہے، حضرت امیر معاویہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے مروی ہے:

”نہی عن ضرب الدف وضرب الزمارة“

ترجمہ: ”آپ ﷺ نے دف اور بانسری بجانے سے منع فرمایا۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے کہ:

”ایاکم واستماع المعازف والغناء“

ترجمہ: ”موسیقی اور آلات موسیقی کو سننے سے خوب بچو۔“

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ دف بجانے کی عمومی اجازت ہے اور ہمیشہ اس سے لذت اندوز ہوا جاسکتا ہے،

۱۔ دیلمی عن ابی ہریرۃ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ ۲۔ کنز العمال عن علی: ج ۱۹۔ ۳۔ طبرانی وبخاری

عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فی ”الادب المفرد“ ۴۔ کنز العمال عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۱۶/۱۹۔

مگر یہ غلط ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ابھی گزرا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دف بجانے سے منع کیا، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے ایک طبقہ پر صورتوں کے مسخ ہو جانے، دھنسا دیئے جانے اور طوفان کا عذاب آئے گا، یہ وہ لوگ ہوں گے جو شراب پیتے ہوں گے، ریشم پہنتے ہوں گے اور دف بجاتے ہوں گے۔ ہاں عید اور شادی کی حد تک احادیث سے اس کے جواز کا پتہ چلتا ہے۔

اب ہمارے زمانے میں جو موسیقی کے آلات ایجاد ہوئے ہیں، ہارمونیم وغیرہ ظاہر ہے کہ ان سے لطف اندوز ہونا حرام اور ناجائز ہے، جو گانے فحش قسم کے ہیں وہ تو ہیں ہی، جو اشعار دینی ہوں، حمد یا نعت کے مضمون پر مشتمل ہوں ان کو بھی ان آلات سے ہم آہنگ کر کے گانا اور سننا جائز نہیں ہے، بلکہ عین ممکن ہے کہ ایک پاکیزہ مضمون کی یہ بے حرمتی مزید اور دہرے وبال کا باعث ہو۔

ٹی وی اور فلم

شراب کو ام الخبائث قرار دیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ فلم ام الفواحش ہے، نشہ برائیوں کی جڑ ہے تو سینما بے حیائیوں کی، فلم اول تو یوں بھی حرام ہے، اس لیے کہ اس میں اکثر ذی روح کی تصویریں ہوا کرتی ہیں، اور تصویر چاہے مجسموں کی صورت میں ہو یا کاغذی اور عکسی ہو، ناجائز ہے، دوسرے آج کل جن مقاصد کے لیے فلموں کا استعمال کیا جاتا ہے وہ معاشرہ کے لیے نہایت سنگین اور بدترین ہیں، فلمیں آج جنسی انار کی اباحت پسندی، لوٹ و غارت گری اور اس قسم کی غیر اخلاقی حرکتوں اور بے شرمی کی باتوں کے لیے موثر درس گاہ بن گئی ہیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ فلم فی نفسہ مباح ہے اس لیے کہ وہ تصویر نہیں ہے جس میں جماؤ ہو بلکہ آتا جاتا ہوا عکس ہے، البتہ اگر اس کا استعمال غلط مقاصد کے لیے کیا جائے جیسا کہ کیا جا رہا ہے تو ناجائز ہوگا۔

میرے خیال میں یہ استدلال صحیح نہیں ہے، پردہ پر آنے والی تصویر یقیناً عکس ہے لیکن اس کا نگینو (NEGATIVE) تصویر ہے۔ اس لیے کہ وہ اس بات کا ذریعہ بنتا ہے کہ اس کو کاغذ پر ایک جی ہوئی تصویر کی شکل میں لے آیا جائے اور ”ذریعہ“ کا حکم وہی ہوتا ہے جو اس سے حاصل ہونے والے مقصود کا فقہ میں اس کی نظیریں بکثرت موجود ہیں۔

ہاں اگر ذی روح کی تصویر کے بغیر بھی کوئی تعلیمی تربیتی فلم بن سکتی ہو یا دفاعی مقاصد کے لیے کوئی فلم لینی پڑے تو اجازت ہوگی، ٹی وی پر ذی روح کی تصویر اگر نگینو لینے کے بعد اس کے ذریعہ نشر کی جائیں تب تو اس کا

حکم تصویر کا ہے اور اگر براہ راست اس طرح ٹیلی کاسٹ کیا جائے کہ فلم بنائی ہی نہ جائے تو یہ عکس ہے، اور اس وقت درست ہے جب کسی خاتون کو سامنے نہ لایا جائے اور نہ غیر اخلاقی مقاصد کے لیے اس کا استعمال کیا جائے۔
ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

کبوتر و پتنگ بازی

حضور ﷺ نے کبوتر بازی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے، کبوتر کے پیچھے دوڑتے ہوئے ایک شخص کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:
”شیطان شیطان کے پیچھے دوڑ رہا ہے، کبوتر بازی ہی پر پتنگ بازی کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے، یہ کراہت عام حالات میں تو ہے ہی اگر اس کے ساتھ جوا اور دوطرفہ شرط بھی ہو تب تو حرام نیز اور بھی سخت گناہ کا باعث ہوگا۔“

ریس و گھوڑ دوڑ

رسول اللہ ﷺ نے گھوڑ دوڑ کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے خود گھوڑ دوڑ کرائی ہے، لیکن اگر اس میں ”قمار“ پیدا ہو جائے تو قمار کی وجہ سے حرام ہے، ریس کی مروجہ صورت جس میں ہر کھلاڑی کو ایک خاص فیس ادا کرنی ہوتی ہے، انعامی رقم سبقت کرنے والے کو ملتی ہے اور دوسروں کی فیس ضبط ہو جاتی ہے، میں قمار پایا جاتا ہے، اس لیے کہ اس طرح ہر شریک ایک مبہم نفع اور نقصان کے درمیان رہتا ہے اور اسی کا نام قمار ہے۔
ہاں اگر مقابلہ کرایا جائے اور کوئی تیسرا شخص انعام دے تو درست ہے، ملک العلماء علامہ کاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”کذا ما يفعلہ السلاطین وهو أن يقول لرجلین من سبق منكما فله کذا فهو جائز“^۱

ترجمہ: اسی طرح اس دوڑ کا حکم ہے جسے بادشاہ کرایا کرتے ہیں کہ دو آدمیوں سے کہتے ہیں تم میں سے جو سبقت لے جائے اس کے لیے یہ انعام ہے تو جائز ہے۔
خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

^۱ ابو داؤد عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۶۷۵/۲ باب فی اللعب بالحمام۔ ^۲ مسند احمد عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ^۳ احکام القرآن للجصاص: ۸۸/۱۔ ^۴ بدائع الصنائع: ۲۰۶/۶۔

”السباق يجوز في أربعة أشياء في الخف يعني البعير وفي الحافر يعني الفرس والنصل يعني الرمي والمشى بالاقدام يعني العدو وانما يجوز ذلك اذا كان البدل معلوماً في جانب واحد بان قال إن سبقتني فلك كذا وأن سبقتك فلا شيء لي عليك أو على القلب اما اذا كان البدل من الجانبين فهو قمار حرام الا اذا أدخل محلاً بينهما فقال كل واحد منهما إن سبقتني فلك كذا وإن سبقتك فلي كذا وأن سبق الثالث فلا شيء له وكذا يجوز أيضاً ما يفعله الآمر وهو أن يقول أيكم سبق فله كذا.“^۱

ترجمہ: ”مقابلہ چار چیزوں میں جائز ہے: اونٹ، گھوڑے، تیراندازی اور پیدل دوڑ میں، اور اس وقت جائز ہے جبکہ بدل ایک جانب سے متعین ہو یا اس طور کہ کہے اگر تم مجھ سے آگے بڑھ گئے تو تمہارے لیے یہ ہے اور اگر میں تم سے بڑھ جاؤں گا تو میرا تمہارے ذمہ کچھ نہ ہوگا، یا اس کے برعکس، لیکن اگر ہر دو جانب سے بدل ہو تو وہ جوا اور حرام ہے، سوائے اس کے کہ کسی تیسرے شخص کو اس مقابلہ میں شریک کر لے جو اس کھیل کو حلال کر دے، اس طرح کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کہے اگر تم مجھ سے بڑھ جاؤ تو تمہارے لیے یہ انعام ہے، اور اگر میں تم سے بڑھ جاؤں تو میرے لیے یہ انعام ہے، اور اگر یہ تیسرا شخص آگے بڑھ گیا تو اس کے لیے کچھ نہیں ہے، ایسے ہی وہ صورت بھی جائز ہے کہ حکم دینے والا ایسا انعام دے اور وہ کہے کہ تم میں سے جو آگے بڑھ جائے اس کے لیے یہ انعام ہے۔“

اس طرح یہ تیسری صورت بھی جائز قرار پائی کہ مقابلہ میں دو سے زیادہ آدمی شریک ہوں اور انعام کی شرط صرف دو آدمی آپس میں رکھیں، دوسرے شرکاء اس قسم کی شرطوں سے مستثنیٰ رہیں۔

شطرنج و چوسر

چوسر اور شطرنج کھیلنا مطلقاً ناجائز ہے چاہے اس میں جوا ہو یا نہ ہو، علامہ ابو عبد اللہ قرطبی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی المائدہ آیت ۹۰ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

”هذه الآية تدل على تحريم اللعب بالنرد والشطرنج قماراً أو غير قمار“^۲
ترجمہ: ”یہ آیت شطرنج اور چوسر کے کھیل کی حرمت کو بتاتی ہے چاہے اس میں جوا ہو یا نہ ہو۔“

چنانچہ احادیث میں بھی مطلقاً شطرنج اور چوسر کی مذمت کی گئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا جس نے چوسر کھیلا اس نے سور کے گوشت اور خون میں اپنا ہاتھ ڈالا، اور یہ کہ اس نے خدا اور رسول (ﷺ) کی نافرمانی کی، اسی طرح شطرنج کھیلنے والوں پر لعنت کی ہے، اور فرمایا کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نگاہ رحمت نہیں ڈالے گا۔

اور اگر اس کے ساتھ جواب بھی ہو تب تو ظاہر ہے کہ یہ گناہ اور بھی سوا ہو جاتا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”وَيَكْرَهُ اللَّعِبَ بِالْشَطْرَنْجِ وَالنَّرْدِ“^۱

ترجمہ: ”شطرنج اور چوسر کھیلنا مکروہ ہے۔“

ہاکی، فٹ بال وغیرہ کھیل کے احکام

کھیلوں (GAMES) کے سلسلہ میں یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام نے اس معاملہ میں نہ بہت تنگ نظری سے کام لیا ہے اور نہ کھلی آزادی دی ہے، بلکہ کچھ خاص شرطوں اور حدود کے ساتھ اجازت دی ہے، وہ شرطیں یہ ہیں:

۱..... پردہ کے شرعی حدود کی رعایت کی جائے، آج کل مرد جس طرح جان گئے پہن کر فٹ بال وغیرہ کھیلتے ہیں اور خواتین مردوں کے سامنے نیم برہنہ فن کا مظاہرہ کرتی ہیں یہ غیر اسلامی ہونے کے علاوہ غیر انسانی بھی ہے، اسلام عورتوں کے لیے اس قسم کے کھیل پسند ہی نہیں کرتا، در دھوپ والا اور مردانہ نوعیت کا ہو، اسی لیے عورتوں کے ذمہ جہاد وغیرہ نہیں رکھا گیا۔

۲..... کھیل میں ایسا مصروف نہ ہو جائے کہ دینی فرائض سے بھی غفلت ہو جائے۔

۳..... ایسی دو طرفہ شرطیں نہ ہوں جس سے جو پیدا ہو جائے، ہاں اگر کوئی تیسرا شخص اپنی طرف سے جیتنے والے کو انعام دے تو مضائقہ نہیں۔

۴..... پھر ان میں وہ کھیل جس سے جسمانی ورزش، تنومندی اور چستی پیدا ہوتی ہو زیادہ پسندیدہ ہیں، جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے گھوڑ سواری، دوڑ اور تیر اندازی کو پسند فرمایا ہے جو جسم میں توانائی اور چستی کا باعث بنتے ہیں۔

ہاکی، فٹ بال، والی بال، بیڈمنٹن وغیرہ ایسے کھیل ہیں جو صحت اور ورزش کے نقطہ نظر سے مفید ہیں، اس لیے اوپر ذکر کی گئی شرطوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان کھیلوں میں کوئی مضائقہ نہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

^۱ مسلم عن سلیمان بن بريدہ: ۲/۲۴۰، باب تحریم اللعوب بالنرد شیر

^۲ دیلمی عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ^۳ دیلمی عن وائلہ

بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ ^۴ الفتاویٰ الہندیہ: ۵/

کرکٹ ایک طویل الوقت کھیل ہے، جو نہ صرف کھیلنے والوں بلکہ تماشہ بینوں اور آنکھوں دیکھا حال سننے والوں کو بھی ایک طرح کے نشہ غفلت میں مبتلا کر دیتا ہے، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ یہ کراہت سے خالی نہیں، فقہاء نے شطرنج کو قمار نہ ہونے کی صورت میں بھی اسی سبب سے مکروہ قرار دیا ہے۔

فوٹو اور تصویر

جہاں تک مجسموں کی بات ہے وہ تو اسلام میں قطعاً ممنوع ہیں لیکن تصویر اور بالخصوص اس کی وہ صوت جو ہمارے زمانے میں فوٹو گرافی کی شکل میں رائج ہے اس کی شرعی حیثیت قابل غور ہے، اس لیے کہ اس سلسلہ میں احادیث، صحابہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ کے آثار اور فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، ہمارے زمانے کے بعض حالات میں اس کی حیثیت ناگزیر ضرورت کی ہو گئی ہے، اس لیے مناسب ہے کہ اس کے احکام ذرا تفصیل سے لکھ دیئے جائیں۔

تصویر کے سلسلہ میں بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مطلقاً ممنوع ہے چاہے ذی روح کی ہو یا غیر ذی روح کی، چنانچہ حضرت ابو طلحہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس گھر میں تصویر ہو، حضرت جابر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے بھی حضور ﷺ کا مطلقاً تصویر سے منع کرنا منقول ہے۔ حضرت عائشہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا سے مروی ہے کہ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ کی خلقت کے ساتھ مشابہت اختیار کریں، یعنی تصویر کی صورت میں خلق خداوندی کی نقل کریں، ظاہر ہے اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ذی روح اور غیر ذی روح مخلوق میں کوئی فرق نہیں کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو کی تصویر کھینچنا نادرست ہے، ایک اور روایت میں اس کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے جس میں تصویر کی ممانعت کے پس منظر میں کہا گیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو اللہ کی طرح تخلیق کا کام کرنا چاہے، اسے چاہئے کہ ایک چیونٹی، ایک جو یا کوئی سادانہ ہی پیدا کر لے۔ اس حدیث میں ”جو“ (شعیرہ) اور ”دانہ“ (حبہ) کا لفظ صاف بتلاتا ہے کہ ان چیزوں کی تصویر کشی بھی ممنوع ہے۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ذی روح کی تصویریں بنانا ناجائز ہے اور غیر ذی روح کی بنائی جاسکتی ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے ایک شخص کو جس کا پیشہ ہی مصوری تھا غیر ذی روح تصویر بنانے کی اجازت دی، ایک اور حدیث میں ہے کہ مصوروں کو قیامت کے دن اپنی تصویروں میں روح پھونکنے کو

۱۔ بخاری عن سالم عن ابیہ: ۸۸۱/۲، باب لا تدخل الملائکۃ بیتا فیہ صورۃ۔ ۲۔ ترمذی عن جابر: ۳۰۵/۱، باب ماجاء فی الصورۃ۔ ۳۔ بخاری عن عائشہ: ۸۸۰/۲، باب ما وطی من التصاویر۔ ۴۔ مسلم: ۲۰۲/۲، باب ان الملائکۃ علیہم السلام لا یدخلون، عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۵۔ مسلم عن ابن عباس: ۲۰۲/۲، باب ان الملائکۃ علیہم السلام الخ

کہا جائے گا اور وہ نہ پھونک سکیں گے، ظاہر ہے کہ روح پھونکنے کی بات ان ہی تصویروں میں کہی جائے گی جو ذی روح کی ہوں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی تصویریں ممنوع ہیں جن کا احترام کیا جائے، تصویروں کا اس طرح ہونا کہ ان کا احترام نہ کیا جائے درست ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا سے مروی ہے کہ ان کے شہ نشین پر ایک پردہ تھا جس پر تصویریں بھی تھیں، حضور ﷺ نے اسے پھاڑ دیا، حضرت عائشہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا نے اس کے دو تکتے بنادیئے، جس پر حضور ﷺ تشریف رکھا کرتے تھے۔ اس حدیث کو ایک دوسری روایت سے بھی تقویت ملتی ہے جس میں آپ نے پردہ پھاڑنے کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ اللہ نے ہمیں پتھر اور مٹی کو کپڑے پہنانے کا حکم نہیں دیا، یہاں حضور ﷺ نے پردہ پھاڑنے کی علت تصویر کو نہیں قرار دیا ہے۔

مصور کپڑے سے تکتے بنالینے کا واقعہ خود حضور ﷺ سے بھی منقول ہے اور اس میں یہ ہے کہ خود حضرت جبریل عَلَیْہِ السَّلَام نے اس طرح تکتے بنانے کے مشورے دیئے تھے۔

اور ایسی حدیث بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجسموں کی حرمت ہے نہ کہ ان تصویروں کی جو کپڑوں پر بنائی جائیں، حضرت ابو طلحہ اور سہل بن حنیف رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا اس کے راوی ہیں ان کے الفاظ ہیں ”الاماکان رقمافی ثوب“ (وہ تصویر درست ہے جو کپڑے میں نقش ہو) یہ حدیث صحیح اور قابل استدلال ہے، چنانچہ امام ترمذی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے، هذا حدیث حسن صحیح۔

اسی طرح تصویر کے سلسلہ میں صحابہ و تابعین کے بعض ایسے آثار بھی منقول ہیں جن سے ذی روح کی تصویر کا جواز معلوم ہوتا ہے، مثلاً حضرت ابوبکر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے پوتے قاسم بن محمد رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے گھر میں بعض عجائب مخلوق کی تصویریں تھیں، امام ابو یوسف رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی وساطت سے دو صحابیوں حضرت عبدالرحمن بن عوف رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ اور براء ابن عازب رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے نقل کیا ہے کہ ان کی انگوٹھی کے نگینوں میں دو شیرنیوں کی تصویریں تھیں، اس طرح کے اور بھی آثار حضرت عروہ، انس بن مالک، حضرت ابو ہریرہ اور ابو موسیٰ اشعری رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم سے منقول ہیں۔

۱۔ بخاری عن ابن عباس: ۸۸۱/۲، باب من لعن المصور

۲۔ بخاری عن عائشہ: ۸۸۰/۲، باب ما وطنی من التماویر

۳۔ مسلم عن عائشہ: ۲۰۰/۲، ان الملنکة لا یدخلون بیتا فیہ صورة ولا کلب

۴۔ ترمذی عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۱۰۸/۲، باب ماجاء فی الصورة.

۵۔ سنن ترمذی: ۳۰۵/۱، باب ماجاء فی الصورة. عن ابی طلحہ وسہل بن حنیف.

۶۔ فتح الباری: ۳۲۶/۱۰. ۷۔ کتاب الآثار: ص ۲۳۲، حدیث نمبر ۱۰۲۸.

فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں گو عموماً تصویر کی مطلقاً حرمت منقول ہے مگر ایسی عبارتیں بھی موجود ہیں جن سے فرش یا بستر وغیرہ میں تصویر کا جواز اور پردہ اور قابل احترام مواقع پر تصویر کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ امام محمد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”ماکان فیہ من تصاویر من بساط یبسط أو فراش یفرش أو وسادة فلا بأس بذلك انما یکرہ من ذالک فی الستر و ما ینصب نصباً وهو قول ابی حنیفہ والعامۃ من فقہائنا۔“^۱

تَرْجَمَہ: ”مصور کپڑے، بستر، فرش یا تکیوں کی طرح استعمال کیے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، یہ پردہ اور ایسی چیزوں میں مکروہ ہے، جسے کھڑا کیا جائے، یہی امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اور ہمارے عام فقہاء کی رائے ہے۔“

فتاویٰ عالمگیری میں بھی صرف ان ذی روح تصویروں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے جنہیں لٹکا یا جائے، یوں مطلقاً تصویر کے بارے میں کوئی صراحت موجود نہیں ہے۔

”ولا یجوز ان یعلق فی موضع شیناً فیہ صورة ذات روح و یجوز ان یعلق ما فیہ صورة غیر ذات روح کذا فی الظہیریۃ۔“^۲

تَرْجَمَہ: ”کسی جگہ ایسی چیز کو لٹکانا درست نہیں ہے جس میں ذی روح کی تصویر ہے، غیر ذی روح کی تصویریں لٹکائی جاسکتی ہیں۔“

جو لوگ تصویر سے منع کرتے ہیں وہ اس کی ایک اہم وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ شرک اور بت پرستی کا باعث بنتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بھی چیز جو شرک کا ذریعہ بنتی ہو اسلام اس کے متعلق بہت حساس ہے اور اس معاملہ میں ادنیٰ مداہنت گوارا کرنے کو تیار نہیں، یہ واقعہ ہے کہ یہ بڑا اہم سبب ہے اور یہ کہنا کہ یہ بات صرف مجسموں کی حد تک پائی جاتی ہے صحیح نہیں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سکھ گرو نانک جی کی اور ہندوؤں کی ایک قابل لحاظ تعداد مہاتما گاندھی جی کی تصویروں کی پرستار ہے اور ان پر اسی طرح پھول کی مالائیں اور جلنثار کرتی ہے جیسا کہ اپنے مشہور بھگوانوں پر۔

اس لیے راقم الحروف کے خیال میں تصویر سے متعلق احکام حسب ذیل ہیں:

①..... ذی روح کے مجسمے بنانا مطلقاً حرام اور ناجائز ہیں۔

^۱ مؤطا امام محمد: ص ۳۸۲، باب التصاویر و الجرس وما یکرہ منها. عن ابی طلحة

^۲ فتاویٰ عالمگیری: ۳۵۹/۵، کتاب الکراہیۃ.

۲..... ایسی تصویریں بھی قطعی طور پر ناجائز ہیں جن کی کسی قوم میں پرستش اور عبادت کی جاتی ہو، جیسے گرو نانک جی اور ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق کرشنارام جی وغیرہ اور عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح اور حضرت مریم کی تصویریں۔

۳..... ذی روح کی تصویروں کو اس لیے بنانا کہ ان کو لٹکایا اور آویزاں کیا جائے یا مقام احترام میں رکھا جائے یا تصویر اس مقصد کے لیے نہ کھینچی گئی ہو مگر اس کا استعمال اسی طرح ہوا کرے، ہر دو صورتیں ناجائز ہیں۔

۴..... عام تصویریں جن میں احترام یا عبادت اور پرستش مقصود نہ ہو، بھی ناجائز ہیں، جیسا کہ عام علماء ہندو پاک کا مسلک ہے، البتہ یہ مسئلہ اجتہادی اور مختلف فیہ ہے اور سلف و خلف کا اس پر اتفاق نہیں ہے جیسا کہ اوپر ذکر کی ہوئی تفصیلات اور ہمارے زمانے کے عام علماء عرب اور ہندو پاک میں بھی بعض ثقہ اور مستند علماء کرام کے تعامل سے واضح ہوتا ہے۔

۵..... جہاں تصویر ایک ضرورت بن جائے مثلاً دفاعی مقاصد کے پیش نظر تصویر لی جائے، پولیس اسٹیشنوں میں اشرار اور غنڈہ عناصر کی تصویریں محفوظ رکھی جائیں، ریلوے، بس اور مختلف عوامی مواقع میں شناخت کے لیے تصویر درکار ہو، پاسپورٹ اور حج کے لیے تصویر کھینچوانی ہو، یہ تمام صورتیں درست اور جائز ہیں۔

۶..... جن فقہاء نے تصویر کو حرام قرار دیا ہے انہوں نے بھی اس کی صراحت کر دی ہے کہ اگر سر کٹا ہوا ہو یا ایسی تصویر ہو جس سے صورت کی شناخت نہ ہو سکے اس پر تصویر کا اطلاق نہیں ہوگا، اس لیے میڈیکل اور طبی مقاصد کے لیے انسان کے جسم کے بعض حصوں کی جو تصویریں لی جاتی ہیں اور جو اکثر اوقات جسم کے اندرونی حصوں سے متعلق ہونے کی وجہ سے ناقابل شناخت ہوتی ہیں ان میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب



معاشی مسائل

خرید و فروخت

اخبارات و رسائل کی خرید و فروخت

عموماً اخبار و رسائل کے لئے سالانہ رقم پیشگی لی جاتی ہے اور روزانہ یا ماہ بیاہ جریدہ ان کو دیا جاتا ہے۔ ان اخبارات و رسائل میں کبھی ضخامت بڑھادی جاتی ہے اور کبھی کم کردی جاتی ہے، کبھی ایک یا چند صفحات میں ایسے اشتہارات دیئے جاتے ہیں جن سے خریداروں کو کوئی فائدہ نہیں۔ ان حالات میں ”بیع“ (جو چیز بیچی جاتی ہے) ایک حد تک غیر متعین اور فقہ کی اصطلاح میں ”مجہول“ ہو جاتی ہے۔ پھر کیا ایسی صورت میں خرید و فروخت کا یہ معاملہ درست ہوگا؟

بیع کا غیر متعین اور مجہول ہونا دراصل اس وقت معاملہ بیع کو فاسد کر دیتا ہے جب اس کی وجہ سے نزاع اور جھگڑا پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ اگر ایسا کوئی اندیشہ نہ ہو تو بیع درست ہو جاتی ہے، چنانچہ علامہ کشمیری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

”ان من البيوع الفاسدة مالواتي بها احد جازت ديانة وان كانت فاسدة قضاء و ذالك لان الفاسد قد يكون لحق الشرع بان اشتمل العقد على مائم فلا يجوز بحال، وقد يكون الفاسد لمخافة التنازع ولا يكون فيه شيء اخر يوجب الاثم فذالك ان لم يقع فيه التنازع جاز عندى ديانة وان بقى فاسداً قضاء لارتفاع علة الفساد وهى المنازعة.“^۱

ترجمہ: ”بعض بیوع فاسدہ ایسی ہیں کہ اگر انسان ان کو کر ہی لے تو ”دیانہ“ جائز ہو جائیں گی گو کہ وہ قضاء فاسد ہوں گی اور یہ اس لئے کہ بیع میں فساد کبھی شریعت کے حق کی بناء پر ہوتا ہے۔ بایں طور کہ معاملہ کسی کار گناہ پر مشتمل ہو۔ ایسی صورت میں بیع کسی حال جائز نہ ہوگی اور کبھی یہ فساد

^۱ فیض الباری: ۲۵۸/۳ کتاب البيوع

اختلاف کے اندیشہ سے ہوتا ہے اور اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جو موجب گناہ ہو، تو اگر اس میں اختلاف اور نزاع کا اندیشہ نہ ہو تو میرے نزدیک دیانۃً جائز ہے گو کہ قضاء وہ فاسد ہوگی اس لئے کہ فساد کا اصل سبب یعنی نزاع باقی نہیں رہا۔“

اسی طرح بعض تصنیفی اداروں اور رسائل میں لائف ممبری کا اصول بھی ہے کہ جو شخص ایک مخصوص متعینہ رقم ادا کرے گا، پوری زندگی اس ادارہ یا رسالہ کا ممبر رہے گا اور مطبوعات اس کو دی جاتی رہیں گی۔ یہاں بھی گو بیع غیر متعین ہے اس لئے کہ نہ یہ معلوم ہے کہ اس کی عمر کتنی ہوگی اور نہ یہ کہ کتنے دنوں میں کتنی کتابیں شائع ہوں گی؟ مگر اس کو بھی جائز قرار دیا جائے گا، اس لئے کہ یہاں بھی ناواقفیت کی وجہ سے باہمی نزاع اور جھگڑے کی نوبت نہیں آتی جیسا کہ مشاہدہ ہے۔ نیز اس کی یہ تاویل بھی کی جاسکتی ہے کہ اس کی حیثیت ”ہبہ عن العوض“ کی ہے کہ ممبر وہ رقم ہبہ کرتا ہے اور ادارہ اس کے بدلہ میں کتابیں دیتا ہے۔

ہمارے زمانے میں دینی تصنیفی اداروں میں اس کا بکثرت تعامل ہے اور اہل علم کی اس پر خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ یہی رائے جیسا کہ مذکور ہوا۔ راقم الحروف کی ہے۔ بعض بزرگوں نے اس کو بیع کے مجہول ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیا ہے۔

پارسل، رسائل وغیرہ کا ڈاک میں ضائع ہو جانا

آج کل خرید و فروخت کے لئے بکثرت ڈاک اور پارسل وغیرہ کے نظام سے مدد لی جاتی ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ راستہ میں وہ چیز ضائع ہو جاتی ہے رسائل و جرائد میں آئے دن ایسا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نقصان کا ذمہ دار کون ہوگا؟ بیچنے والا یا خرید کرنے والا؟

اس کا جواب ایک دوسرے مسئلہ پر موقوف ہے وہ یہ کہ ڈاک کے محکمہ کی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ خریدار کا وکیل سمجھا جائے گا کہ وہ اس کی طرف سے خریدار کو قبضہ دلانے کا وکیل تھا۔ اگر وہ خریدار کا وکیل ہے تو خریدار ہی یہ نقصان اٹھائے گا، تاجر پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی اور اگر تاجر کا وکیل تھا تو وہ اس کا ذمہ دار ہوگا اور اسے نقصان کی تلافی کرنی ہوگی۔

مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے فتاویٰ میں اس مسئلہ میں ایک گونہ اضطراب ہے مولانا نے ایک جگہ اس کا ذمہ دار خریدار کو قرار دیا ہے اور دوسری جگہ تاجر کو اور دوسری رائے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ محکمہ ڈاک

تاجر کا وکیل ہوتا ہے۔

راقم الحروف کی رائے ہے کہ اگر خریدار بذریعہ پارسل سامان طلب کرے یا اس کی اجازت دے تو اب محکمہ ڈاک کی حیثیت خریدار کے وکیل کی ہوگی اور خریدار نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔ اور اگر خریدار کے علم و اطلاع کے بغیر خود تاجر ڈاک سے بھیج دے تو اب محکمہ ڈاک تاجر کی طرف سے وکیل ہوگا اور نقصان کا ذمہ دار وہ ہوگا۔

رسائل و جرائد کے مسئلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس نے دوبارہ رسالہ دینے کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی ہے اور عام عرف کے مطابق ڈاک سے بھیجنے کی بات کہی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ محکمہ ڈاک کو اپنا وکیل قرار دینا نہیں چاہتا بلکہ اس کو خریدار کا وکیل قرار دیتا ہے جس کے قبضہ کر لینے کے بعد وہ بری الذمہ ہو جائے اور اگر اس نے ضائع ہو جانے پر دوبارہ بھیجنے کا وعدہ کیا ہے جیسا کہ بعض رسائل کے ایڈیٹر اعلان کرتے ہیں تو یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ محکمہ ڈاک کو اپنا وکیل سمجھتے ہیں اس لئے وہ دوبارہ رسالہ بھیجنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ دوسرے علماء سے بھی اس بارے میں تحقیق کر لینی چاہئے۔ واللہ اعلم

خرید و فروخت میں تاجر کا کچھ زیادہ دینا

بعض علاقوں میں یہ طریقہ بھی رائج ہے کہ تاجر سامان حوالہ کرنے کے بعد اپنی طرف سے کچھ دیا کرتا ہے۔ مختلف جگہوں پر اس کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں تاجر سے مطالبہ کرنا یا زبردستی اس سے لینا جائز نہیں کیوں کہ خرید و فروخت میں آدمی اتنے ہی مال کے مطالبہ کا حق رکھتا ہے جو باہم طے پایا ہے۔ ہاں اگر تاجر خود اپنی طرف سے کچھ دے دے تو مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ فقہاء نے اس بات کو درست قرار دیا ہے کہ تاجر بطور خود سودے میں کچھ اضافہ کر دے:

”يجوز للمشتري أن يزيد للبائع في الثمن ويجوز للبائع أن يزيد للمشتري في

المبيع ويجوز أن يحط من الثمن.“^۱

ترجمہ: ”خریدار کے لئے جائز ہے کہ تاجر کے لئے قیمت میں کچھ اضافہ کر دے اور بیچنے والے کو

درست ہے کہ خریدار کے لئے سودے میں کچھ اضافہ کر دے یا قیمت میں کچھ کمی کر دے۔“

فرضی بیع

آج کل ”فرضی بیع“ کی صورت بھی مروج ہے، یعنی خرید و فروخت مقصود نہیں ہوتی البتہ کسی مصلحت سے اظہار کیا جاتا ہے کہ ہم دونوں نے باہم خرید و فروخت کا معاملہ کیا ہے۔ اس صورت میں بیع نہیں ہوتی یعنی خریدار

^۱ مختصر القدوری: ص ۸۱، باب المراجعة والتولية

اس شے کا مالک نہیں ہوتا بلکہ وہ حسب سابق اصل مالک ہی کی ملک میں باقی رہے گی البتہ یہ بات اسی وقت ثابت ہو سکتی ہے جب یا تو دونوں کو اس کا اقرار ہو یا اس خفیہ معاہدہ پر کوئی دوسرا شرعی ثبوت موجود ہو۔
فقہ کی اصطلاح میں اس طرح کے معاملہ کو ”بیع تلجیہ“ کہا جاتا ہے:

”التلجیة هی العقد الذی ینشئہ لضرورة امر فیصیر کالمدفوع الیه وانہ علی ثلاثة اضرب احدها أن یکون فی نفس المبیع وهو أن یقول لرجل انی اظهر انی بعت داری منك ولیس بیع فی الحقیقة یشهد علی ذالك ثم یمیع فی الظاهر فالبیع باطل.“^۱

ترجمہ: ”تلجیہ وہ معاملہ خرید و فروخت ہے جس کو کسی ضرورت کی بناء پر کیا جائے جیسا کہ اس کو اس پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ اس کی تین قسمیں ہیں جن میں سے ایک صورت یہ ہے کہ خود بیع میں یہ بات پیش آئے، اس طرح کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے کہے میں ظاہر کروں گا کہ میں نے اپنا مکان تم کو فروخت کر دیا ہے حالانکہ حقیقت میں خرید و فروخت مقصود نہ ہوگی۔ اس (خفیہ معاہدہ) پر گواہ بنالے پھر بہ ظاہر فروخت کرے تو بیع باطل ہوگی۔“

تالاب میں مچھلی کی بیع

ہمارے زمانے میں تالاب میں مچھلی کی خرید و فروخت کا معاملہ کثرت سے رائج ہے۔ جس میں بعض دفعہ معاملہ شریعت کے مقررہ اصولوں کے خلاف طے پاتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس کے احکام اچھی طرح سمجھ لئے جائیں۔ کسی چیز کو فروخت کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: اول یہ کہ جو چیز بیچی جا رہی ہو وہ بیچنے والے کی ملکیت ہو۔ یہ تو ظاہر ہی ہے، دوسرے یہ کہ اس کی حوالگی اور سپردگی ممکن ہو اگر وہ فی الحال اس کے حوالے کرنے پر قادر نہ ہو تو بیع درست نہ ہوگی۔ مثلاً بھاگے ہوئے جانور یا کسی گم شدہ سامان کو فروخت کیا جائے کہ گو وہ اپنے اصل مالک ہی کی ملکیت ہے لیکن بروقت اس کو حوالہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔

مچھلی کے سلسلہ میں بھی یہی تفصیل ہے۔ اگر مچھلی اس شخص کی ملک میں داخل ہے اور وہ با آسانی اس کے حوالہ کرے۔ بے پر قادر بھی ہے تو اب اس کی خرید و فروخت درست ہوگی۔ اگر وہ اس کی سپردگی پر قادر نہ ہو یا ابھی اس کا مالک ہی نہ ہوا ہو تو خرید و فروخت کا معاملہ جائز نہ ہوگا۔

مچھلی کا مالک بننے کی تین صورتیں ہیں: اول یہ کہ مچھلیوں کی نشوونما کے لئے اس کو بطور خاص کسی نے

تالاب میں رکھا ہو، تو اب اس مچھلی اور اس کی نسل کا وہی مالک قرار پائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ مچھلی تو اس نے نہ ڈالی ہو لیکن مچھلیوں کے تالاب میں لانے یا آنے والی مچھلیوں کے واپس نہ جانے کے لئے اس نے کوئی تدبیر کی ہو۔ اب اس تالاب یا حوض میں آنے والی مچھلیوں کا مالک وہی ہوگا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص مچھلی کا شکار کر کے اسے اپنے برتن میں محفوظ کر لے۔ چوتھی صورت جس میں آدمی مچھلی کا مالک نہیں ہو پاتا ہے یہ ہے کہ کسی کا تالاب ہو، اس میں از خود مچھلیاں آجائیں، اس کی سعی و کوشش کو اس میں کوئی دخل نہ ہو، یہاں محض یہ بات کہ تالاب اس کی زمین میں واقع ہے اس بات کے لئے کافی نہیں کہ اس کو ان مچھلیوں کا مالک قرار دیا جائے۔ چنانچہ فقہاء نے محض اس بات کو کہ پرندہ کسی کے کھیت میں بچہ یا انڈا دے دے اس بات کے لئے کافی نہیں سمجھا ہے کہ اس زمین کا مالک ان بچوں اور انڈوں کا بھی مالک ہو بلکہ جو بھی اس بچہ یا انڈا کو اٹھالے وہی اس کا مالک ہے:

”إذا أفرخ طير في أرض رجل فهو لمن أخذه، وكذا إذا باض فيها.“^۱

مچھلی کے بآسانی مقدور^۲ تسلیم ہونے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ شکار کے بعد وہ کسی برتن میں محفوظ کر لے، جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے یا مچھلی کو کسی ایسے چھوٹے گڑھے میں رکھے جس سے نکالنا آسان اور سہل ہو۔

اب ظاہر ہے کہ جن صورتوں میں آدمی مچھلی کا مالک ہی نہ ہو، اس میں تو خرید و فروخت درست ہی نہیں ہے اور جب مچھلی کا مالک ہو جائے تب بھی اسی وقت درست ہوگی جب اوپر ذکر کی گئی دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت پائی جائے۔

اوپر جو تفصیلات ذکر کی گئی ہیں۔ حافظ ابن ہمام رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے ہدایہ کی شرح ”فتح القدیر“ میں ان کو لکھا ہے اور ابن عابدین شامی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے نقل کیا ہے۔ یہاں بھی عبارت نقل کی جاتی ہے:

”أنه إذا دخل السمك في حظيرة فأما أن يعدها لذلك أولا ففي الأول يملكه وليس لأحد أخذه ثم إن أمكن أخذه بلا حيلة جازبيعه لانه مملوك مقدور التسليم والالم يجوز لعدم القدرة على التسليم وفي الثاني لا يملكه فلا يجوز لعدم الملك إلا أن يسد الحظيرة إذا دخل فحينئذ يملكه ثم إن أمكن أخذه بلا حيلة جازبيعه والا فلا وإن لم يعدها لذلك لكنه أخذه وأرسله فيها ملكه فإن أمكن أخذه بلا حيلة جازبيعه لانه مقدور التسليم أو بحيلة لم يجوز لانه

وان كان مملوكا فليس مقدور التسليم“^۱

ترجمہ: ”مچھلی جب گڑھے میں داخل ہو تو یا تو اس نے اس کو اسی مقصد کے لئے تیار کیا ہوگا یا نہیں۔ پہلی صورت میں وہ اس کا مالک ہو جائے گا۔ اور کسی کو اس کے لینے کا حق نہ ہوگا، پھر اگر کسی وسیلہ و ذریعہ کے بغیر اس کا لینا ممکن ہو تو اس کو فروخت کرنا بھی درست ہوگا۔ اس لئے کہ وہ ملک میں بھی ہے اور اس کی حوالگی بھی ممکن ہے ورنہ درست نہیں ہوگا اس لئے کہ اس کو حوالہ کرنا ممکن نہیں ہے دوسری صورت میں چوں کہ وہ اس کا مالک نہیں بنتا اس لئے اس کی بیع بھی جائز نہ ہوگی سوائے اس کے کہ گڑھے میں مچھلی داخل ہونے کے بعد وہ اس کا راستہ بند کر دے، اب وہ اس کا مالک ہو جائے گا پھر اگر کسی دشواری کے بغیر اس کا لینا ممکن ہو تو بیع درست ہوگی ورنہ نہیں۔ اور اگر اس نے گڑھا تو خود نہیں بنایا لیکن مچھلی لے کر اس میں چھوڑی تو اب بھی وہ اس کا مالک قرار پائے گا اور اگر کسی دشواری کے بغیر اس کا لینا ممکن ہو تو بیع جائز ہو جائے گی اس لئے کہ اس کی حوالگی ممکن ہے اور اگر اس کے حوالہ کرنے میں دشواری ہو تو اب یہاں بھی بیع جائز نہ ہوگی کیوں کہ وہ اس کی ملک میں تو ہے لیکن اس کا حوالہ کرنا ممکن نہیں ہے۔“

ناموں کا رجسٹریشن

ناموں کے رجسٹریشن کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی ادارہ اپنے نام کو قانوناً محفوظ کر لیتا ہے۔ اب دوسروں کے لئے اس نام سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس کو اصطلاح میں گڈول (GOOD WILL) کہا جاتا ہے۔

اس طرح حق محفوظ کرنا درست ہوگا کیوں کہ اس سے اپنے مفادات کا تحفظ کیا جاسکتا ہے۔ عوام کو دھوکہ دہی سے بچایا جاسکتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو دوسرے لوگ اس نام کا استحصال کر کے اس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور عوام کو دھوکہ بھی دے سکتے ہیں کہ لوگ جس کمپنی کی مصنوعات کو پسند کرتے ہوں اس کا نام لے کر نقلی اور اس سے کمتر مال ان کو دیا جائے۔

چوں کہ اس سے تجارتی منفعت بھی حاصل ہوتی ہے اس لئے اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہوگی۔ مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

اپنے کاروبار کا کوئی نام رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے لیکن اگر ایک شخص نے اپنے کاروبار کا نام

”عطرستان یا گلشن ادب“ رکھ لیا اور اس سے اس کا تجارتی مفاد وابستہ ہو گیا تو دوسرے شخص کو وہ نام رکھنے کا حق نہیں رہا اور جب کہ ایک خاص نام کے ساتھ مستقبل میں تحصیل مال اور تجارتی منفعت مقصود ہے تو ”گڈول“ کا معاوضہ لینا جائز ہے۔^۱

چٹ فنڈ (CHITFUND)

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک خاص رقم متعین ہوتی ہے، چند افراد اس کے ممبر بنتے ہیں۔ وہ مقررہ تناسب کے مطابق ہر ماہ رقم ادا کرتے ہیں اور مجموعی رقم ہر ماہ قرعہ اندازی یا باہمی اتفاق رائے سے کسی ایک کو دے دی جاتی ہے۔ مثلاً دو ہزار کی چٹھی ہو، دس آدمی شریک ہوں تو دس ماہ تک ہر شخص دو سو روپے جمع کرے گا اور ہر ماہ کسی ایک کو یکمشت یہ رقم مل جایا کرے گی۔

یہ صورت مباح ہے، اس لئے کہ اس کے نادرست ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جو شخص مدت کی تکمیل سے پہلے چٹھی کی رقم حاصل کرتا ہے اس کی حیثیت مقروض کی ہے اور دوسرے ارکان کی قرض دہندہ کی۔ قرض دینے والا اس کو ایک مدت کی مہلت دیتا ہے، اس طرح کہ اس پر کوئی نفع حاصل نہیں کرتا، یہ نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ انسانی ہمدردی اور اسلامی اخلاق کا تقاضا بھی ہے۔

لیکن آج کل چٹ فنڈ کی بعض ایسی صورتیں بھی چل پڑی ہیں جن میں ارکان میں سے کوئی جلد رقم حاصل کرنے کی غرض سے خسارہ برداشت کر لیتا ہے اور چٹھی کی متعینہ رقم سے کم لے لیتا ہے۔ اس طرح اس کے حصہ کی جو رقم بچ رہتی ہے وہ کمیشن کے طور پر تمام شرکاء میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یہ صورت ناجائز اور سود میں داخل ہے۔ اس لئے کہ کمیشن کی صورت میں قرض دینے والوں نے اپنے قرض پر نفع اٹھایا اور قرض دے کر مقروض سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہے اور ”ربو“ میں شامل ہے۔

روپیہ بھنانے میں بٹہ لے لینا

روپیہ بھنانے میں دونوں فریق کی طرف سے رقم ہوتی ہے۔ البتہ ایک شخص بڑی رقم کا سکہ یا نوٹ دیتا ہے اور دوسرا اسی قیمت کے چھوٹے سکے یا نوٹ۔ یہاں نوٹ کا کاغذ یا سکہ کا وہ معدنی ٹکڑا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کی قانونی قدر و قیمت اور حیثیت مقصود ہوتی ہے۔ اس لئے فقہ کی اصطلاح میں یہ ”ثمن“ کی بیع ”ثمن“ سے ہوئی جس کو ”بیع صرف“ کہا جاتا ہے۔

بیع صرف میں اصول یہ ہے کہ کسی فریق کی طرف سے کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک کی طرف سے زیادہ

^۱ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: راقم الحروف کا مقالہ ”حقوق کی خرید و فروخت“

اور دوسرے کی طرف سے کم ہو تو سود اور ربو پیدا ہو جائے گا جو حرام ہے۔ لہذا روپے بھناتے ہوئے اس میں سے کچھ بٹہ کاٹ لینا قطعاً جائز نہیں ہے اور سود میں داخل ہے۔

اشیاء ضروریہ کا نرخ مقرر کرنا اور اس سے زیادہ میں فروخت کرنا

مارکیٹ میں اشیاء ضروریہ کی خریداری کو آسان بنانے اور قیمت پر کنٹرول قائم رکھنے کے لئے حکومت کی جانب سے بعض اوقات اشیاء کا نرخ متعین کر دیا جاتا ہے اور دوکاندار اسی قیمت پر سامان فروخت کرنے کے پابند ہوتے ہیں، حکومت کے اس طرح کے اقدام کو فقہاء نے خصوصی حالات میں جائز قرار دیا ہے، چنانچہ ہکلفی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”ولا يسعر الحاكم ما اذا تعدى الارباب عن القيمة تعديا فاحشا.“^{۱۷}

ترجمہ: ”حاکم اشیاء کا نرخ متعین نہیں کرے گا سوائے اس کے کہ تاجر حضرات قیمت میں غیر معمولی اضافہ کر دیں۔“

تاجروں کے لئے اس متعین نرخ کی پابندی واجب ہے اور اس سے زیادہ قیمت لینا مکروہ ہے، اسی لئے فقہاء نے عدول حکمی کرنے والوں کی سرزنش اور قید وغیرہ کی اجازت دی ہے..... تاہم اگر اس نے زیادہ قیمت میں سامان فروخت کیا تو یہ رقم اس کے لئے جائز و حلال ہوگی، عالمگیری میں ہے:

”فان سعر فباع الخباز باكثر مما سعر، جازبيعه.“^{۱۸}

ترجمہ: ”پس اگر حکومت کی طرف سے متعین نرخ سے بڑھ کر نان بائی نے قیمت لے لی تو بھی خرید و فروخت جائز ہوگی۔“

بیعانہ کی رقم کا حکم

خرید و فروخت کا معاملہ طے ہونے کے بعد بطور سند و وثیقہ کے خریدار بیچنے والے کو متعینہ قیمت کا ایک حصہ دے دیتا ہے جسے عرف میں ”بیعانہ“ کہا جاتا ہے، فقہ کی اصطلاحی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مشتری کی جانب سے ثمن کے بعض حصہ پر قبضہ دلانا ہے، اس میں کچھ حرج نہیں۔

لیکن اس کی مروجہ صورت کہ اگر بعد کو خریدار نے نہ لیا تو اس کی یہ رقم سوخت اور کالعدم ہو جائے، درست نہیں ہے۔ حدیث میں اس کو ”بیع عربان“ کہا گیا ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”نهی عن العربان أن يقدم اليه شيء من الثمن فان اشترى حسب عن الثمن“

^{۱۷} ہندیہ: ۱۰۳/۳

^{۱۸} دیکھئے رد المحتار: ۱۹۶/۴

^{۱۹} درمختار علی هامش الرد: ۲۵۶/۵

والا فہولہ مجاناً وفیہ معنی المیسر۔“^۱

ترجمہ: ”حضور ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ بائع کو ثمن کا کچھ حصہ دیا جائے کہ اگر اس نے خرید لیا تو وہ قیمت میں محسوب ہوگا اور نہ خرید تو بائع کو وہ رقم مفت حاصل ہو جائے گی، اس میں جو پایا جاتا ہے۔“

اگر خرید و فروخت کا معاملہ طے پاچکا تھا اور پختہ ہو گیا تھا تو خریدار کے لئے ضروری ہے کہ پوری قیمت دے کر وہ سامان لے لے یا دونوں باہمی آمادگی سے اس طرح معاملہ کو ختم کر دیں کہ کوئی کسی سے کچھ نہ لے اور بیعانہ کی رقم واپس کر دے اور اگر خریدار نے یہ رقم دینے کے ساتھ ساتھ مہلت بھی لے لی تھی تو خریدار کو تین دنوں کے لئے غور و فکر کا موقع حاصل رہے گا جسے ”خیار شرط“ کہتے ہیں۔ اس مدت میں اس کو معاملہ کے ختم کر دینے یا برقرار رکھنے کا مکمل اختیار ہوگا، اگر معاملہ ختم کر دے تو بیعانہ کی رقم واپس کر دینی ضروری ہوگی اور اگر یہ مدت گزر گئی تو اب معاملہ پختہ ہو گیا اور خریدار کو مکمل قیمت دے کر متعلقہ شے خرید کر لینی چاہئے۔ چوں کہ عام طور پر خریدار سے رقم ادا کرنے کی جو مدت طے پاتی ہے، وہ تین دنوں سے زیادہ ہی ہوتی ہے، اس لئے اس میں ”خیار نقد“ سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جس کے قائل حنفیہ اور حنابلہ ہیں خیار نقد کی مدت عام فقہاء کے نزدیک تو وہی تین دن ہے، مگر امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جو مدت باہم طے کر لی جائے اس کا اعتبار ہوگا اور اگر مدت مقررہ پر قیمت ادا نہیں کی تو خود بخود معاملہ ختم ہو جائے گا۔ فی زمانہ بدعہدی اور وعدہ کے تغافل کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ اسی قول پر فتویٰ دیا جانا چاہئے۔

بیع بہ شرط واپسی

آج کل شہروں میں بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جتنا روپیہ قرض لینا یا دینا ہوتا ہے مقروض اپنا مکان قرض دینے والے کے ہاتھ اس شرط کے ساتھ فروخت کر دیتا ہے کہ وہ جب قرض ادا کر دے گا تو اپنا مکان واپس لے لے گا اور پھر وہ مکان بدستور اس کی ملک میں آجائے گا۔

فقہاء کے یہاں اس کو ”بیع بالوفاء“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شریعت کے اصول کے مطابق اگر کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جو تقاضائے بیع کے خلاف ہو تو درست نہیں ہوتی۔ یہاں چوں کہ اس معاملہ کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شے واپس کر دینی ہوگی اور یہ بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے۔ اس لئے بیع درست نہیں۔ البتہ عملاً اس بیع کی صورت بالکل رہن کی سی ہے اور فقہاء نے بھی ایک طرف اس کے

غیر معمولی تعامل اور دوسری طرف فقہی قباحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز رکھا ہے۔ اب اس معاملہ کو رہن قرار دینے کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص جو خریدار ہے اس کا مالک نہیں ہوگا، اصل مالک بائع ہے۔ اس طرح خریدار کے لئے زمین یا مکان وغیرہ فروخت ہو تو حق شفیعہ اصل مالک ہی کو ہوگا اس خریدار کو جس کی حیثیت دراصل رہن رکھے گئے مال کے امین کی ہے اور جسے فقہ کی اصطلاح میں مرہن سے تعبیر کیا جاتا ہے اس سے استفادہ کا کچھ حق نہیں ہوگا۔

”البيع الذي تعارفه أهل زمننا إحتيالا لربا وسموه بيع الوفاء وهو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به إلا باذن مالكه وهو ضامن لما أكل من ثمرة وأتلف من شجرة.“^۱

ترجمہ: ”وہ بیع جس کا آج کل ہمارے زمانے میں سود سے بچنے کے لئے حیلہ کیا جا رہا ہے اور اسے بیع وفا کہا جاتا ہے درحقیقت رہن ہے جس کا خریدنے والا نہ مالک ہوتا ہے اور نہ اس سے نفع اٹھا سکتا ہے۔“

ذخیرہ اندوزی

ذخیرہ اندوزی کو عربی میں احتکار کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔
”ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے۔“

چنانچہ خلفاء راشدین رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ اس پر خاص نظر رکھتے کہ لوگ ذخیرہ اندوزی کر کے بازار کو گراں نہ کریں۔ سیدنا عمر بسا اوقات بازار میں اس کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ حضرت علی رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ ایک مقام سے گزرے اور ایک ذخیرہ اندوز تاجر کا مال دیکھا تو اسے نذر آتش کرادیا۔

فقہاء نے بھی اسے مکروہ بلکہ حرام قرار دیا ہے..... اس لئے کہ اس کی وجہ سے بازار گراں ہوتا ہے اور عام لوگوں کے لئے ضروریات زندگی کا حصول دشوار ہو جاتا ہے، اکثر فقہاء کے یہاں یہ ذخیرہ اندوزی صرف غذائی اشیاء اور حیوانات کے چارے میں ممنوع ہے، غیر معمولی حالات میں امام مالک اور امام احمد رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کے نزدیک تمام ہی اشیاء ضروریہ میں احتکار حرام ہے اور یہی رائے امام ابو یوسف کی ہے..... غالباً یہ رائے زیادہ

^۱ رد المحتار: ۳۴۶/۴ ۲۵ الفتاویٰ الہندیہ: ۱۰۳ فصل فی الاحتکار

^۲ مؤطا امام مالک ص: ۲۶۹، ۷۰ باب الحکرۃ والتربص عن عمر بن الخطاب

^۳ کنز العمال مع مسند احمد: ۲۳۷/۲ ۲۵ دیکھئے: بدائع الصنائع: ۱۲۹/۵، المغنی: ۱۵۳/۴

^۴ الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵۸۶/۴

قرین صواب ہے۔..... اس ذخیرہ اندوزی کی مدت ”۴۰“ دن متعین کی گئی ہے یعنی ۴۰ دنوں تک مال کا روک رکھنا تاکہ گراں فروشی کا موقع فراہم ہو سکے، اختکار ہے اور ممنوع ہے یہاں تک کہ فقہاء نے حکومت اور انتظامیہ کو اس بات کا حق دار گردانا ہے کہ وہ ضروری سمجھے تو بالجبر ایسا مال نکال کر فروخت کرادے۔

اسمگلنگ

مختلف ممالک اپنے ملک کے معاشی مصالح کے پیش نظر دوسرے ملکوں کی برآمدات پر پابندی عائد کر دیتے ہیں کہ ان کے آنے کی وجہ سے ملکی مصنوعات اور ان کی نکاسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی اور اسمگلنگ کا کاروبار درست نہیں ہے اس لئے کہ ایک تو یہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہے جو اس ملک کا شہری ہونے کے لحاظ سے اس کے قانون کے احترام کے سلسلہ میں ضروری ہے۔ دوسرے اس طرح وہ پوری قوم اور باشندگان ملک کو اپنی حرکت کے ذریعہ نقصان پہنچاتا اور زیر بار کرتا ہے جو غیر اسلامی ہونے کے علاوہ غیر انسانی حرکت بھی ہے۔

معاشی مصالح کے پیش نظر اس قسم کی پابندیوں کی گنجائش ہے۔ اس کی نظیر ”تلقی جلب“ اور ”بیع حاضر للبادی“ ہے، جس کو مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ تلقی جلب سے مراد یہ ہے کہ باہر سے آنے والے تجارتی قافلہ کے شہروں میں آنے سے پہلے ہی کوئی شخص جا کر ان سے غلہ خرید لے اور شہر میں آکر اس سے زیادہ میں فروخت کر دے اور ”بیع حاضر للبادی“ یہ ہے کہ شہر کا تجربہ کار تاجر دیہات کے تاجر سے کہے کہ میں شہر کے نرخ سے آگاہ ہوں، میں تمہارے لئے فروخت کرادوں گا..... رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے..... کیوں کہ اس کی وجہ سے گرانی بڑھتی ہے اور اس شہر کے باشندوں کو زک پہنچتی ہے، یہی مضرت اسمگلنگ سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ غیر ملکی مصنوعات کی آمد کی وجہ سے اس ملک کی صنعت اور یہاں کا معاشی توازن بگڑتا اور متاثر ہوتا ہے۔

تجارت میں شیر کی ایک خاص صورت

بعض عرب ممالک میں یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ دوسرے ممالک کے لوگ وہاں کے کسی مقامی باشندہ کی شرکت سے ہی تجارت کر سکتے ہیں، ایسا نہیں ہو سکتا کہ مکمل تجارت تنہا انہیں کی ہو۔ اس قانونی طریقہ کی تکمیل

لہ والاحتکار یحرم فی غیر الطعام ایضا عند الضرورة عند المالکۃ وابی یوسف من الحنفیۃ (انظر: الفقہ الاسلامی وادلتہ للرحیلۃ: ۵۸۶/۳) و فیما یری هذا هو الحق ووافق باطلاق النصوص

لہ بدائع: ۱۲۹/۵ لہ الفتاویٰ الہندیہ: ۱۰۳/۳ فصل فی الاحتکار لہ المغنی: ۱۵۲/۴ بذل المجہود: ۲۶۸/۴

لہ ترمذی عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۲۳۲/۱ باب ماجاء فی کراہیۃ تلقی البیوع، ابن ماجہ عن ابن

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۱۵۷/۱ باب عن تلقی الجلب، نسائی عن ابی ہریرہ: ۲۱۵/۲ باب التلقی

کے لئے جب بیرونی باشندے تجارت کرتے ہیں تو وہ برائے نام اپنے کاروبار میں کسی مقامی باشندہ کا نام بھی شریک کار کی حیثیت سے دیتے ہیں تاکہ قانونی طور پر ان کو اس کی اجازت حاصل ہو جائے اور معاوضہ کے طور پر سالانہ یا ماہانہ ان کو کوئی متعینہ رقم دے دیا کرتے ہیں۔

یہ صورت درست نہیں ہے۔ اصل تاجر اس طرح رشوت دیتا ہے اور یہ کوئی ایسی مجبوری اور ضرورت نہیں ہے جس کی وجہ سے رشوت کی اجازت دی جائے اور دوسرا فریق جو ”برائے نام“ شریک ہے، کے حق میں بھی یہ رشوت اور غصب کا مال ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس مقامی باشندے کو بھی باضابطہ شریک کیا جائے اگر وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہو تو اصل تاجر اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ اس کو قرض دے اور معاملہ میں شریک بنالے، پھر نفع میں جو تناسب سمجھے مقرر کر لے۔

دودھ بینک

۱ اسلام اصولی طور پر اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ایک خاتون اپنے بچے کے علاوہ دوسرے بچوں کو دودھ پلائے۔ حدیث کی کتابوں میں بکثرت اس کی نظیریں ملتی ہیں، اور نکاح میں حرمت رضاعت کے تمام احکام اسی اصول پر مبنی ہیں۔

۲ اس قسم کے منظم بینک قائم کرنے میں دو مسئلے پیدا ہوں گے۔ ایک تو دودھ کی خرید کا اور دوسرا دودھ کی فروخت کا۔ اس پر تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ دودھ پلانے والی دودھ پلائی کی اجرت لے سکتی ہے، اور اس کی بھی خود قرآن مجید میں صراحت موجود ہے کہ جو اپنے بچوں کو دودھ پلوائیں چاہئے کہ اس کی اجرت ادا کریں، فقہاء نے بھی اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

لیکن بیع اور اجارہ کے درمیان فرق ہے۔ احناف کے یہاں دودھ کے اجزائے انسانی میں سے ہونے کی وجہ سے اس کی بیع جائز نہ ہوگی۔..... البتہ امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں دودھ کی بیع درست ہے اور یہی رائے امام احمد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی بھی ہے۔

”ومن ذالك قول الشافعي واحمد بجواز بيع لبن المرأة مع قول ابی حنیفہ ومالك لا يجوز بيعه.“

حنابلہ اور شوافع اجارہ پر قیاس کرنے ہیں اور احناف یہ جواب دیتے ہیں کہ اجارہ میں دودھ کا عوض نہیں ہے بلکہ اس کے عمل کا معاوضہ ہے۔

اس طرح امام شافعی و احمد رَحِمَہُمَا اللہُ تَعَالٰی کے یہاں اس کی اجازت ہوگی امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں جائز نہیں اور حنفیہ کا نقطہ نظر فطرت سے ہم آہنگ عقل کے تقاضوں کے مطابق اور نصوص کے موافق ہے۔

بینک ڈرافٹ وغیرہ کا شرعی حکم

آج کل بڑی قوم کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کے لئے چک، ڈرافٹ اور پوسٹل و منی آرڈر وغیرہ کو آسانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا تعامل اس درجہ ہے کہ اس سے گریز بھی مشکل ہے۔ بہ ظاہر اس پر ”سفجہ“ کی صورت صادق آتی ہے۔ جسے بعض فقہاء نے ناجائز اور بعض نے مکروہ قرار دیا ہے۔

”سفجہ“ یہ ہے کہ ایک شخص کسی کو قرض دے اور کسی شہر میں جہاں جانا ہے۔ وہاں قرض وصول کر لے تاکہ راستہ کے خطرات سے محفوظ رہ سکے اور پر امن طور پر اس کو یہ رقم مل جائے۔ اس کے لئے کبھی یہ صورت بھی اختیار کی جاتی تھی کہ ایک آدمی ایک شہر میں کسی سے ایسی رقم لے لیتا اور دوسرے شہر میں جہاں اس کا کاروباری رفیق موجود ہوتا، وہاں وہ یہ رقم صاحب مال کو ادا کر دیتا۔ علامہ مجد الدین فیروز آبادی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”وہی ان تعطی مالا لرجل له مال فی بلد ترید ان تسافر الیہ فتاخذ منه خط لمن عنده المال فی ذالک البلد ان يعطیک مثل مالک الذی دفعته الیہ قبل سفرک۔“^۱

ترجمہ: ”وہ یہ ہے کہ تم کسی کو مال دو جس کا مال کسی اور شہر میں ہو۔ تمہارا مقصود یہ ہو کہ وہاں کا سفر کرو چنانچہ تم اس سے اس شخص کے نام ایک تحریر لوجس کے پاس اس دوسرے شہر میں اس کا مال ہو کہ وہ تم کو اتنا ہی مال دے دے جتنا مال تم نے اس کو اپنے سفر سے پہلے دیا تھا۔“

اب اگر چک، ڈرافٹ وغیرہ کی صورت پر غور کیا جائے تو یہ صورت پوری طرح صادق آتی ہے۔ فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ سفجہ اس وقت مکروہ ہوگا جب صاحب مال معاملہ میں بہ حیثیت شرط اس بات کو داخل کر دے کہ وہ یہ قرض فلاں دوسرے شہر میں ادا کرے گا۔ یا عرف میں یہ بات اتنی عام ہوگئی ہو کہ اس کا مقصد و منشاء ہی یہی سمجھا جاتا ہو، تب یہ سفجہ مکروہ ہوگا۔^۲ زکورہ مروجہ طریقوں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔

لیکن یہ مسئلہ متفق علیہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ مکہ میں تاجروں سے نقد قرض لے لیا کرتے تھے اور کوفہ اور بصرہ میں ادائیگی کا تحریری وثیقہ لکھ دیتے تھے۔ علامہ ابن تیمیہ بھی اس کو جائز اور درست قرار دیتے ہیں۔^۳

^۱ القاموس المحيط: ۱۹۴/۱ ^۲ الفتاویٰ الہدیہ: ۱۳۶/۳

^۳ المبسوط: ۳۶۰/۱۴ ^۴ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۵۳۰/۱۹

موجودہ دور میں جہاں یہ ایک کاروباری ضرورت بن گئی ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس مسئلہ میں فقہی اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو جائز اور درست قرار دیا جائے جیسا کہ منی آرڈر کے سلسلے میں ہندوستان کے اکابر علماء نے جواز کی شکل پیدا کی ہے۔

تحریر اور فون کے ذریعہ خرید و فروخت

خرید و فروخت جس طرح زبان کے ذریعہ ہو سکتی ہے اسی طرح بوقت ضرورت مراسلت اور خط و کتابت کے ذریعہ بھی کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ نیچے جانے والی چیز اور اس کی قیمت تحریر کے ذریعہ مناسب طور پر متعین کر دی جائے اور معاملہ میں ایسا ابہام باقی نہ رہے کہ آئندہ نزاع کا اندیشہ رہ جائے۔ البتہ ضروری ہے کہ اس صورت میں خریدی اور نیچے جانے والی چیز سونے چاندی کے قبیل سے نہ ہو یا دونوں کی جنس ایک نہ ہو کہ ہم جنس چیزوں کی خرید و فروخت میں سامان اور قیمت پر ایک ہی مجلس میں قبضہ ہو جانا ضروری ہے۔

تحریر کے ذریعہ خرید و فروخت کی بابت علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”ویكون بالكتابة من الجانبين فاذا كتب اشتریت عبدك فلانا بكذا وكتب اليه البائع قد بعث فهذا بيع.“^۱

ترجمہ: ”اور خرید و فروخت کا معاملہ فریقین کی جانب سے تحریری شکل میں ہو سکتا ہے تو اگر خریدنے والے نے یہ لکھ دیا کہ میں نے اتنے میں تیرے فلاں غلام کو خرید لیا اور بیچنے والے نے بھی تحریری شکل میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تو اس معاملہ پر بیع کا اطلاق ہوگا۔“

جس طرح تحریر کے ذریعہ خرید و فروخت درست ہے اسی طرح ٹیلی فون کا حکم بھی ہوگا، اس لئے کہ تحریر اور ٹیلی فون دونوں میں قریبی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اسی طرح فیکس کے ذریعہ بھی خرید و فروخت کا معاملہ جائز ہوگا۔ فی زمانہ فون، فیکس اور مراسلت کے ذریعہ بیرون ملک اور اندرون ملک ایک شہر سے دوسرے شہر جو خرید و فروخت کی جاتی ہے وہ جائز و درست ہے۔

نمک لگائے ہوئے چمڑے کی خرید و فروخت

بحمد اللہ چمڑے کی تجارت میں آج بھی مسلمانوں کا بہتر تناسب ہے، چمڑا اگر ایسے جانور سے حاصل کیا گیا ہو جس کو شرعی طور پر ذبح کیا تھا تب تو کوئی قباحت نہیں، ایسے چمڑے پاک اور قابل خرید و فروخت ہیں۔ لیکن اگر مردار کے چمڑے ہوں تو گوشت کی طرح یہ چمڑے بھی ناپاک ہیں اور ان کی خرید و فروخت جائز نہیں، مسلمان

تاجرانِ چرم کے لئے یہ پہلو ہندوستان کے ماحول میں خاصا دشوار ہے، کیوں کہ ایک کثیر تعداد مشرکین کے ذبیحوں سے حاصل ہونے والے چمڑوں کی ہوتی ہے، اس لئے مسلمان تاجرانِ چرم کو چاہئے کہ ایسے چمڑوں کو اولاً ان کے مالک سے کچھ اجرت لے کر نمک لگا دیں اور پھر انہیں خرید کر لیں، کیوں کہ مردار کے چمڑے بھی دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں اور دباغت کے لئے نمک کا لگانا کافی ہے، دارقطنی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے حضرت عائشہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”استمتعوا بجلود الميتة اذا هي دبغت ترابا كان اور مادا او ملحاً او ما كان بعد ان يزيد صلاحه.“^۱

ترجمہ: ”مردہ جانوروں کے ایسے چمڑوں سے فائدہ اٹھاؤ جن کو مٹی، راکھ یا نمک یا کسی اور شے سے دباغت دے دی جائے بشرطیکہ اس سے اس کے باقی رہنے کی صلاحیت بڑھ جائے۔“
چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

”ثم الدباغ هو ما يمنع عود الفساد الى الجلد عند حصول الماء فيه والدباغ على ضربين حقيقي و حکمی فالحقيقي هو ان يدبغ بشيء له قيمة كالشب والقرظ والعفص وقشور الرمان ولحي الشجر والملح وما اشبه ذلك.“^۲
ترجمہ: ”دباغت ایسے عمل کا نام ہے کہ پانی لگنے کے بعد چمڑا دوبارہ خراب نہ ہو۔ دباغت کی دو قسم ہے۔ دباغت حقیقی، دباغت حکمی۔ دباغت حقیقی کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز سے دباغت دی جائے جس کی کوئی قیمت ہو۔ جیسے شب، قرظ، عفص، انار کے چھلکے، درخت کی کھال، نمک یا اسی طرح کی دوسری چیزوں سے دباغت کے عمل کو انجام دیا جائے۔“

مخدرات کا استعمال اور خرید و فروخت

جو چیزیں نشہ نہ پیدا کرتی ہوں، لیکن صحت کے لئے مضرت رساں ہوں اور ان کا استعمال انسان کو ان کا خوگر بنا دیتا ہو، آج کل ان کو ”مخدرات“ کہا جاتا ہے، ظاہر ہے ایسی چیزوں کا استعمال جائز نہیں اور صحت جسمانی کے ساتھ کھلواڑ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی ایک گران قدر نعمت ہے، ایسی چیزوں کا خرید و فروخت کرنا بھی جائز نہیں، اور اس کی قیمت قریب بہ حرام ہے، اس سلسلہ میں فقہاء نے یہ اصول بتایا ہے کہ:

”ان ما قامت به المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً، والا فتنزيهاً فليحفظ تو

^۱ ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی معروف بن حسان مجہول ہے، اس لئے یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ (فتح القدیر: ۹۵/۱) ^۲ البحر الرائق: ۹۹/۱

فیقا۔“

تَرْجَمًا: ”جس چیز کا بعینہ گناہ میں استعمال کیا جا رہا ہے اس کی خرید و فروخت مکروہ ہوگی اور جس کا استعمال تبدیلی کے بعد گناہ ہو تو اس کی خرید و فروخت مکروہ ہے۔“
اسی لئے فقہاء نے تمباکو وغیرہ کی خرید و فروخت کو بھی منع کیا ہے:
”ویمنع من بیع الدخان وشربه.“

تَرْجَمًا: ”تمباکو کی خرید و فروخت اور اس کا استعمال دونوں ممنوع ہیں۔“

سرکاری راشن زیادہ قیمت میں فروخت کرنا

حکومت عوام کو کم قیمت میں بعض اشیاء ضروریہ کی فراہمی کے لئے راشننگ نظام قائم کرتی ہے اور مخصوص ڈیلروں کو یہ سامان حوالہ کرتی ہے، تاکہ عوام وہاں سے یہ اشیاء خرید کر سکیں۔ اخلاقی انحطاط اور زوال اس درجہ ہو چکا ہے کہ تجار اس قسم کی اشیاء بچانے کی کوشش کرتے ہیں یا تو حق داروں کو کسی بہانہ سے محروم کرتے ہیں، یا کسی نے اپنا راشن نہیں لیا تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور غیر قانونی راستہ سے اسی کو زیادہ قیمت میں فروخت کر دیتے ہیں۔

یہ صورت قطعاً جائز نہیں کیوں کہ اس صورت میں ڈیلرس محض حکومت کے وکیل ہیں، اصل فروخت کنندہ حکومت ہے، لہذا حکومت نے جب ایک قیمت متعین کر دی ہے کہ اس سے زیادہ میں فروخت نہ کیا جائے اور یہ بھی متعین کر دیا ہے کہ کن اشخاص کے ہاتھ کتنا فروخت کیا جائے، تو اب ڈیلرس قانوناً اور شرعاً اس کے پابند ہیں، نہ اس کی خلاف ورزی جائز ہے اور نہ اس سے حاصل ہونے والا نفع حلال۔

صرف نمونہ دکھا کر خرید و فروخت

کارخانوں میں جو اشیاء بنائی جاتی ہیں، وہ چوں کہ مشین یا بنے ہوئے فریم پر بنتی ہیں، اس لئے ان کی مصنوعات کو فروخت کرتے ہوئے نمونہ دکھانے پر اکتفا کر دیا جاتا ہے اور خریدار اسی کو دیکھ کر سامان کا آرڈر دیتا ہے، فقہاء نے خریدار کو، اگر اس نے سامان نہ دیکھا تھا۔ سامان دیکھنے کے بعد اس معاملہ کے رد کر دینے کا اختیار دیا ہے، جس کو فقہ کی اصطلاح میں ”خیار رؤیت“ کہا جاتا ہے، موجودہ حالات میں سوال یہ ہے کہ کیا ایسی مصنوعات کو دیکھنے کے بعد جو اسی نمونہ پر بنی ہوئی ہوں خریدار کے لئے اس معاملہ سے دستبردار ہو جانے کا اختیار حاصل ہوگا؟ اگر واقعی خریدار کو یہ اختیار دیا جائے تو مال تیار کرنے والے کو خاصی دقت اور نقصان کا سامنا

ہوگا۔

فقہاء کے یہاں اس سلسلہ میں یہ صراحت ملتی ہے کہ نمونہ کو دیکھ لینا پورے مال کو دیکھ لینے کے درجہ میں ہے اور خریدار کے لئے اس سے دستبردار ہونے کی گنجائش نہیں ہدایہ میں ہے:

”فان كان لا تتفاوت أحادها كالمكيل والموزون و علامته ان يعرض بالنموذج

يكفى برؤية واحد منها الا اذا كان الباقي أردا ممارأي فحينئذ يكون له الخيار“

ترجمہ: ”خرید و فروخت کی جانے والی اشیاء کے افراد میں اگر قدر و قیمت کا قابل لحاظ فرق نہ ہو

جیسے ناپی تولی جانے والی چیزیں۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ ان کا نمونہ پیش کیا جائے تو ایک کو دیکھ

لینا کفایت کر جائے گا لیکن اگر بقیہ دیکھے ہوئے نمونہ کے مقابلہ میں کمتر نکل گئے تو ایسی صورت میں

معاملہ کو رد کر دینے کا اختیار حاصل ہوگا۔“

پس اگر نمونہ کے مطابق مال ہو تو خریدار اس کو رد نہیں کر سکتا اور اگر سامان نمونہ سے کمتر درجہ کا ہے تو عیب

کی بناء پر واپس کر سکتا ہے۔

گارنٹی کے ساتھ فروخت

اپنی مصنوعات کو فروغ دینے اور گاہکوں کی ترغیب کے لئے آج کل یہ صورت مروج ہے کہ خریدار کو ایک

مدت تک سامان کی صلاح و مرمت کا تيقن دیا جاتا ہے، یہ مسئلہ اس لئے اہم ہے کہ شریعت نے خرید و فروخت

میں کسی اضافی شرط کو جائز قرار نہیں دیا ہے، اسی کا تقاضا یہ ہے کہ اس قسم کی گیارنٹی کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز قرار

پائے، لیکن فقہاء کے نزدیک شریعت کی اس ممانعت کا منشاء امکانی نزاع کا دروازہ بند کرنا ہے اور جو شرطیں

معروف و مروج ہو جاتی ہیں، وہ نزاع کا باعث نہیں بنتی ہیں لہذا ایسی شرطوں کو جائز اور قابل عمل قرار دیا گیا ہے

صاحب ہدایہ ایسی شرطوں کو مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”الا ان يكون متعارفا.“

ترجمہ: ”لیکن اگر وہ مروج ہو تو جائز ہے۔“

پس مصنوعات کے ساتھ گارنٹی دینا اور اس سے فائدہ اٹھانا دونوں ہی جائز ہیں

ریشم اور شہد کے کیڑوں کی خرید و فروخت

کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض بھی اس زمانہ میں ”متاع خرید و فروخت“ بن گئے ہیں، ان کی پرورش

بھی کی جاتی ہے اور ان کے ذریعہ ریشم، شہد اور بعض ادویہ حاصل کی جاتی ہیں، ریشم کے کیڑے، شہد کی مکھیاں اور سانپ اس سلسلہ میں خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں، ابتداء فقہاء نے ان کی خرید و فروخت کو منع کیا تھا کہ بہ ظاہر یہ نفع آور نہ تھے اور جن اشیاء میں نفع پہنچانے کی صلاحیت نہ ہو، وہ نہ مال ہیں اور نہ ان کی خرید و فروخت کا کوئی فائدہ ہے، لیکن جوں جوں اس طرح کی اشیاء قابل انتفاع ہونے لگیں اور ان سے معاشی مفاد متعلق ہوتا گیا، فقہاء نے ان کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دے دی۔ اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات موجود ہیں:

”وباع دود القزای الابرسم و بیضه ای بزره وهو بزر الفیلق الذی فیہ الدود والنحل المحرز وهو دود العسل وهذا عند محمد و به قالت الثلاثه و به یفتی^۱۔“
 ترجمہ: ”اور ریشم کے کیڑوں کو بیچنا جائز ہے اور اس کیڑے کے بیضہ یعنی بیج کی بھی فروخت ہو سکتی ہے۔ بیضہ سے مراد وہ خول ہے جس میں ریشم کے کیڑے پرورش پاتے ہیں، گرفت میں لائی ہوئی شہد کی مکھی کی خرید و فروخت بھی جائز ہے۔ یہ امام محمد رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا مسلک ہے ائمہ ثلاثہ رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی کا بھی یہی مذہب ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔“

”يجوز بيع الحيات اذا كان ينتفع بها للأدوية وما جاز الانتفاع بجلده أو عظمه أي من حیوانات البحر أو غیرها۔“^۲

ترجمہ: ”سانپوں کی خرید و فروخت جائز ہے جب کہ ان سے ادویہ تیار کی جاتی ہوں نیز بحری و بری جانوروں میں سے جن کی کھال اور ہڈی قابل انتفاع ہے۔ ان کی خرید و فروخت بھی درست ہے۔“
 اس لئے فی زمانہ جن کارآمد حشرات کی خرید و فروخت مروج ہو جائے ان کی خرید و فروخت جائز ہے۔

فضلہ کی خرید و فروخت

موجودہ زمانہ میں کھاد کے لئے انسانی اور حیوانی فضلہ کا استعمال کیا جاتا ہے بلکہ یہ طریقہ زمانہ قدیم ہی سے مروج ہے، اسی بناء پر اب اس کی خرید و فروخت بھی ہونے لگی ہے، چوں کہ اب ان فضلات سے گیس بھی پیدا کی جا رہی ہے، اس لئے توقع ہے کہ اس کی تجارتی اہمیت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ ہر چند کہ اصولی طور پر شریعت ناپاک اشیاء کو مال تصور نہیں کرتی، اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی منع کرتی ہے، لیکن فقہاء کی تصریحات کو سامنے رکھا جائے تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ناپاک اشیاء کی خرید و فروخت کی ممانعت اس لئے ہے کہ اس کا استعمال ممکن نہیں، اگر اس کے استعمال کی صورت نکل آئے تو پھر اس کا استعمال بھی درست ہوگا اور اس کی خرید و فروخت بھی۔ چنانچہ ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”والصحيح عن الامام ان الانتفاع بالعدرة الخالصة جائز يجوز بيع الخالصة.“^۱

ترجمہ: ”حضرت امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا صحیح قول یہی ہے کہ فضلہ خالص سے فائدہ اٹھانا جائز ہے اور فضلہ خالص کی خرید و فروخت بھی درست ہے۔“
اور ”فتاویٰ عالمگیری“ میں ہے:

”ویجوز بيع السرقيين والبعروالا انتفاع بهما.“^۲
ترجمہ: ”گو بر اور لید کی خرید و فروخت اور ان سے انتفاع جائز ہے۔“

قسطوں پر سامان کی فروخت

آج کل قسطوں پر سامان کو فروخت کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے خریدنے والے کو بھی اس میں سہولت ہوتی ہے اور بیچنے والا بھی ادائیگی میں تاخیر کو ملحوظ رکھ کر قیمت کسی قدر بڑھا کر لیتا ہے، اس طرح کی خرید و فروخت میں نقد کی قیمت کم اور ادھار کی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ صورت جائز ہے..... البتہ معاملہ طے کرتے ہوئے ان امور کا خیال رکھنا چاہئے:

- ۱۔ معاملہ نقد یا ادھار میں سے کسی ایک نوعیت پر قطعیت کے ساتھ طے کر لیا جائے
- ۲۔ ادھار جو قیمت مقرر کی جائے وہ بھی ایک اور مقررہ طے شدہ ہو۔
- ۳۔ اگر خریدار مقررہ وقت پر پیسہ ادا نہ کر پائے تو تاخیر کی وجہ سے قیمت میں مزید اضافہ نہ کیا جائے، اگر تاخیر مزید کی وجہ سے پھر قیمت بڑھادی جائے تو یہ حرام ہوگا اور سود متصور ہوگا۔

شیئرز کی خرید و فروخت

آج کل حصص یعنی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت ایک اہم اور مالی اعتبار سے نفع آور کاروبار بن گیا ہے، حصص کبھی تو براہ راست کمپنی سے خریدے جاتے ہیں، کبھی ایجنسیوں کے واسطے سے لئے جاتے ہیں اور کبھی شخصی طور پر لوگ اپنا خرید کیا ہوا حصہ کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ تینوں ہی صورتیں جائز اور درست ہیں۔ پہلی اور تیسری صورت میں براہ راست مالک سے حصہ خریدی گا۔ دوسری صورت میں اگر ایجنٹ خرید کر شیئرز فروخت کر رہا ہے تو مالک سے خریداری عمل میں آئی اور اگر اس نے خرید نہیں کیا تھا تو اس کی حیثیت کمپنی کے وکیل کی ہوگئی ان تمام صورتوں میں شیئرز کے مالکان یا تو خود شیئرز پر قبضہ کر چکے ہیں یا کمپنی کے مینیجر اور

منتظمین نے وکالت اس کی طرف سے شیئرز کی اصل ملکیت پر قبضہ کیا ہے۔

کسی چیز کی خرید و فروخت کے لئے ضروری ہے کہ فروخت کنندہ یا تو خود اس کا مالک ہو یا مالک کی طرف سے فروخت کرنے کا وکیل ہو اور یہ دونوں باتیں یہاں متحقق ہیں۔ پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ شیئرز کی خرید و فروخت اس روپے کی خرید و فروخت نہیں ہے جس کی دستاویز خریدار ان حصص کو حاصل ہوئی ہے۔ بلکہ یہ اس سامان کا وثیقہ اور اس سامان کی خرید و فروخت ہے جس کی ابتدائی قیمت کمپنی نے دس روپے یا اس سے کم و بیش مقرر کی تھی، پس جب شیئرز کی فروخت بنیادی طور پر سامان کی خرید و فروخت ہے نہ کہ نقد رقم کی، تو اب اس کو کسی قدر فرق کے ساتھ بھی فروخت کیا جائے اور اصل قیمت میں کتنی ہی کمی بیشی کے ساتھ بیچا جائے، سود کا تحقق نہیں ہوگا۔

ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ آج کل شیئر مارکٹ میں جس قیمت پر حصص فروخت کئے جاتے ہیں، اس کا حقیقی قیمت سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا، مصنوعی طریقوں کے ذریعہ شیئرز کی قیمتیں بہت بڑھادی جاتی ہیں اور بعض دفعہ اسی نسبت سے قیمتیں اترتی بھی ہیں، ہوتا یہ ہے کہ جب کسی کمپنی کے حصص کی طلب بڑھ جاتی ہے اور اس کی قیمت چڑھنے لگتی ہے تو لوگ اس کو نفع خیز اور ثمر آور سمجھ کر گراں قیمتوں میں خرید لیتے ہیں۔ اس طرح مصنوعی طریقوں سے قیمتوں کا بڑھانا یقیناً درست نہیں اور اسی کو فقہ و حدیث کی اصطلاح میں ”بخش“ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس فعل کے مکروہ ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص دھوکہ دے کر خرید و فروخت کر ہی لے تو یہ خرید و فروخت جائز اور نافذ ہوتی ہے۔

پس جب اصولی طور پر شیئرز کی خرید و فروخت جائز ٹھہری تو اب حکم کا مدار کمپنی کی نوعیت پر ہوگا۔ اگر کمپنی جائز کاروبار کرتی ہو تو اس کا شیئر خریدنا جائز ہوگا۔ کمپنی کے اصل مالکان مسلم ہوں یا غیر مسلم؟؟ اور اگر وہ ناجائز اور غیر شرعی کاروبار کرتی ہو جیسے شراب سازی مجسمہ سازی وغیرہ تو اس کے حصص خریدنا جائز نہ ہوگا۔ هذا معندي والله اعلم بالصواب

دو ملکوں کی کرنسیوں کا نقد ادھار تبادلہ

دو ملکوں کی کرنسی نوٹ کو ہمارے زمانہ کے علماء نے دو علاحدہ جنس قرار دیا ہے اور چوں کہ یہ ناپی یا تولی جانے والی چیز نہیں اور قدر و قیمت میں کافی تفاوت پائے جانے کی وجہ سے ان کو ایسی چیز بھی شمار نہیں کیا جاسکتا جو شمار کی جاتی ہیں اور ان کے افراد میں باہم کوئی قابل لحاظ تفاوت نہیں، (عددی متقارب) اس لئے اب دو ملکوں کی کرنسیاں ”جنس“ اور ”قدر“ ہر دو لحاظ سے مختلف ہیں اور ایسی دو چیزوں میں نقد ادھار تبادلہ ہو سکتا ہے۔ لہذا یہ

جائز ہے کہ ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی سے اس طرح تبادلہ کیا جائے کہ ایک کی طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار ہو۔ دوسرے اس وقت ایک ملک سے دوسرے ملک کو وہاں کی کرنسی منتقل کرنے کے جو قانونی و غیر قانونی طریقے ہیں، ان سب میں یہ صورت پائی جاتی ہے کہ ایک طرف سے رقم پہلے ادا کی جاتی ہے اور دوسرے ملک کی رقم کا یا تو صرف چیک اور ڈرافٹ دست بدست طے پاتا ہے یا وہ رقم بعد کو ادا کی جاتی ہے۔ اس لئے عملاً بین ملکی تبادلہ رقوم میں اس سے بچنا دشوار ہے۔

فقہاء کی ان تصریحات سے بھی اس کے جائز ہونے کا اشارہ ملتا ہے:

”واما السلم فی الفلوس عددا فجائز عندابی حنیفة وابی یوسف۔“^۱

ترجمہ: ”فلوس میں بیع سلم تعداد کے لحاظ سے امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز ہے۔“

”بیع الفلوس بالدرہم لیس بصرف۔“^۲

ترجمہ: ”درہم کے ساتھ فلوس بیچنا بیع صرف نہیں ہے۔“

اگر ایک کرنسی میں معاملہ طے پایا اور اسی کے مساوی

دوسری کرنسی دی گئی تو کس کا اعتبار ہوگا؟

مختلف ملکوں کے سکوں کی قیمت میں ہونے والے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ایک نیا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ بعض اوقات مثلاً ایک شخص ایک لاکھ ہندوستانی روپے قرض مانگتا ہے، اس وقت دس ہزار ریال ایک لاکھ ہندوستانی روپے کے مساوی ہوتے ہیں، قرض دہندہ دس ہزار ریال حوالہ کر دیتا ہے، اب جب قرض کی ادائیگی کا وقت آیا تو فرض کیجئے کہ ہندوستانی ایک لاکھ روپے نو ہزار ریال کے مساوی ہو گئے ہیں یا کسی شخص نے ایک سامان ہندوستانی پچاس ہزار روپے میں خرید کیا اور اس وقت کے مروج نرخ کے لحاظ سے پانچ ہزار ریال ادا کر دیئے، پھر جب سامان پر قبضہ کرنے کا وقت آیا تو ہندوستانی روپے کی قیمت سابقہ نرخ کے مقابلہ میں بڑھ یا گھٹ گئی تھی، تو سوال یہ ہے کہ اب پہلی صورت میں قرض دہندہ دس ہزار ریال وصول کرے یا نو ہزار ریال اور دوسری صورت میں اگر قیمت بڑھ گئی ہو تو فروخت کنندہ اور گھٹ گئی ہو تو خریدار کو مزید ریال کی واپسی کے مطالبہ کا حق ہوگا یا نہیں؟..... جو لوگ بیرون ملک مقیم ہیں، وہ لوگ اکثر اوقات اس سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔

میرے خیال میں اس مسئلہ کی بنیاد اس پر ہے کہ معاملہ کس ملک کی کرنسی پر طے پایا تھا؟ وہ کرنسی اصل ہوگی

اور اس کے مقابل دوسری کرنسی کی قیمت میں جو اتار چڑھاؤ ہوگا اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً مذکورہ دونوں معاملات اصل میں ہندوستانی روپے پر طے پائے تھے، اس لئے ہندوستانی روپے ہی معتبر ہوں گے، اگر اس نے ریال کی شکل میں روپے ادا کئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے معاملہ کے دوسرے فریق کو اپنی طرف سے اس بات کا وکیل بنایا ہے کہ وہ اس ریال کو بھنا کر اس کے ذریعہ اپنی مطلوبہ چیز حاصل کر لے۔ علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ”قرش“ کے ذریعہ خرید و فروخت کا ایک جزئیہ نقل کیا ہے جس سے اس پر روشنی پڑتی ہے:

”ثم ان انواع العملة المضروبة تقوم بالقروش فمنها ميساوي عشرة قروش و منها اقل و منها اكثر فاذا اشترى بمائة قرش فالعادة انه يدفع ما اراد ادا مامن القروش او مما يساويها من بقية انواع العملة من ريال او ذهب ولا يفهم احد ان الشراء وقع بنفس القطعة المسماة قرشا بل هي او ميساويها من انواع العملة المتساوية في الرواج المختلفة في المالية.“^۱

ترجمہ: ”ڈھلے ہوئے سکوں کی قیمت قروش سے لگائی جائے گی چنانچہ بعض سکے دس قرش کے برابر ہوتا ہے اور کچھ سکے دس قرش سے کم ہوتے ہیں اور بعض اس سے زیادہ۔ پس اگر کسی نے سو قرش کے ذریعہ کوئی چیز خریدی تو عرف یہ ہے کہ یا تو اتنا ہی قرش ادا کر لے جو فریقین کا مقصود ہے یا دوسرے سکے مثلاً اتنا ہی ریال یا سونا جو اتنے قرش کی قیمت کا ہے۔ ایسے معاملہ میں کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا ہے کہ محض وہ ٹکڑا خرید کرنا مقصود ہے جس کو ”قرش“ کہتے ہیں۔ بلکہ وہ یا اس کے برابر کوئی اور سکے جو مروج ہے گو مالیت میں مختلف ہے۔“

اجارہ و ذرائع معاش

فوٹو گرافی و مجسمہ سازی کا پیشہ

ذی روح کا مجسمہ بنانا اسلام میں قطعاً حرام ہے اور جمہور علماء اور محدثین کے نزدیک یہی حکم ذی روح تصاویر کا بھی ہے، فوٹو گرافی بھی تصویر کشی ہی ہے نہ کہ عکس سازی، اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی صنعت و حرفت اور

خرید و فروخت نیز اس کو ذریعہ معاش بنانا جائز ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کی ایک روایت میں اس کی صراحت موجود ہے..... امام نووی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”وبیع الا صنم والصور المتخذة من الذهب والفضة وغيرها ثلاثة اوجه اصحاب البطلان وبه قطع كثيرون.“^۱

بالخصوص ایسی مورتیاں بنانا یا ایسی شخصیتوں کی تصویر کھینچنا جن کی پرستش کی جاتی ہو سگین ترین گناہ ہے اس لئے کہ یہ نہ صرف گناہ میں بلکہ امور کفر میں براہ راست تعاون کرنے کے مترادف ہے۔ صلیب باوجود اس کے کہ تصویر نہیں ہے مگر چوں کہ عیسائی اسے مذہبی شعار کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اس لئے حضور ﷺ نے اس کو توڑنے کا باضابطہ حکم دے دیا تھا۔

ہاں غیر ذی روح جیسے عمارتوں، پھلوں، پھولوں وغیرہ کی تصویریں بالاتفاق جائز ہیں۔ اس لئے ان کے بنانے اور اس صنعت کو ذریعہ معاش کی حیثیت سے اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا کی جس روایت کا ذکر کیا گیا ہے اس میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

آلات موسیقی کی خرید و فروخت

آلات موسیقی سے لذت اندوز ہونا اور گانا بجانا جائز اور حرام ہے۔ احادیث میں اس پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔ اس لئے یہ تو ظاہر ہے کہ یہ اسباب معصیت ہیں، ایسے آلات کے سلسلے میں فقہاء نے یہ اصول بتایا ہے کہ بعینہ ان آلات کا خریدنا اور بیچنا جائز نہیں البتہ ایسی چیزوں کا بیچنا درست ہے جو ترمیم و تبدیلی کے بعد آلات معصیت بن جاتے ہوں۔ مثلاً بانسری کا بیچنا درست نہیں ہے لیکن لکڑی کا بیچنا جائز ہے جس سے بانسری بنائی جاسکے۔ علامہ ابن عابدین شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”وعلم من هذا انه لا يكره بيع ما لم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية والكبش النطوح و الحمامة الطيارة والعصير و الخشب ممن يتخذ منه المعازف.“^۲

ترجمہ: ”اس سے معلوم ہوا کہ ایسی چیز کی بیع مکروہ نہیں ہے جس (کی ذات) سے معصیت نہ ہو۔ مثلاً گلوکارہ باندی، سینک مارنے والا (ترتیب یافتہ) مینڈھا، تیز اڑنے والی کبوتری، پھلوں کے

^۱ بخاری عن ابن عباس رضي الله تعالى عنه: ۲۹۶/۱ باب التصاوير التي ليس فيها روح و ما يكره ذلك

^۲ شرح مہذب: ۲۵۶/۹ رد المحتار، کتاب الکراہیۃ فصل فی البیع: ۲۵۰/۵

رس اور وہ لکڑی جس سے بانسری بنائی جاتی ہے۔“

اور خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

”ولو اجر نفسه من ذمی لیعصر له فیتخذ خمرا یکره لقوله عليه الصلوة والسلام لعن الله فی خمر عسرا ولو اجر لیعمل فی الكنيسة فلا بأس به لانه ليس فی عين العمل معصية وفي كتاب الا شربة للامام السر خسی لا بأس ببيع العصير ممن يتخذہ خمرا و عندهما یکره.“

ترجمہ: ”اگر کسی ذمی کے پاس مزدوری کرے تاکہ اس کے لئے رس نچوڑے کہ اس کی شراب بنائی جائے تو حضور ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے مکروہ ہوگا کہ شراب میں (اس کے متعلقات سمیت) دس آدمیوں پر خدا کی لعنت ہے اور اگر گرجا میں کام کرنے کے لئے ملازم ہوگا تو کوئی حرج نہیں اس لئے کہ یہ کام بذات خود معصیت نہیں ہے..... اور امام سرخسی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کی کتاب الا شربة میں ہے کہ ایسے رس کی بیع میں کوئی مضائقہ نہیں جس سے شراب بنائی جائے، ہاں صاحبین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک مکروہ ہے۔“

نیز امام نووی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”آلات الملاهي كالزممار والطنبور وغيرهما ان كانت بحيث لاتعد بعد الرض والحل مالالم يصح بيعها لانه ليس فيها منفعة شرعا.“

ترجمہ: ”لہو و لعب کے ساز و سامان جیسے سارنگی اور ڈھول، اگر توڑنے اور کھول دینے کے بعد یہ مال شمار نہ ہوں تو ان کی فروختگی درست نہیں کیوں کہ شرعاً اس میں کوئی منفعت نہیں۔“

فلم اور ٹیلی ویژن کو ذریعہ معاش بنانا

فلم اگر ذی روح تصویروں پر مشتمل ہو یا اس کے ذریعہ غیر اخلاقی باتوں کی تشہیر کی جائے تو اس کا دیکھنا حرام ہے اور اس کا بنانا اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسی طرح اس کو دکھانا اور اس کو اپنے لئے ذریعہ معاش بنانا سنگین ترین گناہ ہے کہ یہ برائی ہی نہیں ہے بلکہ برائی کی دعوت دینا بھی ہے اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی بھی حرام ہے:

گزشتہ زمانے میں بعینہ فلم تو موجود نہیں تھی لیکن رقص و نغمہ کا سلسلہ تھا اور فقہاء نے اس کی اجرت کو حرام

قرار دیا ہے۔ ابوالبرکات رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”ولا يجوز على الغناء والنوح والملاهي.“^۱

ترجمہ: ”گانے بجانے، مردوں پر نوحہ کرنے اور لہو و لعب پر اجارہ جائز نہیں ہے۔“

قلم میں یہ مفاسد زیادہ قوت اور کثرت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کے ذریعہ کسب معاش کی شناعیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ٹی وی بھی اگر اس قسم کی تصویروں پر مشتمل ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ ہاں البتہ ٹی وی سازی اور اس کی اصلاح و مرمت کا کام جائز ہونا چاہئے کیوں کہ ٹی وی اپنی اصل کے لحاظ سے آلہ لہو و لعب نہیں ہے، اس کو اصلاحی، تعلیمی، تربیتی اور سائنسی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور جو چیز فی نفسہ برائی کے لئے نہ ہو مگر انسان برائی کے لئے اس کا استعمال کر لے فقہاء نے اس کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا ہے:

”وعلم من هذا انه لا يكره بيع مالم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية

والكباش النطوح والحمامة الطيارة والعصير والخشب ممن يتخذ منه المعازف.“^۲

ترجمہ: ”اس سے معلوم ہوا کہ ایسی چیز کی بیع مکروہ نہیں ہے جس کی ذات سے معصیت نہ ہو مثلاً

گلوکارہ باندی، سینک مارنے والا (تربیت یافتہ) مینڈھا، تیز اڑنے والا کبوتر، پھلوں کے رس اور وہ لکڑی جس سے بانسری بنائی جاتی ہے۔“

اس لئے ٹی وی کی صنعت، تجارت اور اصلاح و مرمت جائز ہوگی۔ البتہ چوں کہ اب تک اس کا غالب استعمال شر کے لئے ہے اس لئے اس سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

بینک کی ملازمت

سود میں خود ملوث اور مبتلا ہونا ہی گناہ نہیں ہے بلکہ اس کے کاروبار میں مدد و معاون ہونا بھی معصیت ہے۔ یوں تو تمام ہی گناہ کے کاموں میں اعانت ناپسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”لا تعاونوا على الاثم والعدوان“ لیکن خصوصیت سے سود کے متعلق آپ ﷺ کی صراحت موجود ہے۔ حضرت جابر رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے مروی ہے:

”لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم اكل الربوا ومؤكله وكاتبه وشاهديه

وقال هم سواء۔^۱

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے اور اس کے کاتب نیز گواہوں سبھی پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ وہ سبھی برابر ہیں۔“

یہاں سود کے لکھنے والوں اور گواہوں پر حضور ﷺ کی لعنت سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں آدمی کسی ذمہ دارانہ عہدہ پر فائز ہو یا سودی معاملات لکھنے پڑتے ہوں جائز نہیں ہے، اس لئے کہ ان کی حیثیت ربو کے کاتبین اور گواہوں کی ہوگئی اور ان کو حضور ﷺ نے نہ صرف یہ کہ ملعون قرار دیا ہے بلکہ سود خوروں کے مساوی قرار دیا ہے۔

ہاں ایسی ذمہ داریاں جن کا تعلق براہ راست سودی کاروبار سے نہ ہو بلکہ وہ بینک کے دوسرے کام یا اس کی حفاظت پر ملازم ہوں، ان کے لئے اس ملازمت کا جاری رکھنا یا حاصل کرنا جائز ہے۔ یہ تو اصل حکم ہے لیکن ایسے شخص کے لئے جو معاشی اعتبار سے بالکل مفلوج ہو، کوئی دوسری ملازمت اور ذریعہ معاش حاصل نہ ہو اور ملازمت ترک کر دے تو فاقہ کا اندیشہ ہو ایسے ملازمین بینک کو چاہئے کہ وہ موجودہ ملازمت پر قانع ہونے کی بجائے خوب متلاشی اور کوشاں رہیں کہ کوئی دوسرا بہتر اور پاک ذریعہ معاش حاصل ہو جائے۔ ایک مجبوری کے بطور اسے کرتے رہیں اس لئے کہ اگر وہ یہ ملازمت بہ یک قلم ترک کر دیں اور کوئی دوسری صورت سامنے نہ ہو تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ فقر و افلاس ان کو کسی اور گناہ میں مبتلا کر دے۔ البتہ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو اقتصادی اعتبار سے بالکل مجبور و بے بس ہوں، نہ یہ کہ تعیش اور راحت طلبی مقصود ہو۔

واللہ یعلم بذات الصدور۔

غیر اسلامی حکومت میں کلیدی عہدے

ایک اہم سوال یہ ہے کہ غیر اسلامی مملکت کے کلیدی عہدوں صدارت، وزارت، تحفظ و دفاع، عدلیہ اور رکنیت پارلیمنٹ پر فائز ہونا جائز ہوگا یا نہیں؟ جب کہ ایسی ملازمتوں میں سیکولر اور غیر مذہبی ریاست ہونے کے لحاظ سے اسلامی قانون اور منصوص احکام کے خلاف فیصلوں میں شریک ہونا اور اس کی تنفیذ کا ذریعہ بننا پڑے گا۔ اصولی طور پر ظاہر ہے کہ یہ بات جائز نہ ہوگی۔ اس لئے کہ کسی صیغہ کی محض ملازمت سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ وہ کسی گنہگار نہ اور خلاف شرع فیصلہ کا اور اس کے نفاذ اور ترویج کا ذریعہ بنے اور عملاً حاکمیت الہی کا انکار

^۱ صحیح مسلم عن جابر: ۲۷/۲ باب الربا

کرے۔

مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر مسلمان ایسی ملازمتوں سے یکسر کنارہ کش اور سبکدوش ہو جائیں تو اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ اسلام کے بچے کھچے آثار اور مسلمانوں کے دینی، تہذیبی اور قومی مفادات کا تحفظ دشوار ہو جائے گا اور مسلمان اس مملکت میں سیاسی اعتبار سے مفلوج، تہذیبی اور مذہبی لحاظ سے مجبور اور اچھوت شہری بن کر رہ جائیں گے اس لئے اس اہم تر مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے عہدوں کو بھی قبول کیا جائے گا، بلکہ مصلحتیہ ان کے حصول کی کوشش کی جائے گی۔ البتہ دل میں اس غیر اسلامی نظام کی طرف سے ایک چھین، اس پر بے اطمینانی اور اسلام کی بالاتری کا احساس تازہ رہنا چاہئے اور موجودہ حالات کو ایک مجبوری کے طور پر گوارا کرتے رہنا چاہئے۔

اس کی نظیر حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون مصر کے خزانہ کی وزارت کی ذمہ داری قبول کرنا بلکہ اس کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا ہے۔

فقہاء کے یہاں بھی ایسی نظیریں موجود ہیں مثلاً زکوٰۃ کی تقسیم کا کام ایسے شخص کو لے لینا باعث اجر قرار دیا گیا جو عدل کے ساتھ اس کام کو کر سکتا ہو تا کہ ظلم سے تحفظ ہو سکے:

”و یوجر من قام بتوزیعها بالعدل بان یحمل کل واحد بقدر طاقته لانه لو

ترك توزیعها الى الظالم ربما یحمل بعضهم مالا یطیق فیصیر ظلما علی ظلم

ففی قیام العارف بتوزیعها بالعدل تقلیل للظلم فلذا یوجر.“^۱

ترجمہ: ”ہاں وہ شخص ماجر ہوگا جو عدل کے ساتھ تقسیم کا فریضہ انجام دے کہ وہ ہر ایک پر اس کی

طاقت کے بقدر لازم کرے اس لئے کہ وہ اس کی تقسیم کا کام کسی ظالم کو سونپ دے تو بسا اوقات وہ

بعض لوگوں پر ان کی طاقت سے زیادہ لازم کر دیں گے اور یہ ظلم بالائے ظلم ہو جائے گا۔ لہذا ایسے

آدمی کا اس ذمہ داری کو قبول کرنا جو عدل کے ساتھ تقسیم سے واقف ہو۔ ظلم کو کم کرے گا اور اس لئے

اجر کا حق دار ہوگا۔“

دینی کاموں پر اجرت

ہمارے زمانے کا ایک اہم مسئلہ دینی کاموں پر اجرت کا ہے دینی کاموں سے وہ خدمات مراد ہیں جو مسلمانوں ہی سے متعلق ہیں، بہ حیثیت مسلمان انجام دی جاتی ہیں اور دراصل اس کے نفع و ضرر اور اس پر اجر و

^۱ رد المحتار قبیل باب المصروف من کتاب الزکوٰۃ: ۶۲/۲ ط: مکتبہ ماجدیہ پاکستان

ثواب اور اس سے غفلت و بے اعتنائی پر عذاب و عقاب کا علاقہ بھی آخرت ہی سے ہے۔
اخلاص اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں اس کی کوئی قیمت وصول نہ کی جائے۔ اگر ان خدمات کی بھی قیمت متعین کی جائے لگے تو آخر عبادت گاہوں اور تجارت گاہوں میں کیا فرق باقی رہ جائے گا؟ ان ہی طاعات میں قرآن مجید اور علوم دینیہ کی تعلیم، امامت و اذان وغیرہ داخل ہے۔

لیکن اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آج کے دور میں اگر آپ ”خادمین دین“ پر اس تعاون کا دروازہ بند کر دیں اور گویا عملاً اس پر مجبور کر دیں کہ وہ اپنے اہل حق کی ضروریات کی تکمیل اور کسبِ معاش کے لئے طلب مال کی اس ریس میں شریک ہو جائیں جو آج ہر بڑے چھوٹے کو دیوانہ کئے ہوئے ہے تو اس سے دین کا سخت خسارہ ہوگا۔ علوم اسلامی کی تعلیم و تعلیم کا سلسلہ مسدود ہو کر رہ جائے گا۔ مساجد میں اوقات نماز کی پابندی اور اہل ولایت ائمہ و موزنین کی فراہمی مشکل ہو کر رہ جائے گی اور اس طرح دین کے ایک تقاضہ کی تکمیل کر کے بہت سی مصلحتیں بھینٹ چڑھ جائیں گی۔

تصویر کے یہ دورخ ہیں اور ضروری ہے کہ ان دونوں کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کیا جائے۔ پھر اس سلسلہ میں نصوص اور کتاب و سنت کی تصریحات بھی مختلف ہیں۔ بعض سے جواز معلوم ہوتا ہے اور بعض سے ناپسندیدگی کا اظہار اور اس کا نادرست ہونا۔ چنانچہ اسی بناء پر امام شافعی، امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک تعلیم قرآن پر اجرت لی جاسکتی ہے جب کہ امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی بھی کارطاعت پر اجرت لینا درست نہیں ہوگا اور نہ اس قسم کا اجارہ ہی صحیح ہوگا۔ یعنی اگر کسی شخص نے کسی سے اجرت پر یہ معاملہ طے کیا کہ وہ ایک ماہ اس کو قرآن مجید کی تعلیم دے اور بطور اجرت پچاس روپے لے لے۔ اول تو یہ معاملہ ہی صحیح نہ ہوگا کہ وہ ایک ماہ کے لئے اس کے یہاں جا کر اسے پڑھائے یہ ضروری نہیں۔ دوسرے اگر اس نے ایک ماہ پڑھا بھی دیا تو اس کی کوئی اجرت پڑھنے والے پر واجب نہ ہوگی۔

لیکن یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ سلف صالحین اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے زمانے میں علماء اور ارباب افتاء کو اپنی ضروریات کی تکمیل اور زندگی گزارنے کے لئے بیت المال کی جانب سے وظائف، جاگیریں اور بڑی اعانتیں مقرر تھیں جس سے فراخی اور وسعت کے ساتھ ان کی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں خلافت راشدہ کے اختتام، مملکت کی اسلامی تعلیمات سے دوری اور ہولناک نیز خدانا ترس بادشاہوں کے علماء سے استغناء کی بناء پر یہ صورت ختم ہو گئی اور ان کے لئے بظاہر اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے کوئی سہارا باقی نہ رہا۔

ان حالات میں یہ بات ناگزیر ہو گئی کہ بڑی مصلحتوں کے تحفظ کے لئے دینی خدمات پر اجرت لینے کی

اجازت دی جاتی۔ چنانچہ فقیہ ابواللیث رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا مشہور قول ہے کہ میں تین چیزوں کو ناجائز سمجھتا تھا اور اسی کا فتویٰ دیتا تھا جن میں سے ایک تعلیم قرآن پر اجرت لینے کا مسئلہ بھی تھا۔ مگر پھر تعلیم قرآن کے ضائع ہونے کے اندیشہ سے اس کی اجازت دے دی..... مگر اس وقت تک یہ اجازت صرف تعلیم قرآن کی حد تک تھی، جیسا کہ صاحب کنز جو ساتویں صدی کے ہیں اور صاحب ہدایہ جو چھٹی صدی کے ہیں کی آراء سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر مختصر وقایہ کے مصنف نے جن کی وفات ۷۴۷ھ میں ہے تعلیم فقہ پر اجرت کو جائز قرار دیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ امامت، اذان اور ہر قسم کی دینی تعلیم کے لئے اجرت لینا درست اور جائز قرار پایا۔ علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے رسائل جو ”رسائل ابن عابدین“ سے معروف ہیں اس میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

امہ ثلاثہ ابو حنیفہ، ابو یوسف و محمد رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی کی تمام منقول روایتیں اس پر متفق ہیں کہ طاعات پر اجیر رکھنا باطل ہے۔ لیکن ان حضرات کے بعد جو اہل تخریج و ترجیح گزرے ہیں انہوں نے تعلیم قرآن پر اجرت کے جائز ہونے کا فتویٰ ضرورہ دے دیا اس لئے کہ پہلے معلموں کو بیت المال سے عطیات ملتے تھے جو کہ ختم ہو گئے پس اگر اجرت کے دینے اور لینے کو ناجائز کہا جائے تو قرآن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے جس میں دین کا ضیاع ہے اس لئے کہ معلمین بھی تو کھانے کمانے کے محتاج ہیں۔ اصحاب تخریج و ترجیح ان حضرات کے بعد گزرے انہوں نے اذان و اقامت کے بارے میں بھی جواز اجرت کا فتویٰ دے دیا اس لئے کہ یہ دونوں شعائر میں سے ہیں ضرورہ ان دونوں کے بارے میں بھی اجرت لینا جائز قرار دیا..... یہ ان لوگوں کے فتاویٰ ہیں جو امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اور ان کے اصحاب کے بعد گزرے ہیں اور یہ انہوں نے اس یقین کے ساتھ دیا کہ اگر وہ حضرات بھی ان کے دور میں ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے اور اپنے پہلے قول سے رجوع کر لیتے۔ تمام متون و شروح و فتاویٰ بالاتفاق اس بات کو نقل کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا چیزوں کے علاوہ اور چیزوں پر اجرت لینا جائز نہیں اور اس کی علت، ضرورت بیان کرتے ہیں یعنی دین کے ضیاع کا خطرہ اور اس علت کی ان حضرات نے تصریح کر دی ہے۔

اس کے علاوہ تعلیم قرآن پر اجرت کے جائز ہونے کی جو منصوص دلیلیں اور نظیریں ہیں وہ بھی بہت قوی ہیں اور منشاء دین سے قریب ہیں۔ اس کے برخلاف جو روایات تعلیم قرآن پر اجرت کے نادرست ہونے کو بتلاتی ہیں وہ عموماً مبہم ہیں اور اس مقصد میں بے غبار نہیں..... ان کی تطبیق کی یہ شکل بہت بہتر ہے کہ جس سے جائز نہ ہونا معلوم ہوتا ہے..... اس کو تقویٰ پر محمول کیا جائے اور یہ حکم ان علماء کے بارے میں ہو جو اس کے ضرورت مند نہ

ہوں اور اس سے مستغنی ہوں اور جہاں اجازت ہے وہ از روئے فتویٰ ہو اور ان لوگوں کے لئے ہو جو واقعی اس کے ضرورت مند ہیں۔ جیسا کہ بیہقی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی روایت میں ہے، جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو ان میں سب سے زیادہ اجرت کی حق دار قرآن مجید ہے۔ ”احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللہ“^۱۔ احناف رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں ناجائز ہونے کے باوجود چوں کہ ضرورت اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اس لئے ان ہی امور میں اجرت لینا درست ہوگی جو ایک طرف تو ایسی ضرورت ہو کہ اس کو نظر انداز کر دینے سے دین کی بڑی مصلحتوں کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو، دوسری طرف وہ کام خود ایسا ہو کہ اس کے لئے مستقل وقت درکار ہو۔

تعطیلات اور رخصتوں کی تنخواہیں

یہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ مدرسین اور خادمین دین کو جن کا ہفتہ میں ایک دن تعطیل کا ہوتا ہے یا سال میں بعض طویل تعطیلات دی جاتی ہیں ان کی تنخواہیں دی جائیں گی یا نہیں؟

اس سلسلہ میں یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہئے کہ مدرسہ کی انتظامیہ کی حیثیت عوام کی طرف سے وکیل اور نمائندہ کی ہوتی ہے اور مدرسین بالواسطہ عوام کے اجیر ہوتے ہیں۔ اس طرح چندہ دینے والے عام لوگ مدرسین کے لئے جتنے دنوں کی رخصت یا تنخواہ اور عام تعطیل کو گوارہ کریں اتنے دنوں اساتذہ کے لئے اس کا حق حاصل ہے۔ یہی حال بیماری کی رخصت کا بھی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہر چندہ دینے والے سے اس کی تحقیق اور اس پر رائے لینا دشوار ہی نہیں تقریباً محال ہے۔ ان حالات میں دراصل عرف و عادت کا اعتبار ہے اور عرف یہ ہے کہ مدرسہ کی بڑی تعطیلات عموماً مشہور ہیں اور یا تنخواہ اتفاقی اور مرض کی وجہ سے رخصت کا ضابطہ بھی عام ہے اس کے باوجود عام مسلمان، مدرسوں کا تعاون کرتے ہیں اور اس پر اعتراض نہیں کرتے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں یہ رخصتیں اور تعطیلات گوارہ ہیں۔ لہذا ان کا تنخواہ لینا اور دینا جائز ہوگا۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے ”العادة محكمة“ کے اصول کے تحت اسے جائز رکھا ہے اور یہی رائے علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی بھی ہے۔ اور فقیہ ابواللیث رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی بھی، فرماتے ہیں:

”حيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلاثاء والجمعة وفي رمضان والعیدین

یحل الاخذ وكذا لو بطل في غير معتاد لتحرير درس الا اذانص الواقف علی

تقييد الدفع باليوم اناذی يدرس فيه قال الفقيه ابوالليث ان ياخذ

۱۔ الميزان الكبرى: ۱۰۹/۲ کتاب الاجارہ، امام عبدالوہاب شعرانی کا رجحان بھی دونوں حدیثوں میں تطبیق دینے کی طرف ہے۔

الاجرم من طلبۃ العلم فی یوم لادرس فیہ ارجو ان یکون جائزا۔^۱
 ترجمہ: ”جہاں منگل اور جمعہ کو نیز رمضان کی اور عیدین میں تعطیل رہا کرتی ہوں ان دنوں کی تنخواہ لینا حلال ہے۔ ایسے ہی اگر خلاف عادت کسی دن درس قلم بند کرنے کے لئے فرصت دے دی تو بھی تنخواہ لے سکتا ہے سوائے اس کے کہ وقف کرنے والا صرف ان ہی ایام کی تنخواہ دینے کی قید لگا دے جس میں درس ہوا کرے..... فقیہ ابواللیث رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اگر استاد طلبہ سے ایسے دن کی اجرت بھی لے جس میں درس نہ ہوا ہو تو امید ہے کہ یہ جائز ہوگا۔“

ریلوے، بس ٹکٹ کی حیثیت

ریلوے، بس ٹکٹ وغیرہ کی حیثیت اجارہ کے وثیقہ کی ہے۔ یہ گویا اس بات کی سند ہے کہ ہم نے کرایہ ادا کر دیا ہے۔ اس لئے ہمیں سواری کرنے کا حق حاصل ہے۔ عام اجارہ میں اور اس میں صرف اس قدر فرق ہے کہ یہاں اجرت یعنی کرایہ پہلے وصول کر لیا جاتا ہے تاکہ نظم میں سہولت ہو۔
 بس اور ریلوے میں اصل مالک اور ”آجر“ حکومت ہوتی ہے۔ مسافروں کی حیثیت کرایہ داروں اور ”مستاجروں“ کی ہے۔ ٹکٹ دینے والے حکومت کے وکیل ہوتے ہیں۔ جب یہ بات معلوم ہے کہ حکومت نے بلا ٹکٹ سفر کی اجازت نہیں دی ہے تو اب کسی بھی صورت بلا ٹکٹ سفر کرنا درست نہیں۔ چاہے ریلوے اور بس کے سرکاری عہدہ دار بلا ٹکٹ چلنے کی اجازت ہی کیوں نہ دے دیں۔ ٹکٹ کے بغیر سفر سفر معصیت ہے اور گویا اس کی حیثیت غاصب کی ہے۔

کمیشن ایجنٹ

کمیشن ایجنٹ کا کاروبار ان دنوں کافی بڑھ گیا، تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر دونوعیت کے کاروبار کئے جاتے ہیں، کبھی تو ایجنٹ ایک سے مال خرید کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، مثلاً اینٹ پانچ سو روپے لاری ہے، ایجنٹ آرڈر حاصل کر کے اینٹ لیتے ہیں اور اکثر اوقات بھٹی سے سیدھے اصل خریدار کے ہاں بھیج دیتے ہیں، خریدار کو اپنے مرکز سے بھی اسی قیمت میں اینٹ ملتی ہے۔ لیکن ایجنٹوں کو دس فی صد کم قیمت پر مل جاتی ہیں اور یہی اس کا نفع ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ اصول یاد رکھنا چاہئے کہ احناف کے ہاں کسی بھی شے کا بیچنا اسی وقت جائز ہوگا جب پہلے خود اس کا قبضہ ہو جائے..... اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبضہ کرنے سے پہلے ہی اس کو فروخت کرنے

سے منع فرمایا ہے۔^۱

منتقل ہونے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جانے والی اشیاء پہلے اپنی تحویل میں لے لی جائے ایجنٹ کا اپنی لاری پر اینٹ اٹھوالینا گویا اپنی تحویل اور قبضہ میں لے لینا ہے۔ اس لئے اب اس کا نفع کے ساتھ فروخت کرنا درست ہے۔ ہاں اگر وہ خریدار سے کہے کہ اپنی لاری لا کر اس مرکز سے اینٹ حاصل کر لو اور خود جا کر ان اینٹوں کو علاحدہ نہ کرائے، تو چوں کہ یہ قبضہ سے پہلے سامان فروخت کرنا ہے، اس لئے ایجنٹ کا یہ کاروبار درست نہ ہوگا۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایجنٹ صرف خریدار تیار کرتا ہے اور اس ترغیب کے عوض اس کو تاجر کچھ فی صد نفع دیتے ہیں یہ صورت بھی جائز ہوگی۔ اس لئے کہ یہ اس کی محنت اور ترغیب کی اجرت ہے جس کے جائز نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

بینک کے لئے مکان کرایہ پر دینا

بینک ایک سودی کاروبار ہے، اس لئے اگر پہلے سے مقصد معلوم ہو تو خالص اس مقصد کے لئے مکان کرایہ پر دینا جائز نہ ہوگا کہ یہ معصیت میں ایک طرح کا تعاون ہے۔ ہاں اگر یوں ہی کسی نے کرایہ پر مکان لے لیا اور بعد کو اس میں بینک قائم کر دیا۔ تو اب اس پر کوئی بار گناہ نہیں، امام سرخسی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں۔

”لا بأس بان یو اجر المسلم دارا من الذمی لیسکنها فان شرب فیہا الخمر او عبد فیہا الصلیب أو أدخل فیہا الخنازیر لم یلحق للمسلم اثم فی شیء من ذالک لانه لم یو اجرها لذلک والمعصیة فی فعل المستاجر دون قصد رب الدار فلا اثم علی رب الدار فی ذالک“^۲

ترجمہ: ”مسلمان، ذمی کو کوئی گھر رہائش کے لئے دے۔ اس میں منما نقہ نہیں۔ پھر اگر وہ اس میں شراب پئے، صلیب کی پرستش کرے یا سور داخل کرے، تو مسلمان کو ان کا کوئی گناہ نہ ہوگا، اس لئے کہ اس نے اس مقصد کے لئے نہیں دیا ہے۔ گناہ کرایہ دار کا عمل ہے اور اس کے اس عمل میں صاحب مکان کے ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لئے اس پر کوئی گناہ نہیں۔“

بعض فقہاء کے اقوال سے جواز بھی معلوم ہوتا ہے۔ مگر شریعت کا مزاج اسے قبول کرتا نظر نہیں آتا۔ واللہ

اعلم۔

۱۔ موطا امام مالک عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باب العینة وما یشبہا وبيع الطعام قبل ان

۲۔ المبسوط: ۳۰۹/۱۶

یستوفوا۔

مویشیوں میں بٹائی

آج کل مویشیوں میں بٹائی پر لین دین اور ادھیا پر دینے کا عام رواج ہے فقہاء حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی اجازت ہے احناف رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے البتہ یہ حیلہ بتلایا ہے کہ اس کا آدھا حصہ پرورش کرنے والے کے ہاتھ فروخت کر دے اور پھر اس کو قیمت سے بری الذمہ کر دے، اس طرح جانور میں دونوں کی شرکت ہو جائے گی اور اس سے حاصل ہونے والے منافع دودھ اور بچوں میں دونوں شریک ہو جائیں گے۔

”والحيلة في جوازه ان يبيع نصف البقرة منه بثمان و يبرئه عنه ثم ما يامر باتخاذ اللبن و المصل فيكون بينهما و كذا لو دفع الدجاج على ان يكون البيض بينهما.“^۱

ترجمہ: ”اس کے جواز کے لئے حیلہ یہ ہے کہ جانور کا نصف پالنے والے کے ہاتھ فروخت کر دے اور پھر قیمت معاف کر دے، پھر دودھ اور گھی وغیرہ حاصل کرنے کا حکم کرے اور حاصل ہونے والی چیزیں دونوں کے درمیان تقسیم ہوا کریں گی اور ایسا ہی حکم ہوگا اگر مرغی کو اس شرط پر دیا ہو کہ انڈے دونوں کے درمیان تقسیم ہوا کریں گے۔“

راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس تکلف کی بجائے موجودہ زمانہ میں عرف و رواج کی بنیاد پر حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ کا رجحان بھی اسی طرف ہے، اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔

”كتب الى بعض الاصحاح من فتاوى ابن تيمية كتاب الاختيارات مانصه ولو دفع دابته او نخله الى من يقوم له، وله جزء من نمائه صح وهو رواية عن احمد“^۲
پس حنفیہ کے قواعد پر تو یہ عقد ناجائز ہے، کما نقل فی السؤال عن العالمگیریہ، لیکن بنا بر نقل بعض اصحاب امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس میں جواز کی گنجائش ہے، پس تحرز احوط ہے اور جہاں ابتلاء شدید ہو تو وسع کیا جاسکتا ہے۔“^۳

تعمیری معاہدات میں اخراجات غیر معمولی حد تک بڑھ جائیں

آج کل تعمیری کاموں میں پرفٹ کچھ رقم کے حساب سے معاملہ طے پاتا ہے بعض اوقات تعمیری سامان کی

قیمت میں اچانک غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں ٹھیکہ دار پر خسارہ برداشت کر کے کام کی تکمیل واجب ہے یا وہ ایک طرفہ طور پر اجرت میں اضافہ کر سکتا ہے؟ بازار میں مسلسل اتار چڑھاؤ اور نشیب و فراز کی وجہ سے ان دنوں یہ مسئلہ خصوصی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس سلسلہ میں فقہاء کی تصریحات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بنیادی طور پر ”اجارہ“ ہے۔ اجارہ ایک ”لازمی معاملہ“ ہے جس سے عام حالات میں ایک طرفہ طور پر سبکدوش نہیں ہوا جاسکتا۔ البتہ اعذار کی بناء پر اجارہ کا معاملہ ختم کیا جاسکتا ہے، ہدایہ میں ہے:

”وتفسخ الاجارة بالا عذار۔“^۱

اگر معاہدہ کی تکمیل میں اتنا زیادہ خسارہ ہو، جو عام طور پر تجارت میں ہونے والے امکانی خسارہ سے نمایاں طور پر بڑھ جائے، تو یہ بجائے خود ایک عذر ہے اور اس کی وجہ سے یہ معاہدہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ اگر تبدیل شدہ قیمتوں کے تناسب سے مالک اجرت میں اضافہ کے لئے تیار ہو تب تو معاملہ کو باقی رکھنا ہوگا اور اگر اس کے لئے تیار نہ ہو تو معاملہ فسخ کیا جائے گا، درمختار میں ہے:

”ولو ادعى رجل انها بغبن فاحش فان اخبر القاضى ذو خبرة انها كذا لك فسخها و تقبل الزيادة“^۲

ترجمہ: اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ اس معاملہ میں بہت زیادہ خسارہ ہے تو اگر قاضی کو کوئی ماہر آدمی بتلائے کہ معاملہ ایسا ہی ہے تو وہ اسے ختم کر دے گا اور اجرت کی زیادتی قابل قبول ہوگی۔“
شامی میں ہے:

”والمراد أن تزيد الأجرة في نفسها لغلو سعرها عند الكل، أما اذا زادت أجرة المثل لكثرة رغبة الناس في استئجاره فلا۔“^۳

ترجمہ: ”مراد ہر ایک کے نزدیک اس سے یہ ہے کہ قیمت کے چڑھاؤ کی وجہ سے خود اجرت میں اضافہ ہوا ہو۔ اگر اجرت مثل میں اضافہ اس لئے ہوا ہو کہ لوگ بہ کثرت اس کی طرف مائل ہونے لگے ہوں تو اس زیادتی کا اعتبار نہیں۔“

جعلی سرٹیفکٹ پر ملازمت اور اس کی آمدنی

افسوس کہ فریب کاری اس درجہ کو آ پہنچی ہے کہ آج تعلیمی اسناد کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے اور جعلی سرٹیفکٹ بھی ایک کاروبار بن گیا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی سرٹیفکٹ کی بنیاد پر ملازمت حاصل کر لے تو گو اس کی یہ جعل

سازی گناہ کبیرہ ہے اور وہ جھوٹ اور دھوکہ دہی کے دوہرے گناہ کا مرتکب ہے مگر اس کی کمائی ہوئی آمدنی حلال و جائز ہے کہ یہ اس کی محنت کی اجرت ہے، ایسا ممکن ہے کہ ذریعہ جائز نہ ہو اور کمائی جائز ہو، اس سلسلہ میں فقہ کا یہ جزئیہ قابل لحاظ ہے:

”ومهر البغی فی الحدیث هو أن یو اجر أمتہ علی الزنا وما أخذہ من المهر فهو حرام عند ہما و عند الامام ان اخذہ بغير عقد بان زنی بامتہ ثم أعطاہا شینافہو حرام لانہ أخذہ بغير حق، وان استاجرہا لیزنی بہائم أعطاہا مہرہا أو ما شرط لہا لا بأس بأخذہ لانہ أجرۃ فاسدۃ فیطیب لہ و ان کان السبب حراماً“

جاسوسی کی ملازمت

بعض دفعہ مسلمانوں کو ایسی ملازمتیں ملتی ہیں جن میں غیر مسلموں کی ظاہری وضع اختیار کرنی پڑتی ہے، خصوصیت سے ان لوگوں کا جو ”جاسوسی“ کے محکمہ سے تعلق رکھتے ہوں، کبھی دھوتی پہننی ہوتی ہے، قشقہ لگانا ہوتا ہے جو خالصہ ہندو مذہبی عمل ہے۔ اس سے امکان بھرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اگر یہی ملازمت میسر ہو اور اس کے سوا چارہ نہ ہو تو اس کو پیش نظر رکھے کہ غیر مسلموں سے مشابہت کا دو درجہ ہے، ایک ان کی قومی تہذیب میں مشابہت جیسے: دھوتی پہننا، دوسرے ان کے مذہبی شعائر میں مشابہت جیسے: قشقہ لگانا اور زنا پر پہننا، مشابہت کا پہلا درجہ نسبتاً خفیف ہے اور دوسرا درجہ نہایت شدید اور کفر یا قریب بہ کفر، تو کوشش کرے کہ پہلے درجہ کی مشابہت سے کام چل جائے، اگر یہ کافی نہ ہو تو بہ شدت مجبوری دوسرا درجہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ تاہم بہر صورت یہ وقتی اور عارضی فعل ہو، اسی کو اپنا مستقل طریقہ نہ بنالے۔

ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی بڑے پایہ کے فقیہ ہیں، ان کی صراحت سے اس سلسلہ میں روشنی ملتی ہے، فرماتے ہیں:

”ویکفر بوضع قلنسوة المجوس علی رأسہ علی الصحیح الا لضرورة دفع الحراو البرد و بشد الزنار فی وسطہ الا اذا فعل ذالک خدیعة فی الحرب و طلیعة للمسلمین“

ترجمہ: ”صحیح یہ ہے کہ سر پر مجوسی کی ٹوپی لگانے کی وجہ سے تکفیر کی جائے گی مگر یہ کہ کوئی ضرورت ہو جیسے گرمی و سردی سے بچنا ایسے ہی زنا پر باندھنے والے کو کافر سمجھا جائے گا سوائے اس کے کہ مسلمانوں کے لئے جاسوسی یا جنگ میں خوش تدبیری کے لئے ایسا کیا جائے۔“

سود و قمار

سودی قرض لینا

سود لینا اور دینا دونوں ہی گناہ اور معصیت ہے۔ بلکہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سود لینے والے اور دینے والے دونوں ہی گناہ میں برابر ہیں۔ والاخذ والمعطی فیہ سواء..... اس لئے اصولی طور پر ظاہر ہے کہ سودی قرض لینا درست نہ ہوگا۔ مگر کبھی کبھی ایسے قرض لینا ضرورت بن جاتا ہے اور تجارت، کاشت اور کاروبار کے لئے ایسے قرض لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں بدرجہ ضرورت ایسے قرض لینے کی اجازت ہوگی۔ البتہ یہ اجازت اسی وقت ہوگی جب آدمی اس کے لینے پر اس طرح مجبور ہو جائے کہ نہ لے تو کوئی ذریعہ معاش فراہم نہ ہو اور بنیادی ضرورتوں کھانا، کپڑا اور مکان کی تکمیل بھی ممکن نہ رہ سکے، محض تعیش، آرام طلبی اور معاشی معیار بلند کرنے کے لئے ایسا نہ کیا جائے، علامہ ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

”ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح.“^۱

ترجمہ: ”ضرورت مند کے لئے نفع کے ساتھ قرض حاصل کرنا درست ہے۔“

اور اسی پر علامہ حموی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے حاشیہ میں ہے:

”نحو ان یقرض عشرة دنانیر مثلاً و یجعل یربہا شینا معلوما فی کل یوم

ربحاً.“

ترجمہ: ”مثلاً دس دینار قرض دے اور ہر دن اس رقم پر نفع کی ایک متعین مقدار حاصل کرے۔“

یہ تو عام سودی ترضوں کا حکم ہے جس میں بینک بھی داخل ہے۔ سرکاری قرضہ جات میں جس کا اصل مقصد خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہوتا بلکہ ملک کا افلاس دور کرنا مقصود ہوتا ہے اور سود کے نام پر جس قدر نفع لیا جاتا ہے، بہت معمولی ہوتا ہے بعض علماء کے نزدیک اس میں مزید سہولت ہے۔ ان کے نزدیک عام حالات میں بھی ایسے قرض لینے کی گنجائش ہے گو کہ اس کو سود کا نام دے دیا گیا ہے مگر اس کو اس شعبہ کے ملازمین اور عملہ کی اجرت پر بھی محمول کر سکتے ہیں چنانچہ مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

اس معاملہ کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں

ہے بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں ان کی قیمت میں لی جاتی ہے جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے۔

بینک کا سود

بینک میں روپیہ جمع کرنے کے بعد مخصوص تناسب سے اس پر جو نفع ملتا ہے وہ سود ہے اس لئے کہ بینک کی حیثیت مقروض کی ہے اور یہ نفع قرض پر نفع حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ یہ نفع گویا اس مدت اور مہلت کے بدلے میں ہے جو سرمایہ دار نے بینک کو روپیہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں دے رکھی ہے۔ اور یہی سود کی وہ قسم ہے جو اسلام سے پہلے جاہلیت میں زیادہ رائج تھی۔ امام فخر الدین رازی رَحِمَہُ اللہ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

”اعلم ان الربا قسمان ربا بالنسيئة و ربا الفضل. امار با النسيئة فهو الامر الذي كان مشهورا متعارفا في الجاهلية و ذالك انهم كانوا يدفعون المال على ان ياخذوا كل شهر قدرا معيناً و يكون راس المال باقيا ثم اذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال فان تعذر عليه الاداء زادوا في الحق والاجل فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به.“^۱

ترجمہ: ”جاننا چاہئے کہ سود کی دو قسمیں ہیں ایک ”ربا نسیئہ“ دوسرے ”ربا فضل“..... ربانسیئہ ہی ایام جاہلیت میں زیادہ مشہور و مروج تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ لوگ اس شرط پر مال دیا کرتے تھے کہ وہ ہر مال پر ایک متعین مقدار لے لیا کریں گے اور اصل سرمایہ باقی رہے گا۔ پھر جب قرض کی مدت مکمل ہو جاتی تو وہ مقروض سے اصل قرض کا مطالبہ کرتے۔ پھر اگر اس کے لئے ادائیگی دشوار ہوتی تو مدت میں اضافہ کے ساتھ اپنے قرض کی رقم میں بھی اضافہ کر دیتے، یہی وہ سود ہے جس کا لوگ ایام جاہلیت میں معاملہ کیا کرتے تھے۔“

اس طرح یہ بات تو صاف ہو گئی کہ بینک سے حاصل ہونے والا اس قسم کا نفع اپنی اصل کے لحاظ سے سود میں داخل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں بھی یہی حکم ہوگا جہاں کہ اسلامی حکومت نہیں ہے یا یہ صرف ان ملکوں کے لئے ہے جہاں اسلامی حکومت ہو؟

تو ابتداء میں بعض علماء ہندوستان میں اس کو سود نہیں مانتے تھے اس لئے کہ یہ دارالاسلام نہیں دارالحرب ہے

اور دارالحرب میں امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں غیر مسلموں سے سود لینا درست ہے اور اب بھی بعض اہل علم کی یہی رائے ہے مگر علماء کا اتفاق ہے کہ بینک کا سود بھی سود ہی ہے اور اس لئے اس کا اپنی ذات کیلئے استعمال حرام ہے۔ یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے۔ اول تو اس لئے کہ یہ صرف امام ابوحنیفہ اور امام محمد رَحِمَہُمَا اللہُ تَعَالٰی کی رائے تھی۔ امام ابو یوسف رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی اور جمہور فقہاء کی رائے اس کے خلاف ہے اور مختلف دلائل کے علاوہ جو ان کے مسلک کو سب سے قوی بنادیتی ہے یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس وقت سود کے خاتمہ کا اعلان فرمایا تھا اس وقت حضرت عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ اور دوسرے مسلمانوں کے سودی کاروبار کا بڑا حصہ کافروں سے متعلق تھا مگر ہر قسم کے سود بہ یک قلم منسوخ کر دیئے گئے اور ایسا کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا۔

دوسرے: فقہاء نے جن سے سود لینے کی اجازت دی ہے وہ دراصل دارالحرب کے وہ باشندے ہیں جو مسلمانوں سے برسر جنگ اور آمدہ پیکار ہوں نہ کہ وہ لوگ جنہوں نے مسلمانوں سے امن و آشتی کا معاہدہ کر رکھا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ذمیوں سے سود لینے کی اجازت نہیں دی گئی کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ امن موجود ہے:

”احترز بالحربی عن المسلم الاصلی والذمی لیس للمسلم ان یرابی معہ اتفاقاً۔“^۱

ترجمہ: ”حربی کی قید سے مسلم (دارالاسلام کا مسلمان) اور ذمی سے احتراز کیا..... کہ مسلمان کے لئے بالاتفاق ان سے سود لینا جائز نہیں۔“

ہندوستان کا حکم بھی یہی ہے کہ چوں کہ یہاں قانونی اعتبار سے مسلمان محفوظ ہیں اور ان کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اس لئے اس کی حیثیت دارالحرب کی نہیں ہے بلکہ دارالامن یا دارالمسلمتہ کی ہے اور غیر مسلموں کے ساتھ ان کے روابط کی بنیاد وہ ہے جو صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان اہل مکہ اور مسلمانوں کے درمیان تھی۔ البتہ اگر یہ سود کی رقم نکالی نہ جائے اور بینک میں چھوڑ دی جائے تو یہ ایک سودی ادارہ کا مزید تعاون ہوگا اور سودی کاروبار کے فروغ میں اس سے مدد لی جائے گی۔ اس طرح یہ ایک گناہ اور معصیت کے کام میں تعاون ہوگا جو جائز نہیں ہے۔ اس لئے اس رقم کو نکال لینا چاہئے۔ البتہ اپنی ذات میں بھی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ کسی غریب و محتاج آدمی کو دے دے یا کسی عام رفاہی کام میں لگا دے اور صدقہ کی نیت بھی نہ کرے کیوں کہ حرام مال کو صدقہ کرنے پر وعید اور ممانعت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چوں کہ وہ مال حرام سے بچا اور اس کو ایک ضرورت

مند تک پہنچا دیا، اس لئے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس کا اجر ضرور عطا فرمائے گا۔

بینک کے سود کے مصارف

بینک کے سود کے سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نہ اس کو اپنی ذات پر خرچ کیا جاسکتا ہے اور نہ صدقہ میں دیا جاسکتا ہے۔ اپنی ذات پر خرچ کرنے کی صورت یہ بھی ہے کہ وہ کوئی چیز خرید کر اپنی ضروریات پوری کرے اور یہ بھی کہ کوئی ذمہ داری جو اس پر بجا طور پر عائد ہوتی ہے اس میں صرف کر دے۔ جیسے بجلی، فون، پانی وغیرہ کی اجرت۔ صدقہ سے مراد صدقات واجبہ، زکوٰۃ و فطرہ قربانی و کفارہ وغیرہ بھی ہے اور صدقات نافلہ و عطایا بھی، کہ کوئی شخص اپنی طرف سے بطور صدقہ کسی کار خیر میں استعمال کرے۔

اس کے علاوہ جو صورتیں ہوں ان میں صرف کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً کسی ضرورت مند کی انفرادی ضرورت کی تکمیل کسی اجتماعی فائدہ کا کام کر دینا جیسے کنواں کھودنا وغیرہ۔ حکومت کے ناروا ٹیکسوں میں بھی یہ رقم دی جاسکتی ہے اور اگر سودی قرضے لئے ہوں تو اس کو سود کی ادائیگی میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مساجد اور اس کی ضروریات میں اس رقم کا صرف کرنا جائز نہیں۔

ٹیکس میں سود کی رقم دینا

ٹیکس جو حکومت عوام سے وصول کرتی ہے وہ دو طرح کے ہیں۔ بعض منصفانہ ہیں اور خود اسلام میں ان کی گنجائش ہے مثلاً پانی، روشنی، سڑک ہسپتال، لائبریری اور پارک وغیرہ سہولتوں کے بدلے بلدیہ جو ٹیکس لیا کرتی ہے وہ اس کا فائدہ محسوس طور پر ہماری طرف لوٹا دیتی ہے۔ دوسرے قسم کے ٹیکس ایسے ہیں جن کو غیر منصفانہ اور ناواجبی کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً انکم ٹیکس جو بسا اوقات اسی فی صد تک پہنچ جاتا ہے شرعی اعتبار سے غیر منصفانہ ہونے کے علاوہ واقعہ ہے کہ اس قسم کے ٹیکس غیر معقول بھی ہیں کہ ایک شخص اپنے گاڑھے پسینہ سے جو کچھ حاصل کرے آپ اس کا اسی فی صد اجتماعی مفاد کے لئے وصول کر لیں۔

پہلی قسم کے ٹیکس میں بینک کی سودی رقم دینا درست نہ ہوگا اس لئے کہ وہاں سود دینا گویا اپنی ذات میں سود کا استعمال ہو گیا اس لئے کہ وہ بھی ان قومی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور فقہاء نے ایسے ٹیکس کی اجازت دی ہے جیسا کہ ابوالحسن مرغینانی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے:

”فان أريد بها ما يكون بحق ككبرى النهر المشترك وأجر الحارس والموظف

لتجهيز الجيش و فداء الاسارى وغيرها جازت الكفالة بها على الاتفاق.“^{۱۷}

۱۷ ہدایہ: ۱۰۹/۳

۱۸ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ”بینک انٹرسٹ اور سرکاری قرضے“۔

تَرْجَمًا: ”اگر اس سے وہ ٹیکس مراد ہیں جو جائز اور صحیح ہیں جیسے مشترک نہر کا کھودنا پولیس کی اجرت، فوج کا انتظام کرنے والوں کی تنخواہ جو سب پر ڈال دی جائے یا قیدیوں کو کافروں کی قید سے چھڑانے کے لئے عطیات تو بالاتفاق ان کی کفالت کی جاسکتی ہے۔“

دوسری قسم کے ٹیکس میں یہ رقم دی جاسکتی ہے کہ اس طرح یہ مال حرام اس حکومت یا ادارہ کو پہنچتا ہے جس نے یہ مال امانت داروں کو سود کے نام سے دیا ہے۔

سود میں سود کی ادائیگی

اگر کوئی شخص سودی قرض لینے پر مجبور ہو جائے اور قرض لے لے پھر اس کے پاس بینک سے حاصل ہونے والی سود کی کوئی رقم آ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہی رقم بطور سود ادا کر دے۔ اس لئے کہ سود دینا بھی گناہ ہے کیوں کہ اس طرح وہ اللہ کے عطا کئے ہوئے مال حلال کو حرام راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص سود ہی کی رقم اس راہ میں دے دیتا ہے تو ایک مال حلال کو بے حرمتی سے بچاتا ہے امید ہے کہ اس پر اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔ مولانا تھانوی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔

بینک میں روپیہ جمع رکھنا

بینک میں روپیہ جمع کرنے سے ایک سودی ادارہ کا تعاون ہوتا ہے اور اسے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ گناہ کے کاموں کا ارتکاب ہی گناہ اور مذموم نہیں بلکہ اس میں معاون اور تقویت کا باعث بننا بھی گناہ کی بات ہے۔ اس لئے بلا ضرورت بینک میں روپیہ رکھنا مکروہ ہوگا۔ فقہ کی کتابوں میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں۔ چنانچہ فقہاء نے اہل فتنہ سے ہتھیار کی اور ایسے شخص کے ہاتھ ”امرد غلام“ کی فروخت کو مکروہ قرار دیا ہے جو لواطت کا مریض ہو۔

البتہ بینک میں روپیہ رکھنے کا مقصد صرف سود حاصل کرنا ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں کا مقصود روپیہ کی حفاظت و نگہداشت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض فقہی نظائر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امر معصیت میں تعاون اس وقت گناہ بن جاتا ہے جب وہ اسی نیت سے کیا جائے..... علامہ سرخی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”لَا بَأْسَ بَانَ يَؤْجِرُ الْمُسْلِمَ دَارًا مِنْ الذَّمِّ يَسْكُنُهَا فَإِنْ شَرِبَ فِيهَا الْخَمْرَ وَعَبَدَ فِيهَا الصَّلِيبَ أَوْ أَدْخَلَ فِيهَا الْخَنَازِيرَ لَمْ يَلْحَقْ لِلْمُسْلِمِ إِثْمٌ فِي شَيْءٍ مِنْ ذَلِكَ“ ۱۷۳/۳

تَرْجَمًا: ”اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ مسلمان اپنا مکان ذمی کو رہائش کے لئے اجرت پر دے۔ اب اگر وہ اس میں شراب پئے یا صلیب کو پوجے یا سور کو داخل کرے تو مسلمان کو اس کی وجہ سے کوئی گناہ نہ ہوگا۔“

اگر کسی واقعی ضرورت کی بناء پر رکھا جائے مثلاً یہ کہ صحیح طور پر حفاظت و نگہداشت ہو سکے، املاک کو غبن سے بچایا جائے، کسی خاص ٹیکس سے بچا جائے، کوئی قانونی ضرورت درپیش ہو تو بینک میں جمع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن بلا ضرورت بینک میں رکھنا، چاہے سودی ادارہ کا تعاون مقصود نہ ہو، کراہت سے خالی نہ ہوگا۔ اوپر مکان میں شراب نوشی اور صلیب پرستی کا جو جزئیہ مذکور ہوا ہے اس کی نوعیت ذرا مختلف ہے، وہاں مکان فی نفسہ رہائش کے لئے ہے اور پہلے سے علم نہیں ہے کہ کرایہ دار کس مقصد کے لئے استعمال کرے گا۔ یہاں یہ بات پہلے سے واضح ہے کہ سودی کاروبار میں یہ رقم صرف کی جائے گی۔ پھر رقوم کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھنا چاہئے اور انکم ٹیکس وغیرہ سے بچنے کی مخصوص صورت کے سوا عام حالات میں فکسڈ ڈپازٹ میں بھی رقم رکھنا جائز نہیں۔

قرض کا فروخت کرنا

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی ایک رقم کسی کے یہاں باقی ہوتی ہے مثلاً پانچ سو روپے زید کے عمر کے یہاں باقی ہیں۔ زید کسی اور شخص سے پانچ سو ہی میں یا کچھ کم میں فروخت کر دیتا ہے، یہ صورتیں ناجائز ہیں۔ پہلی صورت کہ اتنی ہی رقم میں فروخت کرے اس لئے کہ یہ ثمن کو ثمن سے فروخت کرنا ہوا جس کو فقہ کی اصطلاح میں ”بیع صرف“ کہتے ہیں۔ اس میں ضروری ہے کہ طرفین بروقت معاوضہ حوالہ کر دیں۔ اگر ایک طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار ہو جیسا کہ اس صورت میں ہو رہا ہے تو سود پیدا ہو جائے گا جس کو ”ربو انسیہ“ کہتے ہیں۔

دوسری صورت اس لئے ناجائز ہوگی کہ ایک طرف سے مکمل پانچ سو روپے ہوئے اور دوسری طرف سے کم، روپیہ، روپیہ سے فروخت کیا جائے اور اس میں کمی بیشی ہو تو یہ بھی سود ہے جس کو ”ربو الفضل“ کہا جاتا ہے۔

مال مرہون سے استفادہ

آج کل مکانات کے سلسلہ میں یہ رواج کثرت سے ہو گیا ہے کہ لوگ قرض دینے والے کے پاس مکان بطور رہن کے رکھتے ہیں اور وہ صاحب بلا کرایہ اس میں رہتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات دوسروں کو کرایہ پر بھی دیتے ہیں اور کرایہ وصول کرتے رہتے ہیں قرض کی رقم پھر اس کے علاوہ وصول کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ غلط اور نادرست ہے۔

اسلامی قانون کے مطابق رہن رکھی جانے والی چیز کی حیثیت محض ایک ”ضمانت“ کی ہوتی ہے اور رہن رکھے جانے کے بعد بھی وہ شے اس اصل مالک ہی کی ملک ہوتی ہے۔ اسی طرح اس شے میں جو کچھ اضافہ یا نفع ہو وہ اصل مالک کی ملک قرار پاتی ہے۔ جس کے پاس کوئی چیز رہن رکھی جائے اس کو نہ اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے اور نہ کسی تصرف کا۔ کیوں کہ اگر اس کو استفادہ کا موقع دیا جائے تو قرض کے بدلے قرض کی ادائیگی ہوئی۔ اور یہ استفادہ قرض کے سہارے مزید فائدہ اٹھانا ہے جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ علامہ سبکی کا بیان ہے:

”لیس للمرتھن فی المرهون سوی حق الاستیثاق اما البیع و سائر التصرفات القولية والامتناعات و سائر التصرفات الفعلية فهو ممنوع من جمیعها۔“^۱
 ترجمہ: ”مرتھن رہن میں رکھی ہوئی چیز کو صرف بطور وثیقہ رکھ سکتا ہے، رہا فروخت کرنا اور تمام قولی تصرفات اور پابندیاں اور فعلی تصرفات تو وہ ان سب سے محروم ہوگا۔“

اگر خود مالک نے مکان میں رہنے کی اجازت دے دی ہو تو فقہاء متقدمین اس سے استفادہ کی اجازت دیتے تھے اور اس کو شرعی اصطلاح کے مطابق کہتے تھے۔^۲ لیکن چوں کہ اس زمانے میں اس کی حیثیت قرض دہندہ کی طرف سے ایک طرح کی شرط کی ہوتی ہے اور فقہاء کا اصول ہے: ”المعروف کالمشروط“ کہ جو چیز عرف و رواج کی حیثیت اختیار کر لے وہ شرط کا درجہ اختیار کر لیتی ہے اس لئے فقہاء متاخرین نے اس کو قطعاً نادرست لکھا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے فتح القدیر سے نقل کیا ہے

”لا یحل لہ ان ینتفع بشیئی منہ بوجہ من الوجوہ و ان اذن لہ الراہن لانہ اذن فی الربو الغالب من احوال الناس انہم یریدون عند الدفع الانتفاع ولو لاہ لما أعطاه الدراہم وهذا بمنزلة الشرط لان المعروف کالمشروط۔“^۳
 ترجمہ: ”رہن کی اشیاء سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا بھی جائز نہیں ہے گو کہ مقروض اس کی اجازت دیتا ہے عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ قرض دے کر نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اسے درہم نہ دیں اور یہ شرط کے درجہ میں ہے اس لئے کہ جو چیز مروج ہو جاتی ہے وہ شرط کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔“

ابن قدامہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے

”ملا یحتاج الی مؤنۃ کالدارو المتاع ونحوہ فلا یجوز للمرتھن الانتفاع بہ

^۱ خلاصۃ الفتاوی: ۱۸۶/۴

^۲ خلاصۃ الفتاوی: ۱۸۶/۴

^۳ فتح العزیز مع شرح مہذب: ۱۴۲/۱۰

بغیر اذن الراهن بحال فان اذن الراهن للمرتهن في الانتفاع بغیر عوض و
كان دين الرهن من قرض لم يجز لانه يحصل قرضاً يجز منفعة و ذلك
حرام. ۱۰

ترجمہ: ”جن چیزوں میں کسی خرچ کی ضرورت نہ ہو جیسے گھر، سامان وغیرہ ان میں مرتہن کے لئے
مقروض کی اجازت کے بغیر فائدہ اٹھانا درست نہیں..... اگر مقروض بلا عوض انتفاع کی اجازت دے
دے اور دین قرض ہو تو بھی جائز نہیں۔ کیوں کہ اس قرض سے نفع حاصل ہوتا ہے اور یہ حرام ہے۔“
اس لئے کسی صورت بھی رہن کی اشیاء سے استفادہ جائز نہ ہوگا۔
وبالله التوفیق

یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا میں شرکت

حکومت ہند کی طرف سے ایک ادارہ بنام ”یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا“ قائم ہے جو عوام سے سرمایہ حاصل کر
کے اسے کاروبار میں لگاتا ہے۔ اس کے ایک حصہ کی قیمت دس روپے ہے اور بازار میں دس روپے بیس پیسے یا
پچیس پیسے ہے۔ اس طرح کمی بیشی کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس میں لگائے ہوئے سرمایہ کے تحفظ کی ضامن
حکومت ہے اور ہم جب چاہیں اسے بازار میں بیچ سکتے ہیں یا حکومت کو واپس کر سکتے ہیں۔ اس کے منافع کا
اعلان منجانب حکومت بذریعہ اخبارات کیا جاتا ہے جو کم و بیش ہوتا ہے۔

تحقیق کے بعد معلوم ہوا ہے کہ اس میں بعض ایسی باتیں بھی شامل ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے اب اس کو جائز
نہیں کہا جاسکتا۔ اسلام میں ”شرکت“ کے معاملات اسی وقت درست ہو سکتے ہیں جب وہ نفع و نقصان دونوں میں
شرکت کی اساس پر ہو، نفع ہو تو بھی تمام فریق شریک ہوں، نقصان ہو تب بھی سب مل کر گوارا کریں لیکن یونٹ
ٹرسٹ میں حصص کا خریدار نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصل سرمایہ بھی بہر حال محفوظ رہے گا۔ اور اس پر
حاصل ہونے والا کم سے کم نفع بھی۔ اس طرح اس کاروبار میں بھی ربوا پیدا ہو جاتا ہے جو اسلام کی نظر میں بد
ترین جرم ہے۔

سودی حسابات کی تعلیم

سودی حسابات کی تعلیم دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ سود کا عمل اور سود کا علم دونوں بالکل جدا
گانہ چیزیں ہیں سود کے لئے حساب کے جو فارمولے اختیار کئے جاتے ہیں وہ بذاتہ مباح ہیں۔ اس لئے ان کی

تعلیم بھی مباح ہی ہوگی۔ بلکہ ممکن ہے کہ سودی کاروبار پر تنقید کے لئے کبھی ضروری بھی ہو جائے قرآن مجید نے گمراہ قوموں کے عقائد بتائے ہیں۔ سلف صالحین اپنے زمانے کے فرق باطلہ کے عقائد و نظریات اور ان کے دلائل کا تفصیل سے ذکر کرتے رہے ہیں تاکہ ان پر بھرپور نقد ہو سکے۔ یہی حال سود کی فنی تعلیم کا بھی ہوگا۔ اس کی سب سے واضح نظیر سحر کی تعلیم ہے۔ بعض علماء نے سحر کے عمل کو تو گناہ و معصیت قرار دیا ہے مگر اس کو سیکھنے کی اجازت دی ہے۔^۱

فلسڈ ڈپازٹ

فلسڈ ڈپازٹ کرانے کی صورت میں رقم اسی ارادہ سے جمع کرائی جاتی ہے کہ اس پر انٹرسٹ حاصل کیا جائے، اس لئے ظاہر ہے کہ فلسڈ ڈپازٹ میں رقم محفوظ کرانا قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔ یہ بھی جائز نہیں کہ کسی نیک مقصد مثلاً غرباء کی مدد اور رفاہی خدمت کی غرض سے رقم فلسڈ ڈپازٹ کریں، یہ ایسا ہی ہوگا کہ جیسے کوئی شخص مال چوری اور غصب کے ذریعہ اس مقصد سے حاصل کرے کہ وہ اس کو کار خیر میں صرف کرے گا، ظاہر ہے یہ صورت جائز نہیں اور وہ دو ہرے گناہ کا مرتکب ہوگا۔ ایک مال حرام کا حاصل کرنا، دوسرے اس کو صدقہ کی نیت سے خرچ کرنا، جب کہ آپ ﷺ نے ان دونوں ہی باتوں سے منع فرمایا ہے۔

البتہ اگر سرکار کے ظلم سے تحفظ کے لئے فلسڈ ڈپازٹ کرایا جائے مثلاً اس طرح ڈپازٹ کرانے پر انکم ٹیکس سے بچت ہوگی تو کرانے کی گنجائش ہے۔ البتہ جو اضافی رقم حاصل ہو اس کو غرباء اور رفاہی کاموں پر خرچ کرنا ہوگا اور اصل جمع کی ہوئی رقم ہی اس کے لئے حلال ہوگی۔ نیز سود کی حاصل شدہ رقم کو انکم ٹیکس اور اس جیسے دوسرے ناواجبی ٹیکس میں بھی ادا کرنا درست ہوگا۔

میعادی چیک کی قیمت میں فروخت

آج کل ایک طریقہ میعادی چیک کی خرید و فروخت کا بھی رواج پا چکا ہے۔ مثلاً پچاس ہزار کا چیک ہے اور دو ہفتے کے بعد قابل وصولی ہے، تو قبل از وقت اس رقم کو حاصل کرنے کے لئے چیک کا مالک پینتالیس ہزار ہی میں اس چیک کو فروخت کر دیتا ہے، فروخت کنندہ کو وہ رقم کم ملتی ہے لیکن وقت سے پہلے مل جاتی ہے، خریدار کو رقم دیر سے وصولی ہوتی ہے، لیکن نفع کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔

معاملہ کی یہ صورت فقہاء کی اصطلاح میں ”صرف“ کہلاتی ہے، صرف روپے سے روپے کی خرید و فروخت کو کہتے ہیں، چیک میں بھی چوں کہ کاغذ مقصود نہیں، بلکہ اس میں مندرجہ رقم ہی مقصود ہے، لہذا دونوں طرف سے

^۱ یہ رائے امام غزالی کی ہے۔ ملاحظہ ہو مولانا شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم: ۲۵۵/۱

روپے کا تبادلہ ہوا۔ شرعاً صرف میں دونوں طرف سے دیا جانے والا عوض برابر بھی ہونا چاہئے اور نقد بھی۔ یہاں ایک طرف رقم زیادہ ہے اور دوسری طرف کم۔ اور ایک جانب سے ادائیگی نقد ہے اور دوسری جانب سے ادھار، لہذا اس طرح کا معاملہ قطعاً حرام اور سود پر مبنی ہے اور اس کے ناجائز ہونے پر فقہاء کا اتفاق ہے:

”بیع فلس بغیر عینہ بفلسین بغیرا عیانہما لا یجوز بالا اتفاق۔“^۱

ترجمہ: ”ایک غیر معین ”فلس“ کو دو غیر معین فلس کے بدلے فروخت کرنا بالا اتفاق جائز نہیں ہے۔“

قمار کی بعض مروجہ صورتیں

جو ایک بڑی ناپسندیدہ چیز ہے۔ قرآن میں اس کو گندگی اور شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے اور اس کی مصلحت بھی بتائی گئی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رَجَسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ إِنَّمَا يَرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ﴾^۲

ترجمہ: ”اے اہل ایمان! شراب، جوا، آستانے اور پانے گندگی اور اعمال شیطانی میں سے ہیں اس سے بچو تو کامیاب ہو گے۔ شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب و جوعے کے ذریعہ عداوت و بغض پیدا کر دے اور ذکر خداوندی نیز نماز سے غافل کر دے، پھر کیا تم ان چیزوں سے بچو گے؟“

ایام جاہلیت میں جوے کا کاروبار بڑے وسیع پیمانے پر تھا اور وہ اس کے ایسے پرستار واقع ہوئے تھے کہ بسا اوقات بیوی بچوں کو داؤں پر لگا دیتے تھے۔ حصوں کی تقسیم اور مختلف خرید و فروخت کے معاملات جوے پر ہی مبنی ہوتے تھے، اسلام نے بہ یک قلم ان سب کی ممانعت کر دی، اس قسم کے معاملات میں بیع مزاہنہ، محافلہ، ملامہ، منابذہ، بیع حصاة، بیع عربان اور بعض دوسری صورتیں ہیں جن کا ذکر حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے بڑی خوش اسلوبی سے ان مختلف معاملات کی ممانعت کی وجہ اور قمار کے اقتصادی اور تمدنی نقصانات پر روشنی ڈالی ہے۔^۳

آج کل قمار کی مروجہ صورتوں میں ایک اخباری ”معمہ“ ہے۔ اخبار یا معمہ کا ٹکٹ خرید کر ”معمہ“ پر کرنے والا

^۱ فتاویٰ غیاثیہ: ص ۱۴۱ نوع فی بیع الفلوس و نحوہا ^۲ سورہ مائدہ: آیت ۹۰، ۹۱ ^۳ حجة الله البالغة: ۲/۹۸

گویا عوض ادا کرتا ہے۔ اس مقابلے سے جو عوض ملتا ہے اس میں ملنے اور نہ ملنے دونوں کا اندیشہ ہے۔ اس طرح ”خطر“ پیدا ہو گیا اور اسی کا نام قمار ہے۔ نمائشوں میں بند ڈبے فروخت کئے جاتے ہیں، کسی میں سامان زیادہ ہوتا ہے، کسی میں کم اور کسی میں بالکل نہیں۔ لوگ پیسے دے کر خریدتے اور قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ یہ بالکل اسی نوعیت کا قمار ہے جو ایام جاہلیت میں ”تقسیم بالا زلام“ (پانسوں کے ذریعہ حصوں کی تقسیم) کی صورت میں ہوا کرتا تھا۔ گولیاں کھیلنا، پتنگیں اڑانا اور اس میں ہارجیت کی بازی لگانا اور اس پر دونوں جانب سے پیسہ کی شرط رکھنا بھی جوا ہے اور حرام ہے۔ اسی زمرہ میں لاٹری کا وہ کاروبار بھی ہے جو آج بین الاقوامی سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ٹکٹ خریدنے والا اس رقم میں خود ٹکٹ کو مقصود سمجھ کر نہیں خریدتا بلکہ اسے ایک پانسہ سمجھ کر خریدتا ہے کہ ممکن ہے اس کے نمبر پر وہ متوقع رقم یا چیز مل جائے اس لئے یہ خرید و فروخت اور تجارت نہیں ہے بلکہ جوا ہے۔ اس کا ٹکٹ خریدنا بھی گناہ ہے اور اس کا ٹکٹ بیچنا بھی گناہ بالائے گناہ ہے کہ وہ ”اثم وعدوان“ کا مرتکب ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی دعوت بھی دیتا ہے۔

انشورنس

انشورنس (INSURANCE) کی صورتوں اور پالیسیوں میں اس قدر تنوع پیدا ہو چکا ہے اور آئے دن اس کی ایسی نئی شکلیں پیدا کی جا رہی ہیں کہ ان سب کا احاطہ دشوار ہے، ان میں زیادہ اہم اور مروج حیات اور املاک کا انشورنس ہے۔ اس میں انشورنس کمپنی اور انشورنس کرانے والے کے درمیان ایک مخصوص مدت کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اس مدت میں وہ اتنی رقم بالاقساط کمپنی کو ادا کرے گا۔ جن میں ہر قسط اتنے روپے کی ہوگی۔ یہ انشورنس کبھی انسان کے پورے وجود کا ہوتا ہے کبھی جسم کے کسی خاص حصہ کا کبھی املاک مثلاً کارخانہ اور دکان وغیرہ کا۔ اگر جسم یا اس کے کسی خاص حصہ کا بیمہ کرایا گیا اور مدت معاہدہ کی تکمیل سے پہلے ہی اس شخص کا انتقال ہو گیا یا اس کا وہ عضو کسی حادثہ کا شکار ہو گیا تو چاہے اس نے چند ہی قسطیں کیوں نہ دی ہوں۔ اس پوری متعینہ رقم کا حق دار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ املاک ضائع ہو گئیں تو کمپنی اس کی تلافی کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور اگر اس نے معاہدہ کے مطابق پوری رقم ادا کر دی اور وہ خود یا بیمہ کردہ چیز اور عضو محفوظ رہا تو اب اصل رقم منافع کے ساتھ واپس ملتی ہے جس کو ”بونس“ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ان تمام صورتوں میں بنیادی طور پر دو مفاسد پائے جاتے ہیں۔ ایک ربوا اور دوسرے قمار۔ ربوا تو ہر صورت میں ہے اس لئے کہ اس جمع شدہ رقم کی حیثیت قرض کی ہے اور منافع گویا اس مہلت کا معاوضہ ہے جو قرض کی واپسی کے لئے دی گئی ہے۔ اسی کا نام ”ربوا“ ہے۔ جو لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سود صرف تجارت ہی میں

ہوتا ہے، قرض میں نہیں ہوتا وہ صریح غلطی بلکہ بدترین قسم کی معنوی تحریف میں مبتلا ہیں۔ سلف صالحین رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کے یہاں تواثر کی حد تک اس کی صراحت موجود ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ہم صرف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رَحِمَهُمُ اللہُ تَعَالٰی کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

”الرَبْوَا هُوَ الْقَرْضُ عَلَى أَنْ يُوَدَى إِلَيْهِ أَكْثَرُ وَأَفْضَلُ مِمَّا اخْذٌ“^۱

ترجمہ: ”ربو در حقیقت اس شرط کے ساتھ قرض دینا ہے کہ مقروض اس کو اصل میں اضافہ کے

ساتھ یا اس سے عمدہ چیز واپس کرے گا۔“

اور اگر قبل از وقت موت واقع ہوگئی تو قمار پایا گیا۔ قمار یہ ہے کہ ہر دو جانب سے مال ہو، اور مال کے حاصل ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد کسی ایسی چیز کو بنایا جائے جس کا موجود ہونا اور نہ ہونا مبہم ہو۔ اسی کو فقہاء ”خطر“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ایسی تمام صورتوں کو جو میں شمار کرتے ہیں:

”لا خلاف بین أهل العلم في تحريم القمار وأن المخاطرة من القمار“^۲

ترجمہ: ”اہل علم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قمار حرام ہے اور مخاطرہ بھی قمار ہی میں سے ہے۔“

یہاں بھی یہی صورت ہے کہ درمیان میں موت یا اس عضو کے ضائع ہونے یا ہلاک ہو جانے کی وجہ سے جو نفع متوقع ہے اس کا حاصل ہونا اور نہ ہونا ”خطرہ“ میں ہے کہ اگر یہ چیزیں سلامت رہ گئیں تو یہ نفع حاصل نہ ہو سکے گا اور مدت مقررہ سے پہلے مذکورہ چیز ضائع ہو جائے تو نفع حاصل ہوگا۔

املاک کے انشورنس میں کمپنی صرف املاک کے ضائع ہونے کی صورت میں پیسے ادا کرتی ہے، یہ صورت بھی قمار سے خالی نہیں ہے۔

انشورنس کی مروجہ صورتوں کے فقہی حکم اور اس کے شرعی و اسلامی متبادل کی بابت راقم نے قاموس الفقہ جلد سوم میں تائین کے تحت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

یہ تو ”انشورنس“ کا اصل حکم ہے۔ لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات یہ ہیں کہ منصوبہ بند فرقہ پرستوں کی طرف سے مسلمانوں کی جان و مال مستقل خطرے میں ہے، آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں اور حکومت کا عملہ کہیں تو مفسدین کی پشت پناہی کرتا ہے اور کہیں خاموش تماشاکی بن کر مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے منظر

^۱ حجة الله البالغة: ۹۸/۲

^۲ ابو بکر جصاص رازی احکام القرآن: ۳۸۸/۱

^۳ دلائل کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: شیخ مصطفیٰ زرقاء کی ”التائین وموقف الشریعہ“ اور مولانا مفتی ولی حسن ٹوکی کا مقالہ ”بیمہ زندگی“ جو جواہر الفقہ: ج ۲ میں شریک اشاعت ہے۔

سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے، ہماری جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری ہے اور اس سے پہلو تہی کے نتیجہ میں ہونے والے نقصانات کا تاوان حکومت پر عائد ہوتا ہے، اگر مظلوم اپنا حق سیدھی راہ سے حاصل نہ کر سکے اور کسی طور ظالم کی ایسی چیز اس کے پاس آجائے جس سے وہ اپنا حق وصول کر سکے تو یہ جائز ہے، جس کو فقہاء ”ظفر بالحق“ سے تعبیر کرتے ہیں، پھر کتاب و سنت کی نصوص کی روشنی میں فقہاء کے یہاں یہ متفقہ اصول ہے کہ شدید ضرورت کی وجہ سے ناجائز چیزیں جائز ہو جاتی ہیں ”الضرورات تبیح المحظورات“ اور یہ صراحت بھی فقہاء نے فرمائی ہے کہ اجتماعی اور قومی سطح کی ”حاجت“ بھی ”ضرورت“ کے درجہ میں ہے۔

الحاجة اذا عمت كانت كالضرورة، اس لئے ان تمام حالات اور شریعت کے مزاج و مذاق اور اصول و قواعد کو سامنے رکھ کر سب سے پہلے ۱۹۶۵ میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے علماء کی ایک نشست میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا، پھر دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء نے دارالعلوم کے مفتیان اور اکابر اساتذہ کے دستخط سے ۱۹۹۰ میں ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیت علماء ہند کے استفتاء پر اس کے جواز کا فتویٰ صادر فرمایا، جسے جمعیت علماء ہند نے اپنے مطوعہ پمفلٹ کے ذریعہ پورے ملک میں پہنچانے کی سعی کی، نیز ۳۰/ اکتوبر تا ۲۰۰۰ نومبر ۱۹۹۲ میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے سیمینار منعقدہ اعظم گڑھ (یوپی) نے ملک کے ۲۵/ ممتاز علماء کے دستخط اور اتفاق سے ان خصوصی حالات میں انشورنس کے جواز کا فیصلہ کیا، ان دستخط کنندگان میں دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ و مفتیان، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے ذمہ داران و مفتیان کے علاوہ شمالی اور جنوبی ہند کے متعدد دارباب فتاویٰ ہیں۔

لہذا یہ حالت موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جان و مال کے انشورنس کی گنجائش ہے۔ البتہ ان امور کو ملحوظ رکھنا چاہیے:

- ۱ جو حضرات عملاً جان و مال کے خطرات سے دوچار نہ ہوں، ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ اس سے احتیاط کریں۔
- ۲ انشورنس کرانے کے بعد اگر واقعی فساد میں جان و مال کا نقصان ہوا تب تو کمپنی کی طرف سے حاصل ہونے والی پوری رقم اس کے لئے جائز ہوگی۔
- ۳ اور اگر نقصان نہ ہوا یا ہوا لیکن طبعی اسباب کے تحت ہوا تو ایسی صورت میں اتنی ہی رقم اس کے لئے حلال ہوگی۔ جتنی اس نے جمع کی تھی، اضافی رقم کو غرباء پر یا رفاہی کاموں میں بلا نیت صدقہ خرچ کر دینا واجب ہوگا۔

جبری انشورنس

انشورنس کی بعض صورتیں جبری ہیں، سرکاری ملازمین اور لیبر لا (Labour Law) کے تحت بعض خانگی

ملازمین بھی انشورنس کرانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تنخواہ ہی میں سے ایک متعینہ رقم وضع کر لی جاتی ہے اور انشورنس کے اصول کے مطابق ملازمت ختم ہونے کے بعد وہ رقم اضافہ کے بعد ملازم کو اور دوران ملازمت موت ہو جانے کی صورت میں اس کے ورثہ کو دے دیتی ہے۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر ملازم بیمار پڑ جائے تو اس کے علاج پر رقم خرچ کی جاتی ہے اور درمیان ملازمت موت واقع ہو جانے کی صورت میں اس کے ورثہ کو اس وقت تک کے لئے پنشن دی جاتی ہے جب تک کہ ورثہ میں سے کسی کو روزگار حاصل نہ ہو جائے۔

چوں کہ ان صورتوں میں رقم پر قبضہ سے پہلے ہی انشورنس کمپنی اسے لے لیتی ہے، اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ وضع شدہ رقم کے بعد جو رقم بچی ہوئی ہے، وہی اصل میں اس کی اجرت اور تنخواہ ہے، اب حکومت ملازم یا اس کے ورثہ کو جو کچھ دیتی ہے یا اس کے علاج پر جو کچھ خرچ کرتی ہے، اس کی حیثیت حکومت کی طرف سے اپنے ایک خدمت گزار شہری کے تعاون اور قدردانی کے قبیل سے ہے۔ اس وقت اسی پر علماء ہند کا فتویٰ ہے۔

پوسٹل بیمہ

بیمہ کی ایک شکل پوسٹل بیمہ کی بھی ہے۔ بیمہ کے ذریعہ روپیہ اور اہم کاغذات ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے ہیں اور محکمہ پوسٹ اس کی حفاظت کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ صورت گو بیمہ کہلاتی ہے، لیکن اپنی روح کے اعتبار سے رقم اور کاغذات پہنچانے کی اجرت ہے۔ جائز کام پر اجرت کا لینا اور دینا دونوں ہی جائز ہے اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے انشورنس

اگر انشورنس کی وجہ سے گورنمنٹ انکم ٹیکس سے چھوٹ دیتی ہو تو انکم ٹیکس سے بچنے کی نیت سے انشورنس کرایا جاسکتا ہے۔ البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ جتنی رقم خود اس نے جمع کی ہے، اتنی تو اس کے لئے حلال ہے اور کمپنی جو اضافی رقم دے، وہ اس کے لئے جائز نہیں، اس کو بلا نیت صدقہ غرباء پر یا رفاہی کاموں میں خرچ کر دینا چاہئے ہاں اگر فرقہ وارانہ فسادات میں اس کو جانی یا مالی نقصان پہنچے تو اب پوری رقم اس کے لئے جائز ہوگی اور یہ زائد رقم حکومت کی طرف سے تحفظ میں کوتاہی کا ہر جانہ تصور کیا جائے گا۔

انشورنس کے سود سے ٹیکس ادا کرنا

اگر غیر ارادی طور پر یا کسی مجبوری کے تحت رقم جمع کرنے پر سود مل گیا، جیسے انشورنس میں حاصل شدہ اضافی رقم یا فکس ڈپازٹ میں ملا ہوا سود اور گورنمنٹ کی طرف سے اس پر کوئی ناوا جی ٹیکس جیسے کسٹم ڈیوٹی، انکم ٹیکس اور

سیل ٹیکس وغیرہ عائد کیا گیا تو یہ سود کی رقم ٹیکس میں ادا کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی کا مال حرام اپنے پاس آجائے اور مالک معلوم ہو تو مالک کو پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

”اذا علم المالك بعينه فلا شك في حرمة و وجوب رده عليه“^۱

ترجمہ: ”جب مالک متعین طور سے معلوم ہو تو اس کی حرمت کے بارے میں کوئی شک نہیں اور یقینی

طور سے اس کا لوٹنا واجب ہے۔“

گورنمنٹ کے بعض ایسے ٹیکس بھی ہوتے ہیں جس کا فائدہ ادا کنندہ کی طرف واپس آتا ہے جیسے بلدیہ کا ٹیکس، بجلی اور پانی کا بل وغیرہ، ایسے ٹیکس کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

”فان اريد بها مايكون بحق ككبرى النهر المشترك واجر الحارس والموظف

لتجهيز الجيش وفداء الاسارى وغيرها جازت الكفالة بها على الاتفاق.“^۲

ترجمہ: ”اگر اس سے وہ چیز مراد ہو جو حق ہو جیسے مشترک نہر کا کھودنا، پہرے دار کی اجرت مقرر

کرنا، فوجیوں کے ساز و سامان اور قیدیوں کی رہائی کے لئے کوئی رقم متعین کرنا تو اس کی ”کفالت“

کرنا بالاتفاق جائز ہے۔“

لہذا ایسے ٹیکسوں میں بینک اور انشورنس سے حاصل ہونے والی رقم دی جانی جائز نہیں۔

انشورنس کی ایجنسی

ہندوستان کے موجودہ حالات کے پس منظر میں قریب قریب علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کے لئے جان و مال کا انشورنس کرنا جائز ہے۔ البتہ اگر فسادات میں جانی و مالی نقصان پہنچا ہو تو اس کے لئے انشورنس کی پوری رقم جائز ہے اور اگر طبعی موت واقع ہوئی یا قدرتی مالی حادثہ پیش آیا تو انشورنس کرانے والے کے لئے اتنی ہی رقم جائز ہوگی جتنی اس نے جمع کی تھی، باقی رقم بلا نیت صدقہ، غرباء اور رفاہی کاموں پر خرچ کر دینی چاہئے۔

اب سوال یہ ہے کہ انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کے فرائض انجام دینا اور اس کو ذریعہ معاش بنانا جائز ہے یا نہیں؟..... اس سلسلہ میں فقہاء کا اصول یہ ہے کہ جو چیز ازراہ ضرورت جائز قرار دی جاتی ہے، وہ بہ قدر ضرورت ہی جائز رہتی ہے۔ ”ما ابیح للضرورة يقدر بقدرها.“ انشورنس اصل میں سود اور جوئے سے خالی نہیں لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بند فرقہ پرستی، حکومت کی انتظامیہ میں فاشٹ عناصر کی موجودگی اور

^۱ ہدایہ: ۱۰۹/۳ کتاب الکفالة.

^۲ رد المحتار: ۱۳۰/۲ باب البیع الفاسد

مسلمانوں کے تحفظ میں ناکامی بلکہ اس میں بالارادہ تساہل کی وجہ سے ضرورۃً علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ خود مسلمان اس کی ایجنسی لیں، اس لئے انشورنس کمپنی کی ایجنسی لینا اور اس کو ذریعہ معاش بنانا جائز نہیں۔

پراویڈنٹ فنڈ

پراویڈنٹ فنڈ میں ملازم کو تین طرح کی رقوم دی جاتی ہیں، ایک تو خود ان کی جمع کی ہوئی رقم، دوسری اسی کے برابر حکومت کی طرف سے دی گئی رقم، تیسرے ان دونوں کے اوپر دی گئی اضافی رقم، جس کو حکومت سود سے تعبیر کرتی ہے۔ علماء کا خیال ہے کہ یہ تینوں ہی رقم ملازمین کے لئے جائز و حلال ہیں اور ان کے لینے اور استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس لئے کہ جو رقم ملازم کی تنخواہ سے کاٹی گئی ہے وہ تو ان کی ہے ہی، اور اسی کے برابر جو اضافی رقم دی گئی ہے، چوں کہ ملازمت کے وقت اس کا دیا جانا متعین و معروف تھا، اس لئے وہ بھی اس کی تنخواہ کا جز ہی متصور ہوگا۔ رہ گئی وہ رقم جو سود کے نام سے دی گئی ہے، تو یہ بھی سود نہیں، سود ایسے اضافے کو کہتے ہیں جو لین دین کے معاملہ میں شرط اور معاہدہ کے مطابق دیا گیا ہو۔ اگر مقروض بطور خود قرض ادا کرتے ہوئے کچھ اضافہ کے ساتھ دے دے تو یہ حسن ادائیگی ہے اور مالک مزدور کو بڑھا کر دے تو یہ اس کی طرف سے تبرع اور انعام ہے۔ لہذا یہ رقم جس کو حکومت سود سے موسوم کرتی ہے، اصل میں انعام ہے کوئی اضافہ محض اس لئے سود کے زمرہ میں نہیں آ سکتا کہ اس کو سود کا نام دے دیا جائے، جب تک کہ وہ شرعی اصطلاح کے مطابق سود کا مصداق نہ ہو۔

واللہ اعلم



متفرقات امارت و قضاء

امارت شرعی کا قیام

اسلام ایک اجتماعی نظم اور زندگی کا قائل اور داعی ہے۔ اس نے عبادات میں بھی قدم قدم پر اس کو ملحوظ رکھا ہے۔ نماز میں جماعت واجب قرار دی گئی ہے، روزہ کے لئے ایک خاص مہینہ مقرر کیا گیا۔ زکوٰۃ کو اجتماعی طور پر بیت المال میں جمع کرنے اور تقسیم کا حکم دیا گیا ہے اور حج کے لئے چند خاص ایام اور مقامات متعین کر دیئے گئے۔ جس نے زندگی کے عام مسائل میں اجتماعی اور مسلمانوں کی جماعتی حیثیت کو اس طرح پیش نظر رکھا ہو کیوں کر ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایک منتشر انبوه اور بھیڑ کی طرح زندگی بسر کرنے کی اجازت دے۔ چنانچہ اسلام کے مزاج و روح کے مژشناس سیدنا عمر فاروق رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے فرمایا:

”لا اسلام الا بجماعة ولا جماعة الا بامارة ولا امارة الا بطاعة.“^۱

ترجمہ: ”اسلام جماعت کے بغیر نہیں، نہ جماعت امارت کے بغیر ہے اور نہ امارت طاعت کے بغیر۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے طاعت امیر ترک کر دی اور جماعت سے الگ ہو گیا وہ جاہلیت کی موت مرا۔..... بعض روایات میں ہے کہ آدمی کو کوئی صبح و شام ایسی نہیں گزارنی چاہئے کہ اس کا کوئی امیر نہ ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد جسد اطہر کی تدفین سے پہلے صحابہ کرام رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ نے امیر کے انتخاب کا فریضہ انجام دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسے ملک میں جہاں مسلمانوں کو سیاسی اقتدار اور غلبہ حاصل نہ ہو امارت کا نظام قائم ہو سکتا ہے اور مسلمان کسی کو اپنا امیر منتخب کر سکتے ہیں؟

ہمیں اس کا جواب خود حضور ﷺ کی حیات طیبہ سے مل جاتا ہے۔ حضور ﷺ جب تک مکہ میں رہے ظاہر ہے مسلمان نہ صرف یہ کہ اقتدار اعلیٰ سے محروم تھے بلکہ بہت عاجز و درماندہ تھے۔ اس وقت بھی جب

^۱ جامع لابن عبد البر: ص ۶۲ مسلم عن ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۱۲۷/۲

^۲ ابن عساکر عن ابن سعید و ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما

حضور ﷺ نے اہل مدینہ سے بیعت لی تو اچھے اور برے حال میں سمع و طاعت کا عہد لیا اور اس بات کا کہ وہ امیر سے نظم و نسق کے معاملہ میں جھگڑا نہیں کریں گے۔

”ان لا نارع الامراہلۃ“^۱

فقہاء نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ ابن نجیم مصری اور علامہ طحاوی رَحِمَہُمَا اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں۔

”بلاد علیہا ولایۃ الکفار یجوز للمسلمین اقامۃ الجعۃ ویصیر القاضی قاضیا

بتراضی المسلمین ویجب علیہم ان یلتمسوا والیاً مسلماً۔“^۲

ترجمہ: ”وہ ملکیتیں جہاں کفار والی ہوں، وہاں جمعہ قائم کرنا درست ہے اور قاضی مسلمانوں کی باہمی

رضامندی سے قاضی ہو جائے گا اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے اوپر کسی مسلمان والی کا مطالبہ کریں۔“

چنانچہ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ حکومت سے کسی امیر کے تقرر کا مطالبہ کریں یا

بطور خود کسی کو امیر منتخب کر لیں۔ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

رَحِمَہُمَا اللہُ تَعَالٰی نے فتویٰ دیا کہ:

”اقامت جمعہ دردار الحرب اگر از طرف کفار والی مسلمان در مکانی

منصوب باشد باذن او درست والا مسلمانان را باید کہ یک کس را کہ امین و

متدین باشد رئیس قرار دہند۔“

ترجمہ: ”اگر کفار کی طرف سے ”مسلمان والی“ دار الحرب کے کسی مقام میں مقرر ہو تو اس والی مسلم

کی اجازت سے جمعہ قائم کرنا درست ہے ورنہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ایک امین اور دین دار شخص کو خود

ہی سردار (والی) مقرر کریں۔“

لہذا ہندوستانی مسلمانوں کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ امارت شرعی کا نظام قائم کریں

اور کسی امیر کے ہاتھ میں اپنا دست بیعت رکھیں۔ اگر کل ہند سطح پر اس کا قیام ممکن نہ ہو سکے تو ریاستی سطح پر اس

فریضہ کو انجام دیں افسوس کہ اس اہم ترین فریضہ دینی سے ہم غافل و بے پرواہ ہیں۔ وباللہ التوفیق

قضاء شرعی کا نظام

قرآن مجید نے اپنے اختلافات میں خدا اور رسول ﷺ کی طرف لوٹنے اور اس کے فیصلے پر راضی و

۱۔ بخاری عن عباۃ بن صامت رضی اللہ عنہ: ۲۲۵۲/۵ باب کیف یباع الامام الناس (ط: مکتبہ عصریہ بیروت)

۲۔ فتاویٰ الہندیہ: ۱/۱۶۶ اس مسئلہ پر تفصیلی مطالعہ کے لئے دیکھئے مولانا عبدالصمد رحمانی کی ”ہندوستان اور مسئلہ امارت“ ”مطبوعہ امارت

شرعیہ پھلواڑی شریف پٹنہ، بہار

آمادہ رہنے کو مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے اس پر عمل اسی وقت ممکن ہے جب ایسا نظام قضاء قائم ہو جہاں کتاب و سنت کی روشنی میں فیصلے کئے جاتے ہوں اور یہ فیصلے ان لوگوں کے ذریعہ ہوتے ہوں جو خود بھی خدا و رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہوں اور دین و شریعت کے قائل ہوں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں بکثرت فقہی تصریحات موجود ہیں۔ علامہ ابن ہمام رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی فرماتے ہیں:

”اذا لم یکن سلطان ولا من یجوز التقلد منه کما ہو ببعض بلاد المسلمین غلب علیہم الکفار کقرطبة فی بلاد المغرب وبلنسیة وبلاد الحبشة.....

يجب علیہم ان یتفقوا علی واحد منهم یجعلونه والیافیولی قاضیا او یكون هو الذی یقضی بینہم“

ترجمہ: ”جب (مسلمان) بادشاہ نہ ہو اور نہ ایسا شخص ہو جس کا قاضی مقرر کرنا جائز ہو (جیسے بادشاہ کی جانب سے مقرر شدہ والی) جیسا کہ یہی حالت بعض ان ممالک کی ہے جن پر کفار غالب آ گئے ہیں مثلاً بلاد مغرب میں قرطبة، بلنسیہ اور حبشہ..... تو ایسی حالت میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے میں سے کسی ایک پر متفق ہو کر والی بنالیں جو ان کے لئے قاضی متعین کرے یا خود فیصلے کیا کرے۔“

نظام قضاء کی اہمیت کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ غیر مسلم حج کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں معتبر نہیں ہے۔ اس طرح جو عورتیں سرکاری عدالتوں سے اپنا نکاح فسخ کرالیں تو چاہے وہ بجائے خود اسلامی قانون کے مطابق ہی کیوں نہ ہو یہ فیصلے غیر معتبر ہیں۔ وہ عورت اپنے پہلے شوہر کی زوجیت میں باقی رہتی ہے اور یہ نکاح نادرست ہوتا ہے نیز اس کے بعد کے تعلقات معصیت قرار پاتے ہیں۔ ایسی خواتین کے لئے اسلامی اور شرعی زندگی کی واحد راہ نظام قضاء کا قیام ہے۔ اس طرح ہندوستان میں نافذ ”مسلم پرسنل لا“ نظام قضاء کے بغیر عملاً غیر اسلامی ہو جاتا ہے۔

افسوس کہ ہندوستان میں چند ایک ریاستوں کے علاوہ پورے ملک میں اس کا فقدان ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ویڈیو تصویروں پر قضاء

ویڈیو تصویروں پر تکیہ کر کے کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ قضاء کی بنیاد شریعت میں ایسی چیزوں کو بنایا

۱۔ فتح القدیر: ۳۶۵/۶ نیز ملاحظہ ہو رد المحتار: ۵۹۴/۱ و ۳۳۹/۴ طحطاوی: ۳۳۹/۱، البحر الرائق: ۲۹۸/۶، مجموعۃ

۲۔ النساء: ۵۸

الفتاویٰ: ۱۶۱/۲

۳۔ ہندوستان میں نظام دارالقضاء کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی ”قضاء کی شرعی حیثیت“ مطبوعہ امارت شرعیہ بہار، پھلواڑی شریف پٹنہ اور راقم الحروف کی ”نظام دارالقضاء اور ہندوستان“ مطبوعہ امارت ملت اسلامیہ آندھرا پردیش، پنچہ شاہ حیدر آباد

گیا ہے جس میں بہ حد امکان تلبیس کا اندیشہ نہ ہو ویڈیو کا معاملہ ایسا نہیں ہے، اس میں تحریف و تلبیس کے کافی مواقع ہیں اور دو مختلف مناظر کو مصنوعی طریقہ پر ایک دوسرے سے منسلک کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ فقہاء نے اسی احتیاط کے پیش نظر محض دستاویز اور تحریر کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، علامہ شامی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نقل کرتے ہیں:

”وفي الاشباه لا يعتمد على الخط ولا يعمل بمكتوب الوقف الذي عليه خطوط القضاة الماضين، لكن قال البيروني المراد من قوله لا يعتمد اي لا يقضي القاضي بذلك عند المنازعة لان الخط مما يزور يفتعل.“^۱

ترجمہ: ”اشباہ“ میں ہے کہ تحریر پر اعتماد نہیں کیا جائے گا اور نہ وقف کی ان دستاویزوں پر جن میں گزشتہ قاضیوں کی تحریریں ہوں، لیکن علامہ بیرونی کہتے ہیں کہ ”اعتقاد“ نہیں کیا جائے گا“ کا مطلب ہے کہ قاضی منازعت کے وقت اس پر فیصلہ نہیں کرے گا اس لئے کہ تحریر میں دھوکہ دہی اور بناوٹ کے کافی مواقع ہیں۔

جس طرح ویڈیو پر اعتبار کر کے فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح محض ویڈیو میں کسی واقعہ کو دیکھ کر اس کی صداقت کی گواہی بھی نہیں دی جاسکتی، اس لئے کہ شہادت نام ہی آنکھوں دیکھی بات کی خبر دینے کا ہے۔ ہی اخبار عن مشاہدہ و عیان لا عن تخمین و حساب۔ ویڈیو کے ذریعہ بھی کسی واقعہ کے وقوع کا مشاہدہ نہیں ہوتا بلکہ وہ محض اس کی تصویر کو دیکھتا ہے اور اس کے ذریعہ اندازہ و تخمین ہی کے درجہ میں کسی بات کے پیش آنے کا گمان کرتا ہے، اس لئے ایسی تخمینہ چیز کی بنیاد پر گواہی دینا جائز نہیں۔

وعدہ معاف گواہ

فقہاء نے شہادت و گواہی کے جو اصول بتائے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گواہ متہم ہوں اور امکان ہو کہ وہ کسی شخص سے انتقام لینے یا اس کو نقصان پہنچا کر اپنے آپ سے کسی مضرت کو دور کرنے کی غرض سے گواہی دے رہا ہے تو ایسے شخص کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی، چنانچہ فقہاء نے پہلے سے پائی جانے والی دنیوی عداوت کو گواہی کے قبول کرنے میں مانع قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں علامہ ابن نجیم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی مصری نے فقہ حنفی کی مشہور کتاب ”قنیہ“ کے حوالہ سے لکھا ہے:

”أن العداوة بسبب الدنيا لا تمنع مالم يفسق بسببها أو يجلب منفعة أو يدفع

بها عن نفسه مضرة وهو الصحيح و عليه الاعتماد. ۱۷
 تَرْجَمًا: وہ عداوت جو دنیاوی سبب سے ہو، گواہی کے لئے مانع نہیں۔ جب تک کہ اس دشمنی کی وجہ سے ”فسق“ کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ یا کسی فائدہ کا حاصل کرنا مقصود ہو یا اپنے آپ سے کسی مضرت کا دور کرنا ہو یہی صحیح ہے اور اسی پر اعتماد ہے۔

وعدہ معاف گواہ کا معاملہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مقدمہ سے آزاد کرانے کے لئے دوسرے کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ لہذا ایسی گواہی معتبر نہیں ہونی چاہئے۔ یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ اس پر کسی ایسے جرم کا الزام نہ ہو جو شرعاً موجب فسق ہو، اگر ایسا الزام لگایا گیا جو باعث فسق بھی ہے اور وعدہ معاف گواہ اپنے تئیں اس کا اقرار کر کے دوسرے کے خلاف گواہی دیتا ہے تو یہ گواہی یوں بھی معتبر نہ ہوگی کہ اس کا اقرار اس کے فاسق ہونے کی دلیل ہے اور فاسق کی شہادت معتبر نہیں۔

دباؤ کے تحت اقرار

پولیس، غنڈے یا اس طرح کے دوسرے عناصر کے جبر و دباؤ کے تحت اگر کسی بات کا اقرار کرا لیا جائے تو از روئے شرع اس اقرار کا کوئی اعتبار نہیں، نہ اس پر کوئی شرعی حکم مرتب ہو سکتا ہے اور نہ قاضی اس کو بنیاد بنا کر فیصلہ کر سکتا ہے، نکاح و طلاق کی نوعیت ایسی ہے کہ مزاحاً ایسے کلمات کہہ دیئے جائیں یا جبراً زبان سے کہلا لیا جائے پھر بھی نکاح ہو جاتا ہے اور طلاق پڑ جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود اگر نکاح و طلاق کا جبر و دباؤ کے ذریعہ اقرار کرا لیا جائے تو اس اقرار کا کوئی اعتبار نہیں، ۱۸ صُلْفٰی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”ولا یصح اقرارہ بطلاق و عتاق مکرھا“ ۱۹

تَرْجَمًا: ”حالت اکراہ میں طلاق و عتاق کا اقرار معتبر نہیں۔“

لہذا اس طرح جبر و دباؤ کے ساتھ کیا جانے والا اقرار قطعاً غیر معتبر ہے۔

غائب شخص کے خلاف فیصلہ

اگر ایک شخص نے کسی کے خلاف دعویٰ کیا اور جس کے خلاف دعویٰ کیا، وہ شخص موجود نہیں ہے یا اپنے مستقر پر موجود ہے لیکن حاضر نہیں ہوتا تو کیا صرف مدعی کے دعویٰ اور اس کی جانب سے پیش کی جانے والی شہادتوں کی بنیاد پر قاضی فیصلہ کر سکتا ہے؟..... جمہور فقہاء کے نزدیک ایسا کیا جاسکتا ہے امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک جب تک مدعا علیہ حاضر نہ ہو اس کے خلاف نہ مقدمہ کی سماعت ہو سکتی ہے اور نہ فیصلہ موجودہ حالات

میں اور بالخصوص ہندوستان جیسے ممالک میں قائم کئے جانے والے نظام دارالقضاء میں مدعا علیہ کی موجودگی کی شرط انصاف کو دشوار تر بنادے گی اور ملزم کے لئے یہ بات بہت آسان ہو جائے گی کہ وہ غائب ہو کر اپنے جرم کی پردہ داری کر لے اور ہر طرح کی دار و گیر سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے، قضاء کے تمام احکام کی اصل بنیاد یہ ہے کہ مظلوم کو انصاف ملے اور ظالم کو اس کے جور سے روکا جاسکے اگر نظام قضاء اس ضرورت کو پورا نہ کر سکے تو اس کا فائدہ ہی کیا ہوگا؟

اس لئے ہندوستان کے موجودہ حالات میں جو طریقہ کار مناسب ہے وہ یہ ہے کہ:

① اگر مدعا علیہ غائب ہو اور اس کا کوئی پتہ نہ چل پاتا ہو یا اس کے پاس مدعی کے دعویٰ کی بابت اطلاع دینا اور رفع الزام کے لئے طلب کیا جانا ممکن نہ ہو، لیکن اس کا کوئی قریبی رشتہ دار اور بھی خواہ جس سے اس کے حقوق کے تحفظ کی امید کی جاسکتی ہو، موجود ہو تو طلب کیا جائے، اس کی حیثیت مدعا علیہ کی طرف سے پیروکار کی ہوگی، اس کو فقہ کی اصطلاح میں ”وکیل مسخر“ کہتے ہیں:

”وتفسير المسخر ان ينصب القاضي و كيلا عن الغائب لسمع الخصومة عليه“^۱

ترجمہ: ”اور ”مسخر“ کی تفسیر یہ ہے کہ قاضی، غائب کی طرف سے کسی کو وکیل بنادے جو اس کے مقدمہ کی پیروی کرے۔“

ہر چند کہ فقہاء متقدمین صرف پانچ ہی قسم کے مقدمات میں وکیل مسخر مقرر کرنے کی اجازت دیتے تھے، لیکن **حسکفی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی** نے متاخرین کا رجحان اس طرح نقل کیا ہے:

”فالمأخرون ان القاضي ينصب و كيلا في الكل وهو قول الثاني.“^۲

ترجمہ: ”متاخرین کی رائے ہے کہ قاضی تمام مقدمات میں کسی کو وکیل مقرر کر دے گا اور یہی ابو یوسف **رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی** کا خیال ہے۔“

”پس **حسکفی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی** کی اس صراحت اور موجودہ حالات کے پس منظر میں:

① اگر مدعا علیہ غائب ہو اور اس کا پتہ نہ چلتا ہو تو ہر زمانہ کے معروف طریقہ تشہیر و ابلاغ کے ذریعہ مدعا علیہ کے خلاف کئے جانے والے دعویٰ کی تشہیر کی جائے اور اس کو رفع الزام کے لئے بلایا جائے۔

② اگر مدعا علیہ موجود ہو مگر چھپا پھرتا ہو اور دارالقضاء کی نوٹس اس تک پہنچانی ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی وکیل مسخر کا سہارا لیا جائے۔ علامہ **حسکفی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی** نے لکھا ہے کہ اگر مدعا علیہ چھپ جائے تو امام ابو

یوسف رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی کے نزدیک وکیل مسخر سے حلف لے کر مقدمہ کی کارروائی جاری رکھی جائے گی، نیز یہ بھی صراحت کی ہے کہ متاخرین فقہاء کا اسی پر عمل ہے۔^۱

۳ اگر مدعا علیہ کو پیشگی اطلاع دے دی جائے اور اس کے باوجود وہ رفع الزام سے گریز کرے یا دارالقضاء کے ذریعہ دی جانے والی نوٹس کو قبول نہ کرے تو رفع الزام سے گریز کی یہ صورتیں نکول عن الحلف کے حکم میں ہوں گی اور اس کی بنیاد پر قاضی فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا۔

فون پر شہادت و گواہی

فون پر شہادت و گواہی معتبر نہیں، گواہی کی شرطوں میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ گواہ قاضی کے اجلاس پر حاضر ہو کر گواہی دے، بلکہ فقہاء نے گواہی کی تعریف میں ہی اس بات کو داخل کیا ہے کہ مجلس قضاء میں وہ بات کہی گئی ہو، علامہ حنفی رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”اخبار صدق لا ثبات حق بلفظ الشهادة في مجلس القاضي“^۲

ترجمہ: ”گواہی کسی حق کے ثبوت کے سلسلہ میں کسی سچے آدمی کی خبر کا نام ہے جو قاضی کی مجلس

میں حاضر ہو کر لفظ شہادت کے ذریعہ سے بیان کرے۔“

فون پر کوئی بات کہی جائے تو ظاہر ہے اس میں یہ شرط مفقود ہوگی، اس لئے شہادت کے لئے فون پر اطلاع کافی نہیں۔

غیر مسلم حج کے ذریعہ تنسیخ نکاح

اسلامی نقطہ نظر سے مسلمانوں پر غیر مسلم قاضی نہیں ہو سکتا۔ فقہاء کے یہاں اس سلسلہ میں صراحتیں موجود ہیں..... اس لئے غیر مسلم حج کی طرف سے نکاح فسخ کر دیا جائے تو شرعاً اس کا اعتبار نہیں، اصل یہ ہے کہ ایک بار نکاح کے وجود میں آ جانے کے بعد پھر شوہر ہی اس بات کا اختیار رکھتا ہے کہ اس رشتہ کو ختم کرے، لیکن چوں کہ قاضی کو مسلمانوں پر عمومی ولایت حاصل ہے اس لئے وہ بہ حیثیت ”ولی“ عورت سے ظلم کو دفع کرنے کے لئے نکاح کو فسخ کر دیتا ہے، اب اس بات پر اجماع ہے کہ غیر مسلم کو مسلمانوں پر ولایت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اگر باپ خدا نخواستہ مرتد ہو جائے تو مسلمان بیٹے پر اس کی ولایت باقی نہیں رہے گی، خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”لا يتخذ المؤمنون الكافرين اولياء من دون المؤمنين ومن يفعل ذلك فليس

من الله في شيء الا أن تتقوا منهم تقاة.“^۳

^۱ رد المحتار: ۴/۳۴۰، ^۲ رد المحتار: ۴/۳۹۸، ^۳ آل عمران: ۲۸

تَرْجَمًا: ”اہل ایمان مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اولیاء نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کے یہاں کسی شمار میں نہیں، مگر ہاں ایسی صورت میں کہ تم ان سے کچھ اندیشہ رکھتے ہو۔“
لہذا کسی غیر مسلم حج کا نکاح فسخ کر دینا غیر معتبر ہے اور اگر عدالت اس کا فیصلہ بھی کر دے تو اپنے علاقہ کے ”قاضی شریعت“ سے رجوع ہو کر دوبارہ اپنے معاملہ کی تنقیح کرائی جائے۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ مقدمات کی کارروائی کی ترسیل

مقدمات کی تحقیق اور کارروائی میں اکثر اوقات مراسلت کی ضرورت پڑتی ہے، ایک حلقہ کا قاضی دوسرے حلقہ کے قاضی کے پاس مقدمہ کی کارروائی بھیجتا ہے، یہ ایک ضرورت ہے، دوسری طرف قضاء کا کام نہایت احتیاط کا متقاضی ہے، ایک جگہ سے دوسری جگہ تحریر بھیجنے میں دھوکہ اور تزویر کا کافی اندیشہ ہے۔ اس لئے فقہاء نے ایک جگہ سے دوسری جگہ مقدمات سے متعلق فائل اور تحریریں بھیجنے کی اجازت دی ہے، ابتداء تو بعض نازک مقدمات ایک جگہ سے دوسری جگہ بذریعہ تحریر بھیجنے کی اجازت نہیں تھی، لیکن فقہاء متاخرین نے حدود و قصاص کے ساتھ تمام ہی مقدمات میں اس کی اجازت دی ہے لیکن ازراہ احتیاط یہ شرط بھی لگائی ہے کہ قاضی کم سے کم دو شخص کو گواہ بنا کر اور مضمون سنا کر تحریر حوالہ کرے اور ان ہی کے سامنے تحریر کو لفافہ میں ڈال کر مہر بند کرے، نیز مکتوب الیہ کا پتہ لکھے، پھر مکتوب الیہ قاضی اولاً مہر کو ملا حظہ کرے اور فریق مخالف کو طلب کر کے فریق اور گواہان کے سامنے اسے پڑھے اور گواہان اس مضمون کی تصدیق کریں کہ یہی تحریر قاضی نے حوالہ کی تھی، اب جا کر اس تحریر کا اعتبار کیا جائے گا۔

آج کی دنیا میں تعلقات اور معاملات کے دائرے بہت وسیع ہو گئے ہیں، بعض اوقات فریقین کا تعلق دو الگ الگ ملکوں سے ہوتا ہے یا ایک ہی ملک کے دو ایسے شہروں سے ہوتا ہے جو طویل مسافت پر واقع ہوتے ہیں، ایسی صورت میں اگر مقدمہ کی کارروائی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے دو آدمیوں کو بھیجنا پڑے تو اتنا کثیر صرفہ آئے گا کہ انصاف کا حصول محض تمنا بن کر رہ جائے گا، دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں ڈاک کا ایسا نظام قائم ہو گیا ہے جو بمقابلہ قدیم زمانہ کے کافی ترقی یافتہ بھی ہے اور محفوظ و قابل اطمینان بھی۔ فقہاء کا مقصود اصل میں صرف اتنا ہے کہ مکتوب الیہ کو اس بات کا اطمینان حاصل ہو جائے کہ جس شخص کی طرف تحریر کی نسبت کی گئی ہے، فی الواقع یہ اسی کی تحریر ہے آج کل رجسٹری اور انشورنس کے ذریعہ محفوظ طریقہ پر ڈاک کا جو نظام قائم کیا گیا ہے۔ وہ مناسب حد تک قابل اطمینان ہے اور اس پر تجربات اور آئے

دن کے واقعات شاہد ہیں۔ اگر کوئی معاملہ مشکوک نظر آئے تو دوبارہ مراسلت یا فون کے ذریعہ اس کی تحقیق بھی ممکن ہے، اس لئے موجودہ حالات میں ان ذرائع سے مقدمات کی کارروائی بھیجنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ضرورت کی بناء پر رشوت دینا

رشوت جس طرح لینا حرام ہے اس طرح اصولی طور پر رشوت کا دینا بھی حرام ہے۔ اس سلسلہ میں فقہاء کے یہاں ایک متفق علیہ اصول ہے کہ جس چیز کا لینا جائز نہیں اس کا دینا بھی جائز نہیں۔ ”ما حرم أخذہ حرم اعطاءہ“ البتہ چوں کہ رشوت لینا کبھی بھی مجبوری نہیں بن سکتی اور رشوت دینا بعض دفعہ مجبوری بن جاتی ہے۔ اس لئے فقہاء نے ضرورت اور مجبوری کے مواقع پر رشوت دینے کی اجازت دی ہے اور اس سلسلہ میں حضور ﷺ کے اس عمل کو پیش نظر رکھا ہے کہ آپ ﷺ بعض شر پسند شعراء کو اس لئے کچھ دیا کرتے تھے کہ وہ بے ہودہ ہجو پر مبنی اشعار کہنے اور مسلمانوں کو بدنام کرنے سے اجتناب کریں۔

رشوت دینے کی گنجائش کب ہوگی؟ اس سلسلہ میں فقہاء نے یہ اصول متعین کیا ہے کہ اگر رشوت نہ دے تو نا حق طریقہ پر اس کو جانی یا مالی نقصان کا اندیشہ ہو یا یہ اندیشہ ہو کہ جس ذمہ دار کے پاس اس کی درخواست زیر غور ہے وہ اس کے ساتھ انصاف سے کام نہ لے گا اور اس کے اور دوسرے امیدواروں کے درمیان مساویانہ سلوک روا نہیں رکھے گا۔ علامہ ابن نجیم رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی لکھتے ہیں:

”الرشوة لخوف على نفسه أو ماله أو ليسوى أمره عند السلطان أو أمير.“^۱
 تَرْجَمًا: ”جان یا مال پر خوف کی وجہ سے نیز اس لئے کہ سلطان یا امیر اس کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرے رشوت دینے کی گنجائش ہے یہ ممنوع صورتوں سے مستثنیٰ ہے۔“

متفرق مسائل

ووٹ کی شرعی حیثیت

ووٹ کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ اس کی حیثیت شہادت اور گواہی کی ہے کہ وہ جس ممبر کو ووٹ دے رہا ہے اس

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: اسلامی عدالت: ۱/۳۳: ۴۲۵

۲۔ الاشباہ والنظائر: ص ۳، ط: دارالفکر

کے بارے میں گواہ ہے کہ اس کو ملک و قوم کے لئے مفید اور خیر خواہ سمجھتا ہے۔ اس کی حیثیت مشورہ کی ہے کہ وہ حکومت اور نظم و نسق کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ کون زیادہ بہتر اور ایمان دار ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ اس کی حیثیت سفارش کی ہے کہ وہ اپنے اس امیدوار کے لئے ایک اہم عہدہ اور ذمہ داری کی سفارش کرتا ہے۔ اور اس کی حیثیت وکیل نامزد کرنے کی ہے کہ وہ سیاسی مسائل میں اس کو اپنا وکیل اور نمائندہ نامزد کرتا ہے نیز اگر مسلم ملک ہو تو ان سب کے علاوہ ووٹ کی حیثیت سیاسی بیعت کی ہے کہ وہ ووٹ کے ذریعہ متعلقہ امیدوار کو وکیل بناتا ہے کہ وہ اس کی طرف سے سربراہ مملکت کا انتخاب کرے، آج اگر وہ خوش قسمت ساعت آئے کہ دنیا کے کسی خطہ میں ”خلافت علی منہاج النبوة“ قائم ہو تو یہ ظاہر اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ عامۃ المسلمین کے بالغ و مکلف مرد اپنے ووٹ کے ذریعہ نمائندہ منتخب کریں اور پھر وہ باہمی رائے سے امیر کا انتخاب کریں اور تمام لوگوں کی طرف سے وکالت اور نیابت اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ بیعت کے لئے ضروری نہیں ہے کہ ہاتھ ہی سے بیعت کی جائے۔ چنانچہ امام بخاری رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی نے عبد اللہ بن دینار رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے دو سندوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے عبد الملک بن مروان سے بذریعہ مراسلت بیعت کی ہے۔ ابن عمر رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے اس روایت میں اپنی طرف سے سمع و طاعت کا اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ میرے بچوں نے بھی اس کا اقرار کیا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات کافی ہے کہ امیر کسی کو بیعت کے لئے وکیل بنائے یا بیعت کرنے والا کسی کو بطور وکیل بھیجے کہ اس کی طرف سے اظہار وفاداری کرے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ عبادہ بن صامت رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو اپنی طرف سے بیعت لینے کا حکم فرمایا تھا۔ اپنے حق رائے دہی کے استعمال کی حیثیت بڑی نازک اور اہم ہے۔ ایک شخص کو غیر مفید سمجھنے کے باوجود اس کو ووٹ دینا شہادت زور، جھوٹا مشورہ اور غلط سفارش جیسے گناہوں کا حامل ہے۔

مکرر ووٹ دینا، دھوکہ دینا ہے۔ اسی طرح رائے دہی کی جو عمر متعین ہے اس سے کم عمر کے لوگوں کا ووٹ دینا بھی جائز نہیں ہے۔ اس کا اندازہ بعض روایات سے بھی ہوتا ہے۔ عبد اللہ بن ہشام رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کو ان کی والدہ زینب بنت حمید رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہَا، حضور ﷺ کی خدمت میں لے گئیں اور عرض کیا کہ ان کو بیعت فرما لیجئے، اس وقت وہ کم سن تھے۔ حضور ﷺ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں چوں کہ وہ بالغ نہیں ہوئے تھے اس لئے آپ ﷺ نے بیعت نہیں لی، صرف دست شفیقت پھیرنے پر اکتفا فرمایا۔

۱۔ بخاری عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ۱۰۶۹/۲ باب کیف یبایع لامام الناس

۲۔ بخاری عن ابن شہاب: ۱۰۷۱/۲ باب بیعتہ النساء ۳۔ بخاری عن عبد اللہ بن ہشام: ۱۰۷۱/۲ باب بیعتہ الصغیر

بھوک ہڑتال

اپنی ناراضگی کے اظہار اور تنقید کا ایک طریقہ ”بھوک ہڑتال“ بھی ہے جس میں انسان بھوکا رہ کر اپنے آپ کو ناراض ظاہر کرتا ہے اور احتجاج کرتا ہے۔ بسا اوقات اس کی جان تک چلی جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور ایسے واقعات بھی ظہور میں آتے رہتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے یہ صحیح نہیں ہے۔ زندگی کے تحفظ کے لئے اور اپنی توانائی کو معمول پر رکھنے کی غرض سے غذا کھانا واجب ہے:

”اما الاكل فعلى مراتب فرض وهو ما يندفع به الهلاك فان ترك الاكل والشرب حتى هلك فقد عصي ولا يجوز الرياضة بتقليل الاكل حتى ضعف عن اداء الفرائض ولو جاع ولم ياكل مع قدرته حتى مات يأثم^۱۔“
ترجمہ: ”کھانے کے چند درجات ہیں۔ اتنا کھانا جس کے ذریعہ جان بچ سکے فرض ہے۔ لہذا اگر کھانا پینا چھوڑ دے یہاں تک کہ مر جائے وہ گنہگار ہوگا..... کم کھانے کی ایسی ریاضت جائز نہیں ہے کہ فرائض کی ادائیگی سے عاجز ہو جائے..... اگر بھوک لگے اور قدرت کے باوجود نہ کھائے یہاں تک کہ مر جائے تو گنہگار ہوگا۔“

اسلام اس قسم کے غلو اور افراط کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے ان صحابہ رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ کو بھی منع کر دیا جو عبادت کی غرض سے مسلسل روزے رکھنا چاہتے تھے۔ اور اس نے تنقید و احتجاج کا طریقہ بھی واضح کر دیا ہے جسے قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ”نہی عن المنکر“ کہا جاتا ہے کہ اس کے لئے جہاں ممکن اور ضرورت ہو قوت کا استعمال کیا جائے ورنہ پر امن طور پر زبان سے کام لیا جائے۔

ہینا ٹزم

ہینا ٹزم اس زمانے میں ایک مستقل فن بن چکا ہے جس کو عربی زبان میں ”عمل تنویم“ کہتے ہیں۔ اس فن کے ذریعہ آدمی دوسرے پر کسی ظاہری دباؤ کے بغیر تصرف کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح یہ اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے سحر اور جادو سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس کا سیکھنا اور سکھانا درست نہ ہوتا جیسا کہ ملا علی قاری رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی نے سحر کے سلسلہ میں احناف کی رائے نقل کی ہے:

”و حاصل مذهبنا ان فعله فسق و يحرم تعلمه خلافا للغزالي لخوف الافتتان

۱۔ الفتاویٰ الہندیہ: ۳۸/۵، ۳۳۶ کتاب الکراہیۃ فی الاکل

والا ضرار۔“^۱

ترجمہ: ”ہمارے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ سحر کا کرنا فسق ہے اور اس کا سیکھنا فتنہ اور اذیت کے

اندیشہ سے حرام ہے بخلاف غزالی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے۔“

لیکن اس فن کے ذریعہ طب و علاج میں بھی بڑی مدد لی جاسکتی ہے۔ اس لئے اگر سیکھنے اور سکھانے والے کی

نیت درست ہو تو اسے جائز قرار دیا جائے گا کہ یوں فتنہ اور نقصان پہنچانے کا احتمال کچھ نہ کچھ ہر فن اور اس کی

تعلیم و تعلم میں ہے۔ واللہ اعلم

اظہارِ غم کے بعض نئے طریقے

مغربی تہذیب کی تقلید اور اس سے مرعوبیت کے نتیجہ میں مسلمانوں میں بھی سوگ کے بعض ایسے طریقے

راج ہو گئے ہیں جو غیر اسلامی ہیں۔ مثلاً تھوڑی دیر خاموش رہنا، جھنڈے سرنگوں کر دینا، سیاہ پٹیاں باندھنا، ماتمی

دھن بجانا، اظہارِ غم کے یہ سبھی طریقے ناجائز ہیں۔ فطری طور پر بے ساختہ جو آنسو نکل پڑے، صرف اس کی

اجازت ہے۔^۲

اسلام سے پہلے بھی بعض طریقہ مروج تھے مثلاً نوحہ اور گریہ وزاری کرنا، کپڑے پھاڑنا، رونا اور ایک مدت

تک سوگ کرتے رہنا، حضور ﷺ نے ان سے منع فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو سر کے بال منڈالے،

چلا کے روئے اور کپڑے پھاڑ لے میں اس سے بری ہوں۔^۳ اور یہ کہ جو رخسار پیٹے، گریبان پھاڑ لے اور جاہلیتکی طرح پکارے وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔^۴ آپ ﷺ نے شوہر کے علاوہ کسی کے لئے تین دنوںسے زیادہ سوگ کی اجازت نہیں دی، صرف بیوی کو ۴ ماہ ۱۰ دن شوہر کا سوگ کرنے کی اجازت دی ہے۔^۵ فقہاء

نے اس مقصد کے لئے سیاہ کپڑے پہننے سے منع کیا ہے:

”لا يجوز صبغ الثياب اسود تأسفا على الميت لا يجوز تسويد الثياب في

منزل الميت“^۶

ترجمہ: ”میت پر ماتم کرتے ہوئے کپڑے کو سیاہ رنگ میں رنگنا جائز نہیں ہے۔۔۔۔۔ نہ یہ جائز ہے

^۱ فتح الملہم: ۲۵۵/۱ بحوالہ مرقاة المفاتیح ^۲ بخاری و مسلم عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰعنه باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انا بک لمحزونون: ۱۲۷/۱ ^۳ بخاری و مسلم عن ابی موسیٰ باب ماینہی من الحلق عند المصیبة ^۴ بخاری و مسلم عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنه باب لیسمینامن شق الجیوب ^۵ بخاری و مسلم عن ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنها، زینب بنت جحش و ام عطیہرضی اللہ تعالیٰ عنها باب حداد المرأة علی غیر زوجها ^۶ الفتاویٰ الہندیہ: ۲۳۳/۵

کہ میت کے گھر کے کپڑے سیاہ رنگ میں رنگ دیئے جائیں۔“
اس سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے رسمی ماتموں کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

اپریل فول

یکم اپریل کو جو غلط قسم کے ہنسی مذاق کئے جاتے ہیں اور اکثر اوقات دھوکہ دہی سے کام لیا جاتا ہے، یہ قطعاً نا درست ہیں اور اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں کئی برائیاں جمع ہو جاتی ہیں: جھوٹ، دروغ گوئی، دھوکہ، اس کی وجہ سے اذیت رسانی اور ان سب کے علاوہ فاسقوں اور بے دین لوگوں کی روش کی پیروی اور ان سے تشبہ، جس سے قوم میں غیر اسلامی شعار کے احترام اور تقلید کا خطرناک مزاج پیدا ہوتا ہے۔ اسلام نے بے شک مزاح کی اجازت دی ہے، خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پاکیزہ ظرافت اور تفریح طبع کے نمونے موجود ہیں لیکن یہ کہ کسی خاص دن کو اس قسم کی باتوں اور ہنسی مذاق کے لئے مختص کر لیا جائے اور اس کے لئے دروغ گوئی اور فریب کو راہ دے دیا جائے، اور ہر قسم کے جھوٹ کو سند جواز بخش دیا جائے اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حدیث میں ہے۔

”لایومن العبد الايمان كله حتى يترك الكذب في المزاح والمرء وان كان صادقاً۔“^۱

ترجمہ: ”بندہ اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ مزاح اور جھگڑے میں بھی جھوٹ نہ چھوڑ دے گو کہ وہ عام حالات میں راست گو ہی ہو۔“

غیر مسلموں کے جلوس جنازہ وغیرہ میں شرکت

غیر مسلموں کے لئے ایصالِ ثواب، ان کی میت پر قرآن مجید پڑھنا یا دعاء مغفرت کرنا بالکل جائز نہیں۔ قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اس سے منع کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت ابوطالب کے لئے دعا کرنی چاہی تو آپ کو اس سے منع فرما دیا گیا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن نے بتایا کہ انہوں نے پہلے اپنے والد کے لئے دعاء مغفرت کرنے کا وعدہ فرمایا، لیکن پھر جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ ایمان کا دررحمت ان پر بند ہے اور وہ حق کی عداوت میں پوری طرح مبتلا ہیں تو آپ نے استغفار ترک کر دیا۔

”ماکان للنبی و الذین آمنوا أن یستغفروا للمشرکین ولو کانوا ولی قریبی من بعد ماتبین لهم انهم اصحاب الجحیم و ماکان استغفار ابراہیم لابیہ الا عن

موعده وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدوللہ تبرأ منہ۔^۱ ”نبی اور مؤمنوں کے لئے روا نہیں ہے کہ مشرکین کے لئے دعاء مغفرت کریں، اس کے باوجود کہ ان پر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ وہ دوزخی ہیں چاہے وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں۔ نیز ابراہیم (علیہ السلام) کا اپنے (کافر) باپ کے لئے دعاء مغفرت کرنا محض اس وعدہ کی بناء پر تھا جو وہ اپنے والد سے کر چکے تھے۔ پھر جب ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے دستبردار ہو گئے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ مقام عسفان پر تشریف لے گئے، وہاں اپنی والدہ کی قبر دیکھی تو رونے لگے اور فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے ان کے لئے استغفار کی اجازت چاہی، لیکن نہ دی گئی۔ ایک اور موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے رأس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے لئے دعاء مغفرت کرنی چاہی تو منع کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ آپ ستر بار بھی ان کے لئے دعا کریں تو بھی مغفرت نہ ہوگی۔^۲ اسی طرح کافروں پر نماز جنازہ اور ان کی قبروں پر کھڑا ہونا بھی درست نہیں رسول اللہ ﷺ کو اس سے منع کرتے ہوئے کہا گیا:

”ولا تصل علی احد منهم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ“^۳

ترجمہ: ”ان میں سے کسی مرنے والے پر کبھی نہ نماز جنازہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوئے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کے جلوس جنازہ میں شریک ہونا، ان کی قبروں پر پھول چڑھانا یا ان کے لئے دعاء مغفرت کرنا قطعاً جائز نہیں۔

غیر مسلموں کے تیوہاروں میں شرکت

اسی طرح غیر مسلموں کے تیوہاروں میں شریک ہونا درست نہیں۔ اسلام اس باب میں بہت غیرت مند واقع ہوا ہے۔ اسی لئے اسلام نے ان آستانوں (نصب) پر قربانی کو درست نہیں قرار دیا، جہاں بت پرست قربانی کیا کرتے تھے۔ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور ﷺ سے اہل ایران کی طرح نیروز و مہرجان کی عید منانے کی اجازت چاہی، لیکن آپ ﷺ نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور استواء کے وقت نماز سے اس لئے منع کیا گیا کہ اس وقت آفتاب پرست اور بت پرست قومیں عبادت کیا کرتی

^۱ التوبہ: ۸۴

^۲ توبہ: ۱۱۴

^۳ لباب النقول علی هامش جلالین ص: ۱۸۰

^۴ التوبہ: ۸۴

تھیں، یوم عاشور کا روزہ یہود بھی رکھتے تھے، اس لئے امتیاز کے لئے اس کے ساتھ ایک اور روزہ ملانے کا حکم فرمایا گیا۔

جو دین، اسلام و کفر کے معاملہ میں اس قدر غیرت مند ہو، کیوں کر سوچا جاسکتا ہے کہ وہ غیر اسلامی تیوہاروں میں اور ان کی رنگ رلیوں میں شرکت کی اجازت دے گا اور اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گا۔ یہ ایک طرح کا کفر کا تعاون ہے جس سے قرآن نے منع کیا ہے۔

غیر مسلموں کی عبادت گاہ و تیوہار میں تعاون

مسلمان کے لئے یہ حیثیت مسلمان یہ بات واجب ہے کہ وہ شرک سے براءت کا اظہار کرے اس لئے کسی بھی درجہ میں مشرکانہ اور کفریہ اعمال میں تعاون جائز نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾ ۱

ترجمہ: ”نیکی اور تقویٰ کے سلسلہ میں باہم تعاون کرو اور گناہ و سرکشی کے معاملہ میں کسی کی مدد مت کرو۔“

اسی بناء پر فقہاء نے حرام کاموں کے ذرائع کو بھی حرام کہا ہے، غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی تعمیر یا پوجا پاٹ میں چندہ دینا صریحاً کفر و شرک میں تعاون ہے اور یہ شدید گناہ ہے، بلکہ اگر کوئی شخص بطیب خاطر اس میں مدد کرے تو کفر کا اندیشہ ہے اور کراہت خاطر کے ساتھ شدید مجبوری کے بغیر کرے تو بھی گناہ سے خالی نہیں۔ ہاں اگر ایسے حالات ہوں کہ تعاون نہ کرنے کی صورت میں فرقہ وارانہ فساد کا اندیشہ ہو، جان و مال عزت و آبرو اور ملازمت خطرے میں ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ دے سکتے ہیں، ایسے مواقع پر غیر مسلم بھائیوں کو حقیقی صورت حال سمجھانا چاہئے اور سمجھانا چاہئے کہ اس کا تعلق مذہبی رواداری یا تشدد سے نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے عقیدہ اور مذہبی امور میں بے جا مداخلت یا مذہبی طور پر بقاء باہم کے اصول سے ہے اور ہمارے عقیدہ کے لحاظ سے پوجا پاٹ میں چندہ دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص خود اس میں شریک ہو جائے۔

قرآن مجید کا غیر عربی متن

بمجد اللہ اس وقت دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم کئے جا رہے ہیں۔ یہ ایک مستحسن اور پسندیدہ قدم ہے، لیکن بعض علاقوں میں قرآن مجید کے متن کو بھی غیر عربی رسم الخط جیسے انگریزی وغیرہ میں لکھا جا رہا ہے، یہ نہایت خطرناک اور نامناسب عمل ہے، عربی زبان کا تلفظ نہایت لطافت کا حامل ہے، جس میں

معمولی سی تبدیلی معنی و مقصود کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اس لئے علماء نے غیر عربی رسم الخط میں قرآن کی کتابت کو منع کیا ہے۔ علامہ سیوطی رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کا بیان ہے:

”لم يجوز احد من الائمة الاربعة كتابة القرآن بغير العربية“^۱

ترجمہ: ”عربی کے علاوہ کسی دوسرے رسم الخط میں قرآن کی کتابت کو چاروں اماموں میں سے کسی نے جائز قرار نہیں دیا۔“

بلکہ خود عربی تحریر کے لئے بھی قرآن کا وہ رسم الخط متعین ہے جو مصحف عثمانی کے مطابق ہو، متن قرآن مجید کے سلسلہ میں سلف کی اسی احتیاط کی وجہ سے بعض بددینوں کی کوششوں کے باوجود اس میں ادنیٰ تحریف نہ کی جاسکی۔ جو لوگ عربی زبان سے واقف نہ ہوں تو جب تک قرآن کو نہ سیکھ پائیں اور تلاوت پر قادر نہ ہو جائیں، نماز کی حالت میں تسبیح اور کلمہ طیبہ کے ورد پر بھی اکتفاء کر سکتے ہیں۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو جب تک مجبور ہوں، امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ تَعَالٰی کے مسلک کے مطابق اس کا ترجمہ پڑھنے پر قناعت کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تذکیر و موعظت کے لئے بھی انشاء اللہ قرآن کا یہ ترجمہ ہی کفایت کر جائے گا۔ بہر حال غیر عربی رسم الخط میں متن قرآن کا لکھنا جائز نہیں۔

قومی جھنڈے کی سلامی

آج کل ہندوستان اور بعض دیگر ممالک میں ازراہ احترام و تقدیس قومی جھنڈے کو جھک کر سلامی دی جاتی ہے، شرعاً یہ عمل ناجائز ہے اور مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہئے اور اگر کہیں ان کو اس پر مجبور کیا جائے، تو ممکن حد تک قانون و آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، تاہم جہاں ایسا ممکن نہ ہو، اور اس سلامی کو شرائط ملازمت میں داخل کر دیا گیا ہو، نیز اس ملازمت سے محرومی کی صورت مشقت کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے کراہت خاطر کے ساتھ سلامی جائز ہوگی کہ یہ ایک حاجت ہے، اور حاجت ضرورت کے درجہ میں آکر ناجائز چیزوں کے لئے وقتی اور عارضی طور پر وجہ جواز بن جاتی ہے۔

”الحاجة تنزل منزلة الضرورة“ اور ”الضرورات تبیح المحظورات“

کتابوں کی رسم اجراء

آج کل کتابوں کی ”رسم اجراء“ کا طریقہ عام طور پر مروج ہے، گو سلف سے اس طرح کا معمول منقول نہیں، لیکن یہ خلاف شرع بھی نہیں ہے، اس کا بنیادی مقصد کتاب کا تعارف اور اس کی تشہیر و اشاعت ہے اور جو چیزیں

عبادت کے قبیل سے نہ ہوں اور نہ شریعت نے ان کو صراحۃً مباح کیا ہو اور نہ منع کیا ہو، ان میں حکم کی بنیاد مقاصد پر ہوتی ہے، کتاب اگر دینی اور صالح مضامین پر مشتمل ہو تو اس کا تعارف اور اشاعت معروف کی دعوت اور منکرات سے روکنے میں تعاون ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جائز ہے۔

برتھ ڈے

یوم میلاد منانا۔ جس کو برتھ ڈے کہتے ہیں۔ نہ کتاب و سنت سے ثابت ہے نہ صحابہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ اور سلف صالحین رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی کے عمل سے، شریعت نے بچوں کی پیدائش پر ساتویں دن عقیقہ رکھا ہے جو مسنون ہے اور جس کا مقصد نسب کا پوری طرح اظہار اور خوشی کے اس موقع پر اپنے اعزہ و احباب اور غرباء کو شریک کرنا ہے، برتھ ڈے کا رواج اصل میں مغربی تہذیب کی ”برآمدات“ میں سے ہے جو حضرت مسیح عَلَیْہِ السَّلَام کا یوم پیدائش بھی مناتے ہیں، آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے دوسری قوموں سے مذہبی اور تہذیبی مماثلت اختیار کرنے کو ناپسند فرمایا ہے، اس لئے یہ جائز نہیں، مسلمانوں کو ایسے غیر دینی اعمال سے بچنا چاہئے۔

قرآن مجید اٹھانا

آج کل قسم کے لئے قرآن مجید کا اٹھانا، قرآن کا سر پر رکھنا اور قرآن پر ہاتھ رکھ کر اپنی بات کہنا عام طور پر مروج ہے۔ گو یہ قسم کھانے کا درست اور بہتر طریقہ نہیں ہے، لیکن چوں کہ قسم کھانے کی اساس عرف و رواج اور تعبیر اور اظہار کے طریقہ پر ہے، اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ اس سے قسم ہو جائے گی، فقہ حنفی کی مشہور کتاب ”مجمع الانہر“ میں ہے:

”وقال العینی لو حلف بالمصحف او وضع یدہ علیہ او قال و حق هذا فهو

یمین ولا سیما فی هذا الزمان الذی کثر فیہ انحلف بہ۔“^۱

ترجمہ: ”علامہ عینی رَحِمَہُمُ اللہُ تَعَالٰی نے کہا ہے کہ اگر مصحف کی قسم کھالے، یا اس پر اپنا ہاتھ رکھے یا کہے اس کے حق کی قسم، تو یہ قسم ہی ہے خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ اس طرح قسم کھانے کی کثرت ہو گئی ہے۔“

پرندوں وغیرہ کی شکل میں قرآن کی کتابت

کسی عمل کے بہتر ہونے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ اس کے لئے طریقہ کار بھی بہتر اختیار کیا جائے،

غیر شرعی طریقہ جائز کونا جائز اور محمود کو مذموم بنا کر رکھ دیتا ہے۔ آج کل بعض آرٹسٹ قرآنی آیات کو پرندوں اور بعض جانوروں یا خود انسان کی صورت میں تحریر کرتے ہیں، یہ صورت قطعاً ناجائز ہے اور اس میں قرآن مجید کی اہانت اور اس کے ساتھ استخفاف ہے۔ اعاذنا اللہ منہ

بائبل لے کر حلف اٹھانا

ہندوستان میں عدالتوں میں مسلمانوں سے قرآن اور ہندوؤں سے شاستر اٹھوایا جاتا ہے، لیکن بعض مغربی ممالک میں عدالت میں ہر شخص اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ تورات یا انجیل پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کا عہد کر لے، مسلمان چوں کہ ان کتابوں کو محرف اور تبدیل شدہ باور کرتے ہیں اور بحالت موجودہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کو افتراء علی اللہ گردانتے ہیں۔ اس لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ان کتابوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں۔ کیوں کہ یہ ان کتابوں کی تعظیم اور بحالت موجودہ ان کی منجانب اللہ ہونے کی تصدیق کرنے کے مرادف ہوگا، البتہ اگر وہ اس پر مجبور ہوں اور انصاف حاصل کرنا اور ظلم سے بچنا اسی پر موقوف ہو تو کراہت خاطر کے ساتھ ہاتھ رکھا جاسکتا ہے، چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کے تحت اسلامک فقہ اکیڈمی کے اجلاس منعقدہ ۸/ تا ۱۶/ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ میں علماء اس مسئلہ میں جن نکات پر متفق ہوئے، ان میں ایک یہ ہے کہ:

”اذا كان القضاء في بلد ما حكمه غير اسلامي يوجب على من توجهت عليه اليمين وضع يده على التوراة أو الانجيل أو كليهما فعلى المسلم أن يطلب من المحكمة وضع يده على القرآن فان لم يستجب لطلبه يعتبر مكرهاً ولا بأس عليه أن يضع يده عليهما أو على أحدهما دون أن ينوي بذلك تعظيماً.“

ترجمہ: ”اگر کسی ملک میں غیر اسلامی حکومت ہو اور وہاں تورات یا انجیل یا ان دونوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کا حکم دیا جاتا ہو تو مسلمان پر واجب ہے کہ وہ عدالت سے مطالبہ کرے کہ اس کے ہاتھ قرآن پر رکھوائے جائیں۔ اگر اس کا یہ مطالبہ قبول نہ کیا جائے تو اب اسے مجبور سمجھا جائے گا اور اس کے لئے گنجائش ہوگی کہ وہ تورات یا انجیل یا ان دونوں پر دل میں ان کی تعظیم کا ارادہ کئے بغیر اپنا ہاتھ رکھے۔“

عثمانی رسم الخط کے سوا دوسرے رسم الخط میں قرآن کی کتابت

اللہ تعالیٰ نے جیسے قرآن کے الفاظ اور معانی کی حفاظت فرمائی ہے، اسی طرح منجانب اللہ اس کے رسم الخط

کی بھی حفاظت کی گئی ہے۔ حضرت عثمان غنی رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے جس رسم الخط میں قرآن مجید تحریر کرایا تھا، آج تک اسی کے مطابق قرآن مجید کی کتابت کا سلسلہ جاری ہے اور یہی ”علیکم بسنتی و سنتی الخلفاء الراشدین المہدیین من بعدی“ کا تقاضا ہے، اسی لئے علماء نے اس رسم الخط ہی میں کتابت قرآن کو واجب قرار دیا ہے اور اس سے انحراف کو منع فرمایا ہے۔

”ذهب جمهور العلماء الى ان رسم المصحف الذي كتب في زمن عثمان على يدى كاتب الوحي ”زيد بن ثابت“ توقيفى لا تجوز مخالفته فى كتابة المصحف وطبعها.“^۱

ترجمہ: ”جمہور علماء کہتے ہیں کہ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے ہاتھوں حضرت عثمان رَضِيَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے عہد خلافت میں جس رسم الخط پر قرآن کی کتابت ہوئی، وہ توقیفی ہے قرآن کی کتابت و طباعت میں اس کی مخالفت جائز نہیں ہے۔“

لہذا اس رسم الخط میں تغیر کے ساتھ قرآن مجید کی کتابت قطعاً جائز نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ سے بتدریج خدا نخواستہ قرآن مجید میں تحریف و تغیر کی سازش کرنے والوں کے لئے راستہ ہموار ہونے کا خطرہ ہے۔ چنانچہ مجمع الفقہی الاسلامی (رابطہ عالم اسلامی) نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۱/ تا ۱۶/ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ میں باتفاق رائے رسم قرآنی میں کسی بھی تغیر کو ناجائز قرار دیا ہے۔^۲

فری اسٹائل کشتی وغیرہ

آج کل کھیل کی چند مہیب صورتیں بھی مروج ہو گئی ہیں جو وحشت اور جاہلیت کے دور کی یاد تازہ کرتی ہیں، ان میں فری اسٹائل کشتی (FREESTYLE WRESTLING) مکہ بازی (BOXING)۔ بعض ملکوں میں انسان اور جانوروں کے درمیان مقابلہ آرائی یا خود مختلف جانوروں کے درمیان لڑائی کی صورتیں ہیں مغربی ممالک آج کل اس طرح کے کھیلوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں پیش پیش ہیں اور اگر روم و یونان کی قدیم تاریخ میں سیانی کے نام سے غلاموں اور درندوں کی باہمی لڑائی کے تماشوں کی داستانیں اور ان سے درندہ صفت انسانوں کے محفوظ ہونے کی داستانیں پڑھی جائیں تو مغرب کی طرف سے اس طرح کے کھیلوں کی حوصلہ افزائی باعث حیرت نظر نہیں آتی کہ اسی رومی تہذیب سے ان کا تہذیبی سلسلہ نسب متعلق ہے۔

^۱ ترمذی عن عرواض بن ساریہ: ۹۶/۲ باب الاخذ بالسنة واجتناب البدعة ^۲ اصول التفسیر و قواعد: ۵۱،

ط: دارالنفائس بیروت ^۳ ملاحظہ ہو قرارداد اجلاس مذکور، قرارات المجلس الفقہی الاسلامی: ۱۲۶، ۱۲۸

اسلام کھیل کی ان تمام صورتوں کو ناجائز اور حرام سمجھتا ہے اور اس کو ریاضت نہیں بلکہ درندگی تصور کرتا ہے، اس میں بعض دفعہ کھلاڑیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بے مقصد جان گوانے کو حرام قرار دیا ہے۔

”وَلَا تَلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“^۱

ترجمہ: ”اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو۔“

اسی طرح بعض صورتوں میں اندیشہ ہے کہ اس کے ذریعہ دوسرے کی ہلاکت یا شدید قسم کا ضرر واقع ہو اور ایذا مسلم بلکہ ایذا انسان ان محرمات میں سے ہے جن سے سب سے زیادہ شدت کے ساتھ آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ محض تماشہ بینی کے لئے کسی جانور کا قتل شریعت اسلامی میں حرام ہے اور جانوروں کے درمیان معرکہ آرائی کرا کے تماشہ دیکھنے اور لطف اندوز ہونے سے آپ ﷺ نے صراحتاً منع فرمایا:

”نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن التحریش بین البہائم“^۲

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کے درمیان مقابلہ کرانے سے منع فرمایا۔“

اس لئے کھیل کی یہ تمام صورتیں ناجائز ہیں۔

جہیز اور تلک

اسلام میں نکاح کی حیثیت ایک معاہدہ کی ہے جس میں مرد و عورت قریب قریب مساویانہ حیثیت کے مالک ہیں یعنی نکاح کی وجہ سے شوہر بیوی کا یا بیوی شوہر کی مالک نہیں ہوتی اور عورت اپنے خاندان سے مربوط رہتی ہے۔ والدین کے متروکہ میں تو اس کو لازماً حصہ میراث ملتا ہے۔ بعض اوقات وہ بھائی بہنوں سے بھی حصہ پاتی ہے۔ ہندو مذہب میں نکاح کے بعد عورت کا رابطہ اپنے خاندان سے ختم ہو جاتا ہے شاستر قانون کی رو سے وہ اپنے خاندان سے میراث کی حق دار نہیں رہتی۔ اسی لئے جب لڑکی کو گھر سے رخصت کیا جاتا تھا تو اسے کچھ دان دے کر رخصت کیا جاتا تھا۔

بد قسمتی سے مسلمانوں نے بھی بتدریج اس ہندوانہ رسم کو اپنا لیا اب مسلمانوں میں بھی ”جہیز“ کے لین دین اور پھر لین دین سے بڑھ کر جہیز کا مطالبہ اور اس سے بھی آگے گذر کر جہیز کے علاوہ تلک سرائی اور جوڑے کے نام سے لڑکوں کی طرف سے رقم کا مزید مطالبات کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات اور شریعت کے مزاج کے بالکل ہی برعکس ہے۔ اسلام نے تو اس کے برخلاف مہر اور دعوت ولیمہ کی ذمہ داری شوہر پر رکھی تھی اور عورت کو

^۱ ترمذی: ۱/۳۰۰ باب ماجاء فی التحریش بین البہائم۔

^۲ بقرہ: ۱۹۵

نکاح میں ہر طرح کی مالی ذمہ داری سے سبکبار رکھا تھا۔

فقہاء کے یہاں اس بات کا کوئی تصور ہی نہیں تھا کہ مرد بھی عورت سے روپے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اس لئے اس مسئلہ کا عام طور پر کتب فقہ میں تذکرہ نہیں ملتا، البتہ اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ لڑکی کا ولی اگر مہر کے علاوہ داماد سے مزید رقم کا طلب گار ہو تو یہ رشوت ہے اور یہ مطالبہ جائز نہیں۔ تاہم بعض فقہاء کے یہاں لڑکے اور اس کے اولیاء کی طرف سے مطالبہ کی صورت کا ذکر بھی ملتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم طاہری (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا بیان ہے:

”لا يجوز أن تجبر المرأة على أن تنجز اليه بشئ أصلاً لمن صداقها الذي أصدقها ولا من غيره من سائر ماله والصداق كله لها تفعل فيه كله ما شاءت.“^۱

ترجمہ: ”عورت کو کچھ بھی جہیز دینے پر مجبور کرنا درست نہیں، نہ اس کا مہر لینا درست ہے اور نہ اس کا دوسرا مال۔ مہر پورے کا پورا اس کی ملکیت ہے اور وہ اس میں جیسا چاہے تصرف کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔“

اسی طرح فتاویٰ قاضی خاں میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہو، عورت دوبارہ اسی مرد سے نکاح کی خواہاں ہو شوہر اس رجحان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہے کہ اس شرط پر نکاح کروں گا کہ تم واجب ہونے والا مہر مجھے ہبہ کر دینا تو یہ شرط باطل ہے اور اگر عورت آئندہ اس شرط کے تحت اپنا مہر ہبہ بھی کر دے تب بھی مرد کے لئے وہ مال جائز نہیں۔ کیوں کہ نکاح میں عورت پر مالی عوض عائد نہیں کیا جاسکتا۔

”وفى النكاح لا يكون العوض على المرأة“^۲

اس لئے تلک اور جہیز کا مطالبہ رشوت ہے اس کا لینا تو حرام ہے ہی شدید ضرورت کے بغیر دینا بھی جائز نہیں اور لے چکا ہو تو واپس کرنا واجب ہے۔

وندے ماترم

بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان پر بتدریج فرقہ پرستی کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے۔ فرقہ پرست سیاسی جماعتیں برسر اقتدار آ رہی ہیں اور انہوں نے بعض ریاستوں میں ایک ایسے ترانہ کو پڑھنے کا لزوم عائد کر دیا ہے جو مشرکانہ تصور پر مبنی ہے۔ میری مراد ”وندے ماترم“ سے ہے۔ یہ سنسکرت زبان کا فقرہ ہے اور اس کے معنی یہ ہے کہ میں

^۱ دیکھئے فتاویٰ قاضی خان: ۱/۳۷۸، ط: ز: کلکتہ

^۲ المحلی: ۱۱/۱۱۹

اپنے مادر وطن کا پرستار ہوں اور اس کی عبادت کرتا ہوں۔ حب الوطنی بری چیز نہیں اور اگر انصاف کے دائرہ میں ہو تو اسلام اسے پسند کرتا ہے یہ ایک فطری جذبہ ہے اور خدا ہی کی طرف سے ہر انسان کے اندر ودیعت ہے۔ لیکن اسلام میں خدا کے سوا کسی کی پرستش نہیں کی جاسکتی اور بندگی صرف خدا ہی کے لئے ہے اس لئے اسلامی نقطہ نظر سے اس طرح کے اشعار کا پڑھنا اور ان کو قبول کرنا قطعاً جائز نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ برادرانِ وطن کو سمجھایا جائے کہ مسلمانوں کے لئے یہ محض ایک قومی اور ملکی مسئلہ نہیں اور نہ ہم اس کو انا اور وقار کا مسئلہ بنا رہے ہیں بلکہ اس کی جڑیں ایمان و عقیدہ میں پیوست ہیں اور کسی مسلمان کو ایسا کہنے پر مجبور کرنا گویا ان کو اس بات پر مجبور کرنا ہے کہ وہ اپنے مذہب و عقیدہ سے دست کش ہو جائیں اور یہ ظاہر ہے کہ ملک کا کوئی بھی سنجیدہ اور انصاف پسند شہری جو ملک کے رنگارنگ مذہبی اور تہذیبی کردار کو باقی رکھنا چاہتا ہو ایسی کوشش کو ناپسندیدگی ہی کی نظر سے دیکھے گا۔



www.ahlehaq.org

اللَّهُمَّ

صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ

كَأَصَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ

إِنَّكَ لَمِنَ الْمُبْتَكَرِينَ

اللَّهُمَّ

بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ

كَأَبَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ

إِنَّكَ لَمِنَ الْمُبْتَكَرِينَ